فصیح الدین بلخی

حیات اور کارنامے

از

ڈاکٹر مظفرؔ بلخی

فصیح الدین بلخی

حیات اور کارنامے

از

ڈاکٹر مظفر بلخی (ام۔اے فارسی، اردو پی ایچ۔ڈی)
ریڈر و صدر شعبۂ اردو جے۔اس۔ کالج
ڈالٹن گنج (رانچی یونیورسٹی)

۱۔ زیرِ نظر تصنیف راقم کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر رانچی یونیورسیٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے جو اب ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔

۲۔ اس کتاب کی اشاعت میں بہار اُردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔ کتاب میں شامل مواد سے بہار اُردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے مصنف خود ذمہ دار ہے۔

تعداد و سالِ اشاعت ـــــــ ایک ہزار (۱۰۰۰) سنہ ۱۹۸۸ء

صفحات ـــــــ

قیمت ـــــــ سنتر روپے

طباعت ـــــــ دی آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنہ ۴

ناشر ـــــــ مصطفےٰ البجی ام۔ اے

ملنے کے پتے

۱۔ مصطفےٰ البجی ام۔ اے محلہ کنڈ ڈالٹن گنج پلاموں۔ ۸۲۲۱۰۱ بہار

۲۔ کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ

۳۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

۴۔ تاج بکڈپو مین روڈ، رانچی

۵۔ مقبول منظر میگزین سنٹر مسلم نگر ڈالٹن گنج

۶۔ مکتبہ آزاد، گلزار باغ، پٹنہ ۷

فہرست

انتساب

والد محترم پروفیسر ناؔدم بلخی کے نام

مُظفّرؔ بلخی

پیش لفظ

اُردو میں ”ادبی تحقیقات“ کی عمر زیادہ نہیں - تاریخی لحاظ سے ’نثری ادب‘ میں‘ اس سرمایہ کا مقام کہانی (fiction) اور تنقید کے بعد ہی آتا ہے ــــ اس کم عرصے میں بھی، لیکن کارہائے تحقیق جس رفتار و شمار سے انجام پائے ہیں، کیف وکم سے قطع نظر، یہ توقع سے زیادہ ہیں۔

تحقیق واقعاتی (factual research) اور تحقیق یافت قدری (evaluative research) کے علاوہ ”ادبی تحقیقات“ کی موضوعی تقسیم پانچ ہے :-

۱ تصنیفی ــــ غیر مطبوعہ / مطبوعہ شعری یا نثری تصنیفات کی تدوین یا ان کی افادیت سے متعلق تحقیقات۔

۲ شخصیتی ــــ گُم نام / غیر معروف / معروف عام شعر اور ناثرین کی حیات و نگارشات سے متعلق تحقیقات۔

۳ صنفی ــــ مختلف النوع شعری / نثری اصناف کے تاریخی مطالعہ یا ان کے معیار و اقدار سے متعلق تحقیقات۔

۴ علاقائی ــــ اردو زبان و ادب کی علاقائی ترقی و ترویج سے متعلق تحقیقات۔

۵ لسانیاتی ــــ علم لسانیات کی روشنی میں زبان اردو کے ماضی / حال سے متعلق تحقیقات۔

۶ نظریاتی ــــ مختلف النوع تحریکات و رجحانات کے پیش نظر اردو ادب کے وجود و ترقی سے

متعلق تحقیقات ۔

دس برس پہلے کی بات ہے[1]، اس معیار بندی کے بموجب شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی کی طرف سے ایسے تمام ملک گیر تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا تھا جو مختلف دانش گاہوں میں انجام پائے یا آزادانہ طور پر مکمل ہوئے۔ ان میں سندی اور نصابی (Ph. D. Thesis and dissertation) دونوں طرح کے مقالات شامل تھے ـــــ اس سروے کی روشنی میں جو اعداد حاصل ہوئے، وہ مندرجہ ذیل نتائج کے حامل ہیں:۔

تصنیفی مقالے	۸۹	شخصیتی مقالے	۳۹۱	صنفی مقالے	۱۲۶
علاقائی مقالے	۸۹	لسانیاتی مقالے	۳۱	نظریاتی مقالے	۹۵

(الف) سب سے زیادہ تعداد "شخصیتی مقالوں" اور سب سے کم تعداد "لسانیاتی مقالوں" کی ہے ـــ یعنی، نو واردانِ تحقیق کے لیے کسی شخصیت (مرحوم / زندہ) پر ریسرچ سب سے آسان ہے؛ علم لسانیات پر یہ حوصلہ، عمل دشوار ہے کہ یہ نیا ڈسپلن ہے جس کی تعلیم و تدریس کا نظم خال خال ہے۔

(ب) "صنفی مقالوں" کا نمبر دوسرا ہے ـــ یعنی روایات اور تجربات کے تناظر میں نوع بہ نوع "نگارشاتِ ادبی" (قدیم / جدید) کی صوری، ہیئتی و معنوی دید و شناخت، اور ان تحریروں کی معیار بندی کا رجحان خاصا ہے۔

(ج) "تحقیقی مقالوں" اور "علاقائی مقالوں" کی تعداد مساوی ہے ـــ یعنی، طلبہ معروف و مقبول تصنیفات (شعری / نثری) کے محاسن اور فنی لوازم و اقدار سے غافل نہیں۔ علاوہ بریں ان میں "خاکِ وطن" سے محبت کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔

(د) "نظریاتی مقالوں" کا نمبر چوتھا ہے ـــ یعنی، ہمارے طلبہ کا "مبلغ علم" محض درسی کتابوں تک محدود نہیں۔ وہ ادب کے دیگر علوم کے اہم رشتے کی صداقت کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔

محاصل (ا) نتائج ب، ج اور د یہ ثبوت ہیں کہ دانش گاہوں کے فارغ التحصیل طلبہ میں شوقِ مطالعہ اور ذوقِ تنقید کا فقدان نہیں۔ ان کے جاندار قوائے ذہنی کی صحت مندانہ نمو پر توجہ کی ضرورت ہے۔

(۲) شخصیات پر کام کرانے میں سخت گیری کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا باتیں رسمی تمہید نہیں، یہ عمداً اور بامقصد ہیں۔ یہ "ادبی تحقیقات" کی رفتار و سمت کا جائزہ اور ان سنجیدہ و ادق کاموں کا محاسبہ ہیں جو ہماری دانش گاہوں میں زور و شور سے انجام پا رہے ہیں ـــــ تصنیف زیرِ نظر کی نوعیت "شخصیتی مقالہ" کی ہے۔ کسی شخص پر کام کرنا بہت آسان ہے، مگر اسی شخصیت کے وجود و نمود کے خد و خال یا فہم و فکر کے نقش و نگار کو صبحِ صادق بنا دینا عمل دشوار ہے۔ اس سعی میں کامرانی اسی وقت ممکن ہے جب موضوع اور تحقیق دونوں کے ساتھ اندازِ عمل منصفانہ اور دیانت دارانہ ہو۔

ڈاکٹر سید مظفر بلخی کا یہ "شخصیتی مقالہ" کاتا اور لے دوڑے کی مثال نہیں۔ اس سعی میں ان کی استعدادِ تحقیق کے علاوہ استعانتِ تنقید بھی ملتی ہے، یہ بڑی بات ہے ـــ یہ نوجوان اور حوصلہ مند مصنف خوش بخت ہیں کہ انہیں علم و ادب سے شوق و شغف کا بے پایاں ولولہ بطور میراث ملا۔ انہوں نے جس شخص پر قلم اٹھایا، وہ ان کے جدِ امجد ہیں۔ ڈاکٹر مظفر کے لیے مرحوم فصیح الدین بلخی کے روز و شب اور ان کے سرگرم حالات شنیدہ اور دیدہ تھے۔ جہد ارضی (field work) کی سخت منزل ان کی راہ میں سنگِ گراں نہ رہی۔ انہیں حصولِ مواد، تسوید مواد اور تزئین مواد میں اپنے والد ڈاکٹر سید نادم بلخی، صدر شعبۂ اردو ڈالٹن کالج، ڈالٹن گنج سے خاطر خواہ سہولتیں ملیں ـــ کام انہوں نے غایت محنت اور سلیقہ مندانہ کیا؛ انجام، لازماً حسن کارانہ ہوا۔

ڈاکٹر سید مظفر بلخی کی اس تصنیف میں یہ "پیش لفظ" دو حقائق سے تعلق رکھتا ہے۔ اولاً اس کے مصنف میرے عزیز ہیں اور شاگرد بھی۔ دوم، میں نے اپنے مقالہ تحقیقی کی تکمیل (۱۹۵۲) میں جن دو چار باکمالوں کے علم و فضل سے استفادہ کیا تھا، ان میں "فصیح الدین بلخی" پہلا نام ہے ـــ اس دیدہ ور مورخ اور محقق پر میرا ایک سیرتی سوانحی مقالہ نمودِ ھستی[۲] میں شامل ہے۔ اسی کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

"فصیح الدین بلخی ادیب تھے، تخلیق کار نہ تھے۔ یہ حسن کے شیدائی تھے اور حسنِ اخلاق کے تمنائی۔ ادب اور آدابِ حیات کی الفت نے اُن کے کردار اور اطوار میں نفاست پسندی

خوش سلیقگی اور تنظیم کاری کا وہ حسن دل افروز پیدا کر دیتا تھا جو اچھے حساس اور ہوش مند اہلِ ادب میں بھی کم نظر آتا ہے۔"

"انہیں تاریخ اور تحقیق سے فطری دلچسپی تھی۔ اس ذوق کی بالیدگی میں وہ ہمیشہ ساتھ رہے۔ ان کی اکثر تاریخی اور تحقیقی کاوشیں "فتوحات" کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن، کامرانی کے باوجود ان کی نگارشات اور نظریہ میں DOGNATISM کے رنگ نہ ابھرتے۔ وہ منکسر المزاج اور دل آزاری سے دامن بچاتے ہوئے بھی حق بیانی سے گریز نہ کرتے۔ تکلم ہو یا تحریر، صیغۂ واحد متکلم سے عمداً احتیاط برتتے ۔۔۔ اپنے اس سلوک اور مسلک میں وہ قاضی عبدالودود سے بہت دور اور پروفیسر سید حسن عسکری سے بہت قریب تھے۔ وہ اس مقولہ کے پیکر تھے "SIMPLE LIVING AND HIGH THINKING"

"فصیح الدین بلخی تحقیق میں قاضی عبدالودود، تنقید میں پروفیسر کلیم الدین احمد اور تاریخ میں پروفیسر سید حسن عسکری کے مدِمقابل نہیں۔ اصلاً وہ خادمِ زبان ہیں اور ایک بے لوث بندۂ اردو۔ وہ بڑے محقق یا مورخ میں بھی شمار نہ ہوں گے، مگر ان کی خدمتِ اردو کا مقام پروفیسر آل احمد سرور کے اس خیال میں پوشیدہ ہے:-

"بڑا نقاد وہ نہیں جس کی رائے ہمیشہ صحیح مانی جائے۔ بڑا نقاد وہ ہوتا ہے جس کی رائے سے دوسروں کو کسی موضوع پر بہتر اور جامع رائے قائم کرنے کی توفیق ہو اور اس جامع رائے کا سراغ اس نقاد کی رائے سے ملا ہو۔۔"

فصیح الدین بلخی کی علمی اور ادبی کارگزاریاں کچھ ایسی ہی عظمت کی حامل ہیں۔ صحیح معنی میں وہ "طالب تحقیق" تھے۔ ان کی زندگی تاریخی حقائق کی تلاش و تفتیش میں گذری۔"

"فصیح الدین بلخی کا سرمایۂ جہد ارتقا سے بے پایاں ہے۔ ان کی تحقیقات کے مواد

یا مسالا سے بہتوں نے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر کالی کنکر دت[3] ہوں یا پروفیسر قیام الدین احمد[4] پروفیسر[5] سید اختر احمد اُورینوی ہوں یا ڈاکٹر سید مظفر[6] اقبال، فصیح الدین بلخی کے انمول خزانۂ مخطوطات سے جھولیاں سب نے بھریں اور ان کے قائم کردہ نشان راہ سے منزلِ مقصود حاصل کیا۔ وہ بحرِ تحقیق کے غواص تھے۔ گوشۂ آب تہہ دار سے انھوں نے چھوٹے بڑے موتی کے خزانے نکالے۔ ایسے درہائے بے بہا جو مال بازار نہیں مال ادب ہوئے۔"

"الامن"
محلہ بھنور پوکھر، پٹنہ ۴

سید محمد حسنین
۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

۱۔ نوائے مجلہ شعبۂ اُردو، مگدھ یونیورسٹی، شمارہ ۷۶-۱۹۷۵۔ رہبرِ تحقیق شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء

۲۔ اس کا دوسرا اضافہ شدہ اڈیشن زیرِ اشاعت ہے۔

۳۔ ملک کے مشہور تاریخ داں، مگدھ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔

۴۔ شعبۂ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کے معلم۔ وہابی تحریک اور کئی کتابوں کے مصنف۔

۵۔ سابق صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی

۶۔ صدر شعبۂ اردو بھاگل پور یونیورسٹی۔

عرض حال

حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، موصوف محقق بھی تھے اور مورخ بھی، تذکرہ نگار بھی تھے اور نقاد اور شاعر بھی۔ جب راقم نے موصوف پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرنے کی ہمت کی تو بڑی ذمہ داری کا احساس ہوا، اس لئے کہ ناچیز کو حضرت فصیح الدین بلخی کے نبیرہ ہونے کا شرف حاصل ہے اس لئے کہ گھر کے کسی فرد کی علمی و ادبی کارگذاریوں کا جائزہ لینا آسان نہیں۔

راقم نے فصیح الدین بلخی مرحوم کے علمی و ادبی نگارشات کے سلسلے میں مشہور اہل قلم کے تاثرات و خیالات کا حوالہ دے کر ان کے صحیح ادبی مقام کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان ادیبوں میں ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم، سہیل عظیم آبادی مرحوم، جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم، جناب سید بدرالدین بدر عظیم آبادی مرحوم، جناب قیوم خضر، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر مظفر اقبال، ڈاکٹر خواجہ افضل امام سابق ناظم شعبۂ مخطوطات عربی فارسی اور اردو پٹنہ یونیورسیٹی، ڈاکٹر شعیب راہی، پروفیسر علی حیدر نیر وغیرہ کے تاثرات و خیالات خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے بلخی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد اپنے گرانقدر مقالات ادارہ رسالہ 'کوئل' سرائے ڈالٹن گنج کی گذارشوں کے بعد لکھا تھا جب کہ ادارہ کوئل نے ڈالٹن گنج فصیح الدین بلخی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تھا لیکن رسالہ کو ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال یہ مسودات آج بھی راقم کے پاس محفوظ ہیں۔

اس تحقیقی مقالہ کو راقم نے بارہ ابواب میں منقسم کرکے فصیح الدین بلخی مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں

کے تمام خدوخال کا جائزہ لیا ہے بلکہ ہر معاملہ میں حقائق کی چھان بین کی ہے اور ایک واضح طریقہ کار اپنایا ہے۔

اس تحقیقی مقالہ کے حصہ اول میں عظیم آباد کے ادبی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے اور راقم نے یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عظیم آباد کی شاعری میں دلّی اسکول کی داخلیت کے رنگ کی گہری چھاپ ہے اس کے علاوہ عظیم آباد کے نثری کارناموں کا بھی مختصراً تعارف کرایا گیا ہے۔

حصہ دوم میں عصر فصیح الدین بلخی کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے اور عظیم آباد کی ادبی معرکہ آرائیوں کو پیش کیا گیا ہے جس عہد سے بلخی صاحب مرحوم تعلق رکھتے تھے۔ اس میں داغ اسکول کے پرستاروں اور شاد اسکول کے ہمنواؤں میں سخت آپسی چشمکیں چلتی تھیں۔

حصہ سوم کا تعلق موصوف کی سوانح حیات سے ہے، سب سے قبل خاندان بلخیہ کے ادبی کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد بلخی صاحب مرحوم کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں سے تعارف کرایا گیا ہے۔

حصہ چہارم میں بہار میں اردو نثر کے ارتقا سے مختصر اً بحث کی گئی ہے اور فصیح الدین بلخی مرحوم کے عہد تک کے تمام بہاری نثاروں کی تخلیقات کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے۔

حصہ پنجم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی تاریخ نویسی کا جائزہ اس کے بعد بلخی صاحب مرحوم کو ایک مورخ کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم تاریخ نویسی کو شعروادب کی عظیم منزلوں تک لیجانے کے قائل تھے ساتھ ہی ساتھ ان کی تاریخ نویسی غیر جانبداری کی آئینہ دار ہے۔

حصہ ششم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کو بحیثیت ایک محقق پیش کیا گیا ہے اور بحیثیت محقق بلخی صاحب ہمیشہ نوجوان محققوں کی رہنمائی کرتے رہے موصوف اپنے تحقیقی مشن ہمیشہ فیلڈ ورک (Field Work) پر زیادہ زور دیتے رہے اس امر کے نتیجہ میں ان کے حاصل شدہ مسجدوں، مقبروں اور عمارتوں کے کتبات کی نقلیں بھی بطور حوالہ پیش کی گئی ہیں۔ نیز موصوف کی پٹنہ یونیورسیٹی کے شعبہ مخطوطات عربی، فارسی اور اردو کو کیا دین ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

حصہ ہفتم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی تذکرہ نگاری کا جائزہ لینے سے قبل بہار کی اردو تذکرہ نگاری کا ارتقائی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے دو تذکرے "تذکرہ نسوان ہند" اور "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" کا

ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

حصہ ہشتم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی نقوش کو پیش کئے گئے ہیں اس کے بعد ان کے تنقیدی رسالہ الشاد شاد کا تنقیدی جائزہ مختلف ادیبوں کی نگارشات کے حوالوں سے کیا گیا ہے نیز ان کی تصنیفات اور ان کے ادبی مضامین میں جو موصوف کے تنقیدی رجحانات ملتے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ بہ حیثیت ناقد فصیح الدین بلخی مرحوم تو کلاسیکی تنقید کے نظریہ کے قائل تھے جس کی داغ بیل حالیؔ اور شبلیؔ نے ڈالی تھی۔ اس گروہ کے ناقدوں میں ڈاکٹر عبدالحق، علامہ سلیمان ندوی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ وغیرہ تھے۔

حصہ نہم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کے مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے جو مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہے، بلخی صاحب مرحوم کے ایسے مضامین تاریخی، تحقیقی اور دیگر فنون لطیفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماسوا اس کے بلخی صاحب مرحوم کے ایسے مضامین کا بھی خاکہ پیش کیا گیا ہے جو گاہے گاہے آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہوتے رہے۔

حصہ دہم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کو بحیثیت ایک شاعر قارئین کے سامنے روشناس کرایا گیا ہے کیونکہ ان کا کلام بہت ہی مختصر ہے اور اس مختصر سے کلام کی روشنی میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم ایک روایتی شاعر تھے اور ان کے کلام میں میر انیسؔ اور داغؔ کی فصاحت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

حصہ یازدہم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی ان کی غیر مطبوعہ تصنیفات کا مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے جو ہنوز طباعت و اشاعت سے محروم ہیں۔ موصوف کی ان غیر مطبوعہ تصنیفات کا منظر عام پر آنا اشد ضروری ہے۔

حصہ دوازدہم جو اس مقالہ کا آخری باب ہے، اس باب میں فصیح الدین بلخی مرحوم کے نثری اسلوب کا جائزہ اور ان کی تمام تصنیفات اور مضامین کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم کا نثری اسلوب وہی ہے جس کی داغ بیل میر امنؔ دہلوی نے رکھی تھی جو سرسید اور حالیؔ کے ہاتھوں پروان چڑھی گویا یہ کہ موصوف کا اسلوب سلاست اور سادگی کا آئینہ دار ہے۔

اس مقالہ کی ترتیب کے سلسلے میں جن حضرات نے میری معاونت کی ان میں حضرت محمود علی خاں صبا عظیم آبادی مرحوم تلمیذ شاد عظیم آبادی، جناب قیوم خضر ایڈیٹر رسالہ اشارہ پٹنہ، جناب احمد یوسف، ڈاکٹر حسن امام ناظم شعبہ مخطوطات عربی، فارسی اور اردو پٹنہ یونیورسٹی، والد محترم پروفیسر نادم بلخی، استاذی محترم ڈاکٹر طیب ابدالی مدظلہ العالی، ڈاکٹر شعیب راہی اور جناب کیول شرما ہیں۔ میں ان حضرات کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں، میں خدا بخش لائبریری پٹنہ، گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے ان تمام کارکنوں کا تہہ دل سے ممنون و شکر گذار ہوں جنہوں نے حد درجہ شفقت، ہمدردی اور خلوص کا ثبوت پیش کیا۔

میں اپنے نگراں ڈاکٹر احمد سجاد، یونیورسٹی پروفیسر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی کا تہہ دل سے ممنون و شکر گذار ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میری مدد کی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ ناسپاسی ہوگی کہ میں اُستاذی ڈاکٹر وہاب اشرفی صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی کا شکریہ کیوں نہ ادا نہ کروں جنہوں نے اپنے قیمتی اوقات نکال کر مجھے تعاون دیا اور ایسے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی ہدایت کی اور موقع فراہم کیا۔ میں موصوف کا تہہ دل سے احسان مند ہوں۔

اس تحقیقی مقالہ کے ممتحن جناب ڈاکٹر محمد سلیمان سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی سیفیہ کالج بھوپال تھے، میں ان دونوں بزرگوں کا تہہ دل سے ممنون اور شکر گذار ہوں جنہوں نے مجھے پی ایچ۔ ڈی (Ph . D) کی ڈگری عنایت کرنے کے لئے رانچی یونیورسٹی سے سفارش کی۔

میں اپنے بزرگ محمد رفیع الزماں فتیل کریمی کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے اس مقالہ کا مسودہ برائے طباعت نہایت ہی کاوش اور لگن کے ساتھ صاف کیا۔

آخر میں میں اپنے استاذی محترم ڈاکٹر سید محمد حسنین مدظلہ العالی سابق صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی کا صد درجہ ممنون و شکر گذار ہوں جنہوں نے اس ناچیز کی تصنیف پر مقدمہ لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائی اور اپنے محترم بزرگ حضرت شارق جمال ناگپوری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے قطعہ تاریخ برائے سال اشاعت لکھا۔

مظفر بلخی

باب اوّل

عظیم آباد کا ادبی پس منظر

عظیم آباد کے ادبی پس منظر کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ صوبہ بہار میں اُردو زبان و ادب کے ارتقا کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جائے۔

ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح بہار بھی ابتدا ہی سے علمی ماحول کا گہوارہ رہا ہے چنانچہ صوبہ بہار کے ادبی ماحول میں مختلف دور میں ہمیں شعرا و ادبا کی کثیر تعداد ملتی ہے، ان کی تخلیقات نے بہار کی ادبی فضا کو برقرار رکھا چنانچہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح بہار میں بھی اردو کی ترویج و اشاعت بیشتر صوفیائے کرام کی وجہ سے ہوئی، حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ اور آپ کے جانشین مولانا مظفر شمس بلخی متوفی سنہ ۷۸۸ھ اور دوسرے بزرگانِ دین کے مقولے، دوہے اردو زبان و ادب کے نقوش اولیں ہیں یہ بزرگانِ دین عہد قدیم میں صوفیائے دکن، گجرات، دہلی اور پنجاب کے دوش بدوش نظر آتے ہیں، ان کی خانقاہیں اور درس گاہیں رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا مرکز بنی ہوئی تھیں، اردو شاعری یا نثر کے نمونے نویں یا دسویں صدی ہجری کے ابھی تک دستیاب نہیں ہوئے۔ یہ مسلّم حقیقت ہے کہ ولی دکنی کے عہد سے قبل ہی اس خطّہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت شروع ہو گئی تھی اور شہر عظیم آباد کو صوبہ میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر اختر اُورینوی مرحوم نے اپنی کتاب "بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا" میں یوں لکھا ہے:

"عین ممکن ہے کہ دکن کے دورِ اولیٰ کے متوازی بھی ادب قدیم کے نمونے بہار میں مل جائیں"۔

ڈاکٹر طیب ابدالی کو دسویں صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل کی شاعری کا نمونہ ان کے خاندانی کتب خانہ قادریہ اسلام پور، پٹنہ میں دستیاب ہوا۔ اس کی تفصیل موصوف اپنی کتاب "حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے" میں یوں لکھتے ہیں:

"البتہ دسویں صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی ہجری کے اوائل شاعری کا نمونہ مجھے دستیاب ہوا ہے جس کے بارے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں چند اوراق منظوم فقہ کے مجھے اپنے خاندانی کتب خانہ سے دستیاب ہوئے ہیں اُن پر ۱۱۶۵ھ کی مہر ہے اور اس مہر پر شرف الدین بدونانوی کا نام ہے۔ یہ نظم پندرہ صفحات پر مشتمل ہے، درمیان اور آخر کے صفحات غائب ہیں۔ زبان کا سانچہ کھڑی بولی کے ساتھ اور بولیوں سے مخلوط ہے، نظم کی ہیئت مثنوی کی ہے، جا بجا فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں، اس کے شاعر کا نام شمس حسن بن یار معلوم ہوتا ہے اس میں باب و فصل کے تحت مسائل بیان کئے گئے ہیں، کتابت خط نسخ میں ہے، کاغذ بھی بوسیدہ ہے، نمونتاً چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

ایکیت راجا سرجن ہار ٭ جسنہ پوچھنہ وئی سنار
تس کہیں پرسلس کرتوں یاد ٭ تو تو ہووے دولہہ جگ شاد
رکھی شمس حسن سین یاد
مومن کیرا جانک بچار"

چنانچہ بہار کی ادبی روایتیں بہت ہی قدیم ہیں اور جدید تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ دبستانِ دکن کے دورِ اولیٰ کے متوازی صوبہ بہار میں تخلیق ادب کا کام شروع ہو چکا تھا۔

صوبہ بہار میں گیارہویں صدی ہجری کے اوائل سے اُردو ادب کا باضابطہ نمونہ ہمیں ملتا ہے، مرزا عبدالقادر عظیم آبادی کی شخصیت کو لیجئے۔ بقول سید عزیز الدین راز بلخی عظیم آبادی ہندوستان سے ایران

تک شہرت رکھتے تھے۔ موصوف ۱۰۵۳ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے، مدت تک شاہ محمد اعظم خلف اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ رہے پھر دکن کی سیر کو نکلے بعدہٗ دہلی چلے آئے جہاں ۱۱۳۳ھ میں بیدل کا انتقال ہوا۔ ان کے ریختہ کا ایک شعر راز بلخی نے اپنے تذکرہ میں درج کیا ہے ؎

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردہ سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

اس کے بعد گیارھویں صدی کے ریختہ کے شعرا میں سید عماد الدین پھلواروی ۱۰۶۹ھ تا ۱۱۲۴ھ، ملا محمد علیم تحقیق عظیم آبادی ۱۰۷۰ھ تا ۱۱۶۳ھ، غلام نقشبند سجاد ۱۱۱۶ھ تا ۱۱۷۲ھ، بی بی ولیہ، آجا گر چند الفت، راجہ رام نرائن موزوں، شاہ آیت اللہ جوہری ۱۱۳۶ھ تا ۱۲۱۰ھ، غلام یحییٰ حضور، شیخ محمد روشن، جوشش عظیم آبادی ۱۱۵۰ھ تا ۱۲۱۶ھ، شاہ نور الحق تپاں ۱۱۵۶ھ تا ۱۲۲۳ھ، شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی، شیخ غلام علی راسخ، شاہ ابوالحسن فرد ۱۱۹۱ھ تا ۱۲۶۵ھ ان کے علاوہ کچھ اور شعرا شاہجہاں آباد سے بھی عظیم آباد تشریف لائے اور یہاں کی ادب نوازی کے سبب یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اشرف علی فغاں، میر محمد باقر حزیں ۱۱۶۵ھ، شاہ رکن الدین عشق ۱۲۰۳ھ، مرزا محمد علی فدوی ۱۲۱۰ھ، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، ضیاء الدین دہلوی، استاد میر حسن جیسی شخصیتیں عظمت و شہرت کی حامل ہیں۔

جناب مولوی سید احمد اللہ ندوی نے اپنے تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول کے دیباچہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ صوبہ بہار میں اردو شاعری کی پیدائش خانقاہ میں ہوئی، موصوف یوں لکھتے ہیں:

"صوبہ بہار میں اُردو شاعری خانقاہ میں پیدا ہوئی، صوفیائے کرام کی گودوں میں پلی اور ہر دور میں اس صوبہ کی تمام خانقاہوں میں مقبول ہوتی گئی۔ پھر اس کی رعنائیوں اور حسن دل آویزیوں نے یہاں کے ہر طبقے کے افراد کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔"

اس کے علاوہ مولوی سید احمد اللہ ندوی نے بہاری شعرا کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، موصوف یوں لکھتے ہیں:

"۱۔ ایک وہ گروہ ہے جس کے افراد سرزمین بہار سے اُٹھے اور وفات کے بعد

وہیں پیوندِ خاک ہو گئے، جیسے علامہ شاد عظیم آبادی، علامہ آزاد شاہو بگھوی، حمید عظیم آبادی۔

۲۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کے افراد پیدا ہوئے صوبہ بہار میں اور وفات پائی اس صوبہ سے باہر دوسری جگہ میں اور وہیں لحد میں رکھے گئے جیسے مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی، مولوی حفیظ الدین بلخی۔ سید شاہ فرید الدین یکتا امتھوی۔

۳۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو ہند کے دوسرے صوبجات کے رہنے والے تھے لیکن بسلسلۂ معاش کافی مدت تک صوبہ بہار کے کسی علاقہ میں رہے پھر آخر میں اپنے وطن واپس چلے گئے جیسے سید اولاد علی کاہش جونپوری، حفیظ جونپوری۔

۴۔ چوتھا گروہ وہ ہے جس کے افراد ہند کے دوسرے مقامات سے ترک وطن کر کے صوبہ بہار کے کسی علاقہ میں آئے اور یہیں کے ہو رہے جیسے حضرت رکن الدین عشق، اشرف علی فغاں وغیرہ۔ دوسرے گروہ میں وہ بہاری شعرا داخل ہیں جو تقسیم ہند کے بعد بکثرت صوبہ بہار سے ترک وطن کر کے مغربی یا مشرقی پاکستان منتقل ہو گئے جیسے مولانا تمنا پھلواروی، پروفیسر حسن عظیم آبادی، مولوی اختر مانی ساگری، فرزندان حمید عظیم آبادی، احسن گیاوی مرحوم وغیرہ۔

۵ؔ ان چار گروہوں کے علاوہ ایک اور گروہ بیرونی صوبہ بہار کے ان معزز و محترم مہمان شعرا کا ہے جو بطور مہمان کسی مشاعرہ یا تقریب میں شرکت کے لئے صوبہ بہار میں وقتی طور پر آتے جاتے رہے اور اپنے فیوض و برکات شعری سے صوبہ بہار کے لوگوں کو مستفید فرماتے رہے ان کی آمد صوبہ بہار کی شعری زندگی کی دلیل ہے۔ ورنہ بنجر علاقہ اور مردہ دل لوگوں کو کون پوچھتا ہے جیسے داغ دہلوی، حضرت سائل دہلوی، حضرت وحید الہ آبادی، حضرت انل لکھنوی، حضرت امیر مینائی، حضرت نوح ناروی، مرزا دبیر لکھنوی۔

ؔ تذکرہ مسلم شعرائے بہار مصنف حکیم احمد اللہ ندوی جلد اول

سید عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی نے تاریخ شعرائے بہار جلد دوم کے مقدمہ میں عظیم آباد کی شاعری کے ضمن میں اپنا خیال یوں ظاہر کیا ہے :

[1] "عظیم آباد کی شاعری میں قدیم دلی اسکول کا پاکیزہ اور مہذب رنگ نمایاں طور پر ہمیشہ قائم رہا اور یہاں کی خاک سے جوشش اور راسخ کے ایسے شعراء پیدا ہوئے جو اس دیار کے دوسرے درد اور میر تھے اور جن کے فلسفیانہ اور اخلاقی اور پُر درد اور پاکیزہ کلام میں اس قسم کی فحش گوئی کا شائبہ بھی نہیں مل سکتا بلکہ عشق حقیقی کے پاک جذبات اور فلسفیانہ و تصوفانہ رنگ کے اعتبار سے راسخ تو میر سے آگے نکل گئے۔"

عظیم آباد کی شاعری نے داخلی رنگ گہرا قبول کیا ہے، داخلی شاعری سے مراد شاعر کے اندرونی جذبات اور کیفیات اور واردات قلبی کی تشریح ہے۔ چنانچہ میر کا سوز و گداز اور درد کا کیف و درد بھی داخلی شاعری کا نمونہ ہے۔ چنانچہ شعرائے دہلی نے ذوق، غالب اور مومن کے زیادہ تر داخلی پہلو کو برتا ہے، چنانچہ راز بلخی نے اساتذہ دہلی کے کلام سے عظیم آباد کے اساتذہ کا موازنہ پیش کیا ہے، مثال ملاحظہ ہو ؎

میرا جی جلتا ہے اس بلبل بیکس کی غربت پر ؎ کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
(مظہر جان جاناں)

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے ؎ معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے
(درد)

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کچھ نہیں آتی ؎ گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو
(راسخ)

---

[1] مقدمہ تاریخ شعرائے بہار مصنفہ سید عزیز الدین بلخی راز۔ بلخی مرحوم نے تاریخ شعرائے بہار جلد دوم کا مقدمہ اپنی زندگی میں شائع کرایا تھا یہاں تک کہ جلد دوم چھپنے کی نوبت نہ آئی کہ کاتبِ تقدیر نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا، غالباً ان کا مخطوط ان کے منجھلے صاحبزادے منظر احمد بلخی مقیم بنگلہ دیش کے پاس محفوظ ہو۔

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں ❊ کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

(ذوقؔ)

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر ❊ آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

(غالبؔ)

کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن ❊ کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

(مومنؔ)

شعرائے عظیم آباد نے داخلیت کا اتباع کس قدر کیا ہے اس کی مثال ملاحظہ ہو ؎

ہوئی مدت کہ دیکھا تھا کرشمہ ان نگاہوں کا ❊ مگر دل پر وہ گذری ہے کہ اب تک یاد کرتے ہیں

(شاہ الیاس یاسؔ بہاری)

قیس اپنی دھن میں ہے اسے اس کی خبر نہیں ❊ محمل میں کیا گذرتی ہے محمل سوار پر

(ریاض حسن خاں خیالؔ)

جا چکی گلشن سے جب فصل بہار ❊ آہ کب رخصت ملی پرواز کی

(آزادؔ عظیم آبادی)

چشم مجنوں سے اگر پردۂ غفلت اٹھ جائے ❊ اپنے دل ہی میں جمال رُخ لیلیٰ دیکھے

(اثرؔ عظیم آبادی)

لیلیٰ ہے کہاں اور تیرا دشت کہاں ہے ❊ اے قیس عشق نہیں ہے خفقان ہے

(اکبرؔ داناپوری)

پروانہ بن تو پہلے کسی شمع ناز کا ❊ یوں لطف تو لے گا نہ سوز و گداز کا

(باقرؔ عظیم آبادی)

اپنی ہستی کو غم و رنج و مصیبت سمجھو ❊ موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

(شادؔ عظیم آبادی)

کچھ ایسے واقعات مرے دل کے ساتھ ہیں ❊ جیتے تو ہیں مگر بڑی مشکل کے ساتھ ہیں

(〃)

اک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اُٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے
(ضیا عظیم آبادی)

جرس قافلہ ہم اپنی فغاں رکھتے ہیں ؎ توشہ وہ دل شباب و تواں رکھتے ہیں
(مشرقی منیری)

دل کے جانے کا تھا اک ماتم بپا ؎ ہوش بھی کھو بیٹھے اس کہرام میں
(نصیر نگرنہسوی)

جو نالہ اب تک آتا ہے وہ بیتابانہ آتا ہے ؎ دلِ بیتاب کا کہنا ہوا افسانہ آتا ہے
(مبارک عظیم آبادی)

گلا نہ کاٹ سکے اپنا وائے ناکامی ؎ پہاڑ کاٹتے ہیں رات دن مصیبت کے
(مرزا یاس یگانہ عظیم آبادی)

ضبط فریاد سے بھی رازِ محبت نہ چھپا ؎ کھل پڑے آنکھوں سے اشکوں کے ڈھرے پہلے
(راز بلخی عظیم آبادی)

مذکورہ بالا عظیم آباد کے شعرائے کلام سے اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے کہ عظیم آباد کے شعرائے دلی اسکول کی داخلیت کو قبول کیا ہے لیکن ایسی بات نہیں کہ عظیم آباد کے شعرائے لکھنؤ اسکول کی نمایاں خصوصیت خارجیت کو نظر انداز کر دیا ہے، وہ اپنے کلام میں لکھنوی خصوصیات کو بھی جا بجا خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر صفیر بلگرامی اور شاد عظیم آبادی کی شاعری دبستان لکھنؤ و دلی کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ جہاں تک صفیر بلگرامی کا تعلق ہے انہوں نے ناسخ کے شاگرد میر امان علی سحر سے بھی مشورہ سخن کیا تھا اور غالب دہلوی سے بھی اصلاح لی تھی، اسی طرح شوق نیموی کی شاعری میں لکھنؤ اسکول کا رنگ غالب دکھائی دیتا ہے جیسا کہ فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنے مقالہ علامہ شوق نیموی رسالہ "اشارہ" (پٹنہ دسمبر ۵۸ء) میں کہا ہے:

"یاس بہاری کے کلام میں وزیر لکھنوی اور صبا لکھنوی کا رنگ نمایاں طور پر

غالب ہے اور یہ قول بھی فصیح الدین بلخی مرحوم کا ہے جیسا کہ موصوف نے پاس بہاری کی شاعری سے متعلق اپنے خیال کا اظہار کیا ہے"۔

ڈاکٹر کلیم عاجز اپنے گرانقدر تحقیقی مقالے "بہار میں اُردو شاعری ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک" میں بہار کی اُردو شاعری کے متعلق اپنے خیال کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"بہار میں اُردو شاعری کی روایتیں پرانی ہیں، بہار کی شاعری کا عام میلان دہلوی ہے، صوفیانہ علامت نمایاں ہے جو یہاں کی نمایاں انفرادیت ہے، سجاد اور راسخ کا تغزل اپنے میلان اور مزاج کے لحاظ سے دہلوی روایت کا حامل ہے، کئی اساتذہ نے لکھنوی استادوں سے تلمذ کیا تھا، ان اسباب کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنوی مزاج بھی پٹنہ میں داخل ہوگیا اور ایک مدت تک چھایا رہا۔ لیکن بہار میں سجاد اور راسخ کی روایتیں مستحکم تھیں......"

ڈاکٹر سید محمد حسنین اپنی تصنیف "مرزا محمد علی فدوی" میں لکھتے ہیں کہ عظیم آباد کی شاعری دبستان دہلی سے زیادہ قریب ہے، موصوف یوں لکھتے ہیں:

[۵] "عظیم آباد کو لکھنؤ سے قربت نصیب ہے مگر یہاں کی شاعری دبستان دہلی سے زیادہ قریب ہے، دہلی اسکول کا رنگ و آہنگ عظیم آباد کی شاعرانہ قدروں میں صاف جھلکتا ہے۔ عظیم آباد میں مذاقِ شاعری اس آن بان اور اس انہماک کے ساتھ نظر آتا ہے جو شاہجہاں آباد میں موجود تھا۔"

عظیم آباد کے شعرائے دہلی کے صوفیانہ کلام کو سب سے پہلے قبول کیا اور اپنی شاعری مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے گہرے رنگ کو قبول کیا۔ صوفیانہ شاعری میں اس لحاظ سے قصبہ پھلواری کا نام بہت اہم ہے جو ابتدا ہی سے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کا مولد و مسکن رہا ہے۔ درس و تبلیغ کے علاوہ یہاں کی

---

[۵] ملاحظہ ہو مرزا علی فدوی عہد حیات اور شاعری مصنفہ ڈاکٹر سید محمد حسنین ص ۱۵۴

بزرگ و مقدس ہستیوں نے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھی۔ سجاد، تپاں اور جوہری کے نام اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء کے کلام میں خواجہ میر درد اور مظہر جان جاناں کا رنگ ملتا ہے۔

چند شعراء کے اس رنگ کے کلام کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

تپاں :[1]

اللہ ہے اللہ ہے اللہ نام اللہ کا ۔ ہووے جو کچھ آوے نظر جلوہ تمام اللہ کا

کیوں کہ ہیں یہ شمس و قمر کس پہ ہیں یہ ارض و سما ۔ بوجھے گی اس کو عقل کیا انتظام اللہ کا

معراج ہے معراج ہے جس کا تلاوت نام ہے ۔ ہے گفتگو اللہ سے پڑھنا کلام اللہ کا

کہتے ہیں جس کو سب تپاں میخوار وحدت ایک ہے ۔ خم خانۂ توحید میں پیتا ہے جام اللہ کا

سجاد :

رکھتے ہے جبیں در پہ تیرے گنبد گردوں ۔ سجدہ تیرے دروازے پہ خورشید کرے ہے

سجاد جو سمجھے ہے خود اپنے تئیں موجود ۔ وہ فہم نہیں معنئ توحید کرے ہے

جوشش :

جو دل کہ جلوہ گاہ ہوا اس کے نور کا ۔ مشتاق وہ نہیں ہے تجلیٔ طور کا

زنہار عکس غیر نہ ہو اس میں جلوہ گر ۔ یہ دل تو آئینہ ہے کسی کے حضور کا

تو ڈھونڈتا ہے جس کو وہ شہ رگ سے ہے قریب ۔ جوشش خیال دل میں نہ رکھ دور دور کا

راسخ :

کس قدر بوقلموں جلوہ ہے اپنا محبوب ۔ ایک بھی اُس کی تجلی نہیں تکرار کے ساتھ

ہو دیوانہ ہر اک فرزانہ تیرا ۔ بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا

سر بازار وجود آپ سے آیا نہیں میں ۔ جلوہ دکھلانے کو اپنا کوئی لایا ہے مجھے

ورق آب زدہ سا ہے یہ میرا نسخہ ۔ صفحۂ ہستی سے جو حرف اٹھایا ہے مجھے

---

[1] ملاحظہ ہو مرزا محمد علی فدوی عصر حیات اور شاعری مصنفہ ڈاکٹر سید محمد حسین صفحہ ۱۱۴ تا صفحہ ۱۱۸

نالاں :

دیر و کعبہ پہ نہیں موقوف شیخ و برہمن ٭ کون سی جا ہے جہاں جلوہ نہیں اللہ کا
دیکھ لی آج جو اس ماہ لقا کی صورت ٭ فی الحقیقت یہی ہووے گی خدا کی صورت

مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے مضامین عارفانہ اور درویشانہ کے بعد شعرائے عظیم آباد نے جو دوسرا رنگ قبول کیا وہ میر تقی میر کی گریہ و زاری اور سحر بیانی ہے۔ میر تقی میر[1] کا رنگ اردو شاعری پر بہت تیزی سے چھایا چنانچہ عظیم آباد کے رنگ تغزل میں میر کی غزلوں کا جو سوز و گداز، درد اور ٹیس موجود ہے۔ عظیم آباد کے شعرا میں جوشش، رضا، امین، حسرت، حضور، خلیل، شورش، دل، اور سجاد کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں

میر کا شعر ہے ؎

احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا کچھ زیر لب کہا بھی دیر دیر رو کر

راسخ یوں کہتے ہیں ؎

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کس طرح آئے ٭ گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور رونے بھی جاتے ہو

رضا نے اسے یوں ادا کیا ہے ؎

اس گھڑی کچھ تھے اور اب کچھ ہو کیا تماشا ہے تم عجب کچھ ہو

ایک جگہ صابر کہتے ہیں ؎

منع گریہ نہ کر تو اے ناصح ٭ اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح ٭ تو کب تک مرے منھ کو دھوتا رہے گا

چنانچہ اس جذبہ کو راسخ نے یوں پیش کیا ہے ؎

ضبط گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے
قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

---

[1] مرزا محمد علی فدوی عصر حیات اور شاعری مصنفہ ڈاکٹر سید محمد حسنین صہ ۱۱۹ تا صہ ۱۳۱

ٹپک پڑے ہیں رآسخ آنسو ٭ دل ہے کتنا گداز تیرا

اور امیںؔ کا بھی یہی عالم ہے ؎

عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری ہیں کٹی ٭ دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی

رضاؔ پر بھی یہی کیفیت طاری ہے، لوگ پوچھتے ہیں ؎

سچ کہو میر رضاؔ کس پہ ہوئے ہو عاشق ٭ بے سبب تو نہیں یہ ہر گھڑی رویا کرنا

اور پوچھنے والے کا پھر کیا عالم ہوا ؎

حال جس نے مرا سُنا ہوگا ٭ اُس نے سنتے ہی رو دیا ہوگا

فدوی کے ایک شاگرد ثابتؔ کی بھی یہ گریہ زاری ہے ؎

زلف و رخ سے دور پڑے ہیں کہہ دل اب کیا کام کریں

شام سے رو رو صبح کریں یا صبح سے رو رو شام کریں

میرؔ کی دنیا تاریک ہے ان کا دل مفلس کا چراغ ہے ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ٭ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ثابتؔ کی دنیا میں بھی چراغِ محبت روشن ہے مگر کیسا ؎

روشن ہے مرے شیشۂ سوزاں میں داغ ایک ٭ "تاریک گھر میں جلتا ہے جیسے چراغ ایک"

جوششؔ کے دل کا داغ بھی چراغ روشن سا وجود رکھتا ہے ؎

جس طرح دل کا داغ جلتا ہے ٭ اُس طرح کب چراغ جلتا ہے

رضاؔ کہتے ہیں ؎

نہیں یہ داغ سے جلتا دل و جگر اپنا ٭ چراغ لے کے دکھاتے ہیں غم کو گھر اپنا

میرؔ کے اس رنگ کو برتتے ہیں شعرائے عظیم آباد کے یہاں آورد نہیں بلکہ آمد ہے، ذیل میں شعرائے عظیم آباد کے نمونۂ کلام کو پیش کیا جاتا ہے ؎

امیںؔ :

عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی ٭ دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی

تپاں:

جب محبت کا نام کوئی لے ٹک صبوری سے کام کوئی لے
دل یہ چلائے ہے کہ اب ہم کو دونوں ہاتھوں سے تھام کوئی لے

جوشش:

یار بن لطف کیا ہے جینے کا ایسی ہم زندگی سے در گذرے
مغتنم جانتا ہوں رونے کو گر مری یوں ہی عمر بھر گذرے

خلیل:

اے اشک نہ کیجیو آشکارا منھ پر نہ چڑھے جو کچھ نہاں ہے
نالہ مرا سن گلی میں پوچھا بے رحم کسی کی یہ فغاں ہے
لوگوں نے کہا خلیل ہو گا بولا کہ وہ اب تلک یہاں ہے

حضور:

ہے افسوس اے عمر جانے کا تیرے کہ تو میرے پاس ایک مدت رہی ہے
یہ طوفان اشک اس میں آنکھوں کی کشتی تعجب ہے کیونکر سلامت رہی ہے

شورش:

شورش یہ تیرے نالہ جانکاہ سے تو رات چاہا کہ سوؤں کوئی گھڑی پر نہ سو سکا

دل:

شرمندہ ہوا آخر میرے دل پُر خوں سے منھ ڈال کے جب دیکھا غنچے کے گریباں میں
دیکھا جو مرے دل کو یہ بات کہی غم نے کس طرح سے رہیگا اس خانۂ ویراں میں

سجاد:

میں دل کو یوں سمجھاؤں ہوں گھبراوے مت وہ آوے ہے
اک دم دبلا ہڈی ہڈی پہچان بھی کوئی پاوے ہے
بن بن جو پھرے مارا مارا سجاد وہی کہلاوے ہے

راسخ :

یہ رنج غریبی سبب خستہ تنی ہے ⁂ جوں نقش قدم اپنا وطن بے وطنی ہے
اے اہل طرب بزم میں ہم ماتمیوں کے ⁂ مت آئیو یاں نوحہ گری سینہ زنی ہے
جلنے پہ مرے دل کے تم آنسو نہ بہاؤ ⁂ مت آب فشاں کیجیو یہ بنا سوختہ تنی ہے

رضا :

یار بن اپنی زندگی اے خضر ⁂ موت ہے موت ہے عذاب عذاب

گریاں :

جدائی سے تری رہتا ہے دل رنجور پہلو میں ⁂ رہے گی تنگ غیروں کے تو مغرور پہلو میں
ہمارے یار بھی دشمن بغل کے ہو گئے گریاں ⁂ کریں ہیں ہر گھڑی کس کا یہ سب مذکور پہلو میں

نالاں :

گر نہ ہوتا قافلہ ہمراہ اشک و آہ کا
پہنچنا معلوم تھا اس تک دل گمراہ کا

مشتاق :

کیا دکھا دیں گے منھ وفا کو ہم
چشم میں نام کو بھی نم نہ رہا
کون سا نالہ تھا کہ سر نہ رہا
آہ دل میں ترے اثر نہ رہا

چنانچہ عظیم آباد کی شاعرانہ فضا میں میر کا رنگ اس قدر مقبول عام ہے کہ دور متاخرین کے شعرائے بھی اس رنگ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا ہے، حالات نے بھی ذیل کے دو عظیم آبادی شعرا کو کچھ ایسا حرماں نصیب بنا دیا کہ ان کا کلام درد و اثر سے پُر معلوم ہوتا ہے، درد و اثر میں مماثلت کی بنا پر لوگوں نے ان کے کلام کو میر کے نام سے منسوب کرنا شروع کر دیا تھا ؎

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم رات کو اٹھ اٹھ روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

ضیا عظیم آبادی

صحرا صحرا دریا دریا مارے مارے پھرتے ہیں ∴ آہو جان کے وحشی ہم کو ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

اختر عظیم آبادی

شاد عظیم آبادی کے کلام میں میر کا گہرا رنگ موجود ہے، مثال کے طور پر شاد کا ایک مشہور شعر ہے ؎

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا ∴ زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

دور متاخرین کے شعرائے کلام میں یہ رنگ کس قدر مقبول عام ہے اور اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں چند شعرائے کلام بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎

لطف رونے کا جب ہے اے غم یار ∴ آئے اشکوں میں خونِ دل مل کے

رنج اتنے اٹھائے اے شاداب ∴ حوصلے پست ہو گئے دل کے

شاداب رسول پوری تلمیذ امیر مینائی

کلیجے کا پھپھولا دیکھ کر جی میرا بھر آیا ∴ دبی تھی جو پرانی چوٹ یوں اس کو ابھرنا تھا

شفق جینے پہ جو مرتے تھے مرتے اور دکھ سہتے ∴ وہی اچھے رہے جینے سے اچھا جن کا مرنا تھا

شفق عماد پوری

یوں دل کی آرزو دلِ مضطر میں رہ گئی ∴ آندھی سی اٹھ کے گنبد بیدر میں رہ گئی

فصیح الدین بلخی عظیم آبادی

جو نالہ لب تک آتا ہے وہ بے تابانہ آتا ہے ∴ دلِ بیتاب کا کہتا ہوا افسانہ آتا ہے

ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی

یہاں تک کہ دورِ جدید کے بہار کے مشہور شاعر ڈاکٹر کلیم عاجز عظیم آبادی کا نام لینا کافی ہے جن کی شاعری میں میر کے کلام کی بھرپور جھلک ہے۔

یہ امر بھی کافی غور طلب ہے کہ داغ کی شاعری کا اثر خصوصی طور پر عظیم آبادی شعراء کے کلام میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر داغ کے نامور شاگرد ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے جنہوں نے اپنے استاد کے رنگ کے اتباع کو کمال کی منزل تک پہنچایا۔ یوں تو داغ دہلوی کے شاگردوں میں ڈاکٹر اقبال بھی ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں بطور احترام ذکر کیا ہے لیکن ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی

کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ ان کے اشعار بالکل داغؔ کے رنگ کے معلوم ہوتے ہیں، داغؔ دہلوی عظیم آباد میں جناب باقرؔ عظیم آبادی کے گھر پہ تشریف لائے تھے۔ چنانچہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

چار دن کی جو سیر پٹنے کی	یہ ہوئی وجہ جی اُچٹنے کی
میر باقرؔ کے گھر قیام ہوا	خوب دعوت کا اہتمام ہوا

داغؔ کے بہاری شاگردوں میں جناب ہاتفؔ پچنوی، جناب نسیمؔ ہلسوی، جناب نظام الدین بلخی اور ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کا نام لینا کافی ہے۔

شعرائے عظیم آباد نے مثنوی نگاری کی طرف بھی خصوصی توجہ کی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں راسخؔ[1] نے اپنے کمال دکھلائے، قاضی عبدالغفار غفارؔ کی مثنوی جواہر الاسرار ۱۱۱۹ھ، محمد فقیہہ کی مثنوی ساقی نامہ، شاہ حضرت رکن الدین عشقؔ کی مثنوی ساقی نامہ۔ اسی طرح شیخ غلام یحییٰ حضورؔ کی دو مثنویاں خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی میں موجود ہیں، شاہ آیت اللہ جوہریؔ کی مثنوی گوہر جوہری بطور خصوصی قابل ذکر ہے (اس مثنوی کو پروفیسر سید حسن عسکری نے منظر عام پر لایا) جوششؔ کی چار مثنویاں، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشقؔ کی مثنوی زیبا۔ شعرائے متاخرین نے بھی مثنوی نگاری کی طرف توجہ کی ہے، شوقؔ نیموی کی مثنویاں نغمۂ راز ۱۳۰۳ھ، سوز و گداز ۱۳۱۲ھ شہرت کی حامل ہیں۔ شادؔ عظیم آبادی نے کئی مثنویاں لکھیں۔ نالۂ شاد ۱۳۰۷ھ مثنوی چشمۂ کوثر غیر مطبوعہ اور ایک قومی مثنوی مادرِ ہند لکھی۔ شاہ امیر الدین وجدؔ کی بھی تین غیر مطبوعہ مثنویاں موجود ہیں۔ کیفیؔ بہاری کی قومی مثنوی ۱۹۱۲ء مولانا عبدالحلیم شررؔ کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ باقرؔ عظیم آبادی نے بھی مثنوی کیمیائے دل کہی۔ احقرؔ بہاری، شوقیؔ منیری[2] کی بھی غیر مطبوعہ مثنویاں یادگار ہیں۔

عظیم آبادی شعرائے مرثیہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ عہد متقدمین میں جوہریؔ کی شخصیت

---

[1] ملاحظہ ہو مثنویات راسخؔ مصنفہ ڈاکٹر ممتاز احمد ص ۲۴ تا ص ۴۸

[2] ″ ″ صوفی منیری کے نثری کارنامے مصنفہ ڈاکٹر طیب ابدالی ص ۲۵

نمایاں طور پر قابل ذکر ہے اس کے علاوہ نورالحق تپاں اور ظہورالحسن کی شخصیت ہے جنہوں نے کئی مرثیے لکھے، جناب قاضی عبدالودود نے عہد متقدمین اور متاخرین کے مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنے مقالہ "بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا" ۱۸۵۷ء میں نہیں کیا ہے، بہرکیف قاضی صاحب یہ لکھتے ہیں:

"مصنف نے پھلواری کے مرثیہ نگاری کی طرف خاص توجہ کی ہے لیکن خاص عظیم آباد کے مرثیہ کہنے والوں کا ذکر نہیں کیا۔ حیراں عظیم آبادی مرثیہ میں مظلوم تخلص کرتے تھے اور بقول شورش مرثیہ گوئی میں شہرت تام رکھتے تھے، شورش وغیرہ نے دوسرے عظیم آبادی مرثیہ نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے . . . .

سلیم گریاں (برادر کلیان سنگھ) غلام بنگالی (کندا) عشرت سعداللہ متخلص بہ شاہ راغب، رند، مکرم علی خاں مکرم (صاحب دیوان) محمد سعید، حسرت، ثبات، ذبیح، یکتا، صوفی منیری وغیرہ قابل ذکر تھے۔"

جناب صفیر بلگرامی نے بھی مرثیہ لکھا۔ شاد عظیم آبادی نے اس سلسلہ کو قائم رکھا، بالکل دور جدید کے شعراء میں علامہ جمیل مظہری مرحوم، راز عظیم آبادی کا نام لینا کافی ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر مرحوم برابر محرم کی مجالس میں شرکت کے واسطے آتے رہے ان کے بعد میر انیس اور مرزا دبیر کے خاندان والے برابر اس سلسلہ کو قائم رکھے رہے۔

عظیم آباد کے شعراء نے ہجو کی طرف کم توجہ کی ہے البتہ اشرف علی خاں فغاں کا نام قابل ذکر ہے جنہیں ظریف الملک کہا جاتا ہے۔

شعرائے عظیم آباد کے کلام میں لکھنوی طرز بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ راسخ عظیم آبادی دو بار لکھنو تشریف لے گئے، راسخ جب دوسری مرتبہ لکھنو گئے تو وہ زمانہ غازی الدین حیدر کا تھا اور ناسخ کا طوطی بولتا تھا، بقول قاضی عبدالودود راسخ کے زمانہ ہی سے عظیم آباد کے شعرا پر ناسخ کا اثر ہونے لگا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر کے شعراء نے ناسخ کا گہرا رنگ قبول کیا۔ مہدی عظیم آبادی نبیرہ مصنف سیر المتاخرین کے کلام میں ناسخ کا طرز نمایاں طور پر ملتا ہے، ان کا دیوان

کتب خانہ خدا بخش میں ہے۔ اس میں ناسخ کے متعلق یہ مطلع ہے ؎

ہو سکے مہدی سے کب ناسخ کے دیواں کا جواب
مور کی کیا تاب ہے دے جو سلیماں کا جواب

دیوان میں طرزِ ناسخ کی بہت سی غزلیں ہیں، اس رنگ کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہو تصور کیوں نہیں اس کے رُخِ پُر نور کا ؛ ہے مداوا قرص کافور اس دلِ محرور کا

شاد عظیم آبادی کے استاد محترم حضرت الفت حسین کا اردو کلام زیادہ نہیں، بہر حال ان کے کلام میں ناسخ کی جھلک نظر آتی ہے ؎

خوں ہو کے دل عبث غمِ دوری سے بہہ گیا ؛ یہ آبلہ تو زیبِ کفِ پائے یار تھا

فریاد[1] کے شاگرد مہدی بخش تسلیم کا دیوان سراسر ناسخ کے رنگ میں ہے اور ان کا دیوان کتب خانہ خدا بخش میں موجود ہے، ان کے دو اشعار دیکھیے ؎

جگر میرا ہے گلشن لالہ زار داغ ہجراں کا ؛ شگافِ زخمِ بلبل چاک ہے میرے گریباں کا
میں ہوں دیوانہ ملکِ بے نشاں وحشتِ پنہاں کا ؛ رگِ مژگانِ عنقا سبزہ ہے میرے بیاباں کا

[2] خواجہ سلطاں خاں سلطان متوفی سنہ ۱۲۷۲ھ، صاحب دیوان ان کا دیوان کتب خانہ خدا بخش میں موجود ہے، بیشتر غزلیں ناسخ کے رنگ کی ہیں، ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وار کیا معلوم تیغ نگاہِ یار کا ؛ ساحل بحرِ فنا ہے گھاٹ اس تلوار کا
موجِ آبِ زمرد سے مری زنجیر ہو ؛ ہوں میں دیوانہ کسی کے سبزۂ رخسار کا

فیض[3] عظیم آبادی بھی مصحفی کے آخری زمانہ میں ان کے شاگرد ہو گئے۔ ان کے یہاں بھی ناسخ کے رنگ کے شعر ملتے ہیں ؎

آسماں پر اشک کو لے جائیگی تحریکِ آہ ؛ یہ ہوا اُٹھتے ہی دریا موجِ خوں ہو جائیگا
فیض اب اس کو ندامت ہے نمک پاشی سے ؛ تیرے زخموں نے عبث اس پہ شکر خند کیا

---

[1] [3] ملاحظہ ہو مقالات قاضی عبدالودود مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد ص ۸۹ تا ص ۹۲

سید علی خاں قائل عظیم آبادی شاگرد رشک لکھنوی سراپا سخن اور سخن شعرا میں ایک شعر درج ہے ؎

نالے کئے ہیں دیکھ کے تل تیری ہونٹ کے ؛ مکھی بنا کشنگ کی ایک ایک خالی لب

مرشد حسن کامل عظیم آبادی شاگرد وزیر لکھنوی سراپا سخن اور سخن شعرا میں ان کا کلام ہے ؎

چٹکی انگشت حنائی سے بجا کر کہتے ہیں ؛ بولتا ہے لال تو دیکھو حنا کے رنگ کا

صفیر بلگرامی کی تقریباً ساری عمر بہار میں گذری، وہ میر امان علی سحر شاگرد ناسخ و برق سے تلمذ اختیار کر چکے تھے۔ صفیر ناسخ کے مداح تھے ان کا کلام بالکل لکھنوی رنگ میں ہے۔

جناب قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق بہاری شعرا نے ریختی بھی کہی ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک" پر ایک گرانقدر تبصرہ کیا جو رسالہ سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی اکتوبر ۱۹۵۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا بعدہٗ جناب کلیم الدین احمد نے قاضی صاحب کے ان مقالوں کو کتابی شکل میں شائع کیا، قاضی صاحب بہار میں ریختی گوئی کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں۔

"بہاری شعرا نے ریختی کہی ہے، مہدی عظیم آبادی کے دیوان میں تو ریختی کے اشعار برائے نام ہیں مگر دعا (بقول قاسم حسن خاں کتاب دار خدا بخش خاں ان کے پردادا) کے کلیات کتب خانہ خدا بخش میں ان کا دیوان ریختی شامل ہے یہ انشا کے بڑے مداح اور ان سے متاثر تھے۔ دعا کا ایک شعر یہ ہے ؎"[1]

حضرت انشا تلک ساری بات ؛ رہ گیا ہے اب دعا نام سخن

عظیم آباد میں مشاعرہ کا رواج عہد جوشش اور راسخ میں موجود تھا[2]، ان مشاعروں میں سے کسی ایک مشاعرہ میں راسخ نے اپنی مشہور غزل پڑھی تھی جو سراج کی مقبول و معروف غزل پر کہی گئی تھی جس کا

---

[1] ملاحظہ ہو مقالات قاضی عبدالودود مرتبہ کلیم الدین احمد ص ۱۶۳ تا ص ۱۶۴

[2] عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ مصنفہ ڈاکٹر یوسف خورشیدی ص ۳۴ تا ص ۳۵

یہ شعر تغزل کا بہترین نمونہ ہے ؎

نہیں ہوش والوں سے کچھ غرض مجھے رشک ہے تو انہیں پہ ہے
جنہیں تیرے جلوے کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

عظیم آباد میں ابو تراب خاں کے دولتکدہ میں بڑے دھوم دھام سے مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ان مشاعروں[1] میں راسخ اکثر و بیشتر شرکت فرماتے تھے۔ عمر ان کی اس وقت ستر سے زیادہ تھی۔ شاد عظیم آبادی کے استاد محترم حضرت فریاد نے اپنی پہلی غزل راسخ کی موجودگی میں پڑھی تھی۔

حضرت فریاد کی ننہیال محلہ دلحول پورہ متصل حاجی گنج میں بھی ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کو مشاعرے ہوتے تھے ان میں دو مشاعرے کافی کامیاب ہوئے، ان مشاعروں میں مہبت سنگھ یادگار خاندان مہاراجہ شتاب رائے، نواب فیروز جنگ، نواب سہراب الدولہ، نواب شجاع قلی خاں وغیرہ رؤسائے شہر نے شرکت کی۔ شعرا میں راسخ عظیم آبادی، منشی کاظم علی خاں، حکیم ابوالحسن مفتوں، نواب مرزا مہدی خاں کے نام سرفہرست ہیں۔

راجہ پیارے لال الفتی کے پوتے کنور سکھراج بہادر رحمتی بڑے دھوم دھام سے مشاعرہ کرایا کرتے تھے جن میں صوبہ بہار کے نامور شعرا شرکت فرماتے تھے۔ انہوں نے ۱۲۹۵ھ میں نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ پانچ مشاعرے کئے تھے اس کے علاوہ رائے بیجناتھ پرشاد غنیمت کا بھی نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ۱۲۷۰ھ میں مشاعرہ کرایا تھا۔ بادشاہ نواب رضوی نے شعر و سخن کی کئی ایسی مجلسیں منعقد کرائیں جو آج بھی بطور یادگار ہیں۔ بادشاہ نواب رضوی کے بعد دوسری شخصیت سید شاہ حامد حسین حامد عظیم آبادی کی ہے جن کی دعوت پر ہندوستان کے ممتاز شعرا سائل دہلوی، سیماب اکبر آبادی، نوح ناروی اور احسن مارہروی بار بار عظیم آباد آتے تھے اور درگاہ شاہ ارزاں کے مشاعرے میں شرکت فرماتے تھے۔

دبستان عظیم آباد بحیثیت مجموعی طور پر ہندوستان کے ادبی مراکز میں ہے۔ اس کی

۱؎ عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ مصنفہ ڈاکٹر یوسف خورشیدی ص ۳۴ تا ص ۳۵

خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تحت اور بھی چھوٹے چھوٹے ادبی مراکز مختلف محلوں اور ٹولوں میں موجود تھے۔ مثال کے طور پر محلہ صادق پور کو لیجئے جہاں مولوی عنایت علی اور مولوی ولایت علی جیسی شخصیتیں گذری ہیں۔ تذکرہ صادقہ کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی جیسی شخصیتیں ہندوستان گیر شہرت کی حامل تھیں۔ جب آپ دہلی تشریف لے جاتے ہیں تو آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ ظفر کو دہلی میں آپ کی تشریف آوری کی خبر ملتی ہے تو حکیم مومن خاں مومن کے توسط سے وہ اپنے محل میں مدعو کرتے ہیں چنانچہ مولانا موصوف وہاں تشریف لے جاتے ہیں ان کی ایسی عظیم شخصیت تھی کہ حضرت سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد ہندوستان گیر طور پر وہابی تحریک کی امامت انہیں کے سپرد ہوئی۔

صوبہ بہار کو اس امر کا فخر ہے کہ نہ صرف کسی شہر بلکہ قصبات اور دیہات سے اپنے ادبی چشم و چراغ پیدا کئے جنہوں نے دنیائے ادب میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ چنانچہ ڈاکٹر کلیم عاجز اپنے گرانقدر مقالہ میں انہیں پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں، موصوف لکھتے ہیں:

ؔ "بہار میں عہد جدید شاعری کا علمبردار علامہ فضل حق عظیم آبادی گیا ضلع کے ایک کوردہ گاؤں شاہ بگہہ کے رہنے والے تھے، انگریزی ادب اور انگریزی شاعری کا آہنگ اردو شاعری میں بھرپور طریقے سے سمونے والا اور اردو شاعری کے آسمان میں سب سے روشن مگر سب سے غیر معروف شاعر نظیر اکبرآبادی کے صحیح مقام اور صحیح حیثیت سے اردو دنیا کو پہلی مرتبہ متعارف کرانے والا پروفیسر عبدالغفور شہباز ایک نہایت کوردہ گاؤں سرہیرا کا رہنے والا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری نصف سے لے کر عہد حاضر تک اکثر و بیشتر صاحب فن و کمال نے صوبہ بہار کی اردو شاعری کو نہیں بلکہ اردو دنیا کو اردو شعری ادب سے روشناس کرایا

ؔ ملاحظہ ہو بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء اردو شاعری تحقیقی مقالہ مصنفہ ڈاکٹر کلیم عاجز۔ ص ۱۱۱ مخزونہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری۔

ان میں شفق عماد پوری، احقر بہاری، صوفی منیری، صفیر بلگرامی، نسیم ہلسوی، فوق مفتی گنجوی، عرش گیاوی، حسرت بیتھوی، ولی سنڈوی، عطا بہاری، کیفی بہاری دیہات و قصبات کے رہنے والے ہیں۔

جناب سید سلیمان ندوی مرحوم نے عظیم آباد کے ادبی پس منظر کے ضمن میں اپنا یوں خیال ظاہر کیا ہے، موصوف نے لکھا ہے:

لہ "پٹنہ عظیم آباد ہندوستان کے ان قدیم شہروں میں ہے جو کئی ہزار سال سے علم و ہنر کا گہوارہ رہا ہے۔ ابتدائے عہد کو چھوڑ کر صرف آخری صدیاں جن کے ہر دور میں اس خاک سے ہزاروں ارباب کمال اٹھے ہیں جن کی شہرت کا فسانہ اب تک تاریخ کہن نہیں بنا ہے۔۔۔۔"

صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ جلوۂ خضر میں غلط نہیں لکھا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو کا تیسرا مرکز عظیم آباد ہے۔

بہرام جنگ، مظفر جنگ، سید ہدایت علی وغیرہ صوبہ داران پٹنہ نے بھی اپنے بعد اپنے علمی قدردانی کے کارنامے چھوڑے ہیں۔ مسلمان شعرا کے پہلو بہ پہلو راجہ شتاب رائے، مہاراجہ پیارے لال الفتی کا نام لینا چاہئے۔ جن کی سرپرستی، سخن سنجی اور سخن فہمی نے عظیم آباد کو لکھنؤ بنا دیا۔

لیکن جناب ثاقب عظیم آبادی اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ موصوف یوں لکھتے ہیں:

لہ "میں یہاں پر حضرت صفیر بلگرامی اور علامہ موصوف سے بہ ادب اختلاف کرنے کی جرأت چاہتا ہوں، تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ عظیم آباد میں لکھنؤ سے پہلے شعر و شاعری کا چرچہ زیادہ ہوا اور دہلوی شعرا کی آمد سے پہلے ہی پٹنہ میں باکمال شعراء موجود تھے مثلاً بارہویں صدی کے ربع ثالث میں انیس، جوشش، دل جیسے

لہ مقدمہ کلام شاد مصنفہ علامہ سید سلیمان ندوی بحوالہ یادگار عشق مصنفہ ثاقب عظیم آبادی ص ۲۵

لہ یادگار عشق مصنفہ ثاقب عظیم آبادی ص ۲۶

استادِ فن اپنی بساطِ سخن بچھائے ہوئے تھے۔ اس دور میں اور اس کے بعد فغاں، میر ضیا، عشق، فدوی، حزیں، بسمل وغیرہ آئے اور دہلی کے اس اختلاط نے عظیم آباد کی شاعری کی رونق دوبالا کر دی لیکن بخلاف اس کے لکھنؤ کا یہ دور کسی باکمال ریختہ گو سے آشنا نہیں"۔

دبستان عظیم آباد کی ایک عظیم خصوصیت یہ ہے کہ یہ دبستان ہمیشہ علاقائی عصبیت سے بالکل پاک رہا۔ غیر مسلم شعرائے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر راجہ رام نرائن موزوں، اُجاگر چند الفت، کنور سکھراج بہادر رحمتی اور بابو اودھ کشور رکشہ گیاوی اور جگیسر پرشاد خلش کے نام خصوصی طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو کے مشہور محقق خواجہ عبد الرؤف عشرت کا تذکرہ ہندو کے اردو شعراء اور فصیح الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے موازنہ سے اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوگی۔ خواجہ صاحب کا یہ تذکرہ لگ بھگ پانچ سو شعراء کے حالات اور کلام پر مشتمل ہے اور بلخی صاحب مرحوم کے اس تذکرہ میں لگ بھگ ایک سو پچیس ۱۲۵ شعراء کے حالات ملتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دبستان عظیم آباد عصبیت سے بالکل پاک ہے۔

محلہ حاجی گنج کو لیجئے، خان بہادر علی محمد شاد جیسی شخصیت نے اس محلہ میں جنم لیا، محلہ مغلپورہ میں لاڈلے صاحب بیتاب تھے جن کی شخصیت خدمت ادب میں وقف تھی۔ محلہ خواجہ کلاں میں عبد الحمید پریشاں جیسی شخصیت موجود تھی۔ محلہ لودی کٹرہ جس کو یہ فخر حاصل ہے کہ آج بھی راسخ عظیم آبادی کی قبر عہد ماضی میں ادب نوازی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ وہاں حمید عظیم آبادی اور پرویز شاہدی ناز کرنے کے قابل ہیں۔ محلہ گودرہٹہ ایک نہایت چھوٹا سا محلہ ہے اس کو اس بات پر ناز ہے کہ باقر عظیم آبادی اور ضیا عظیم آبادی جیسے اعلیٰ پایہ کے شاعر گذرے۔ عظیم آباد کے ان محلوں کا اوپر ذکر ہو چکا ان میں بخشی محلہ کو بھی کم فوقیت حاصل نہیں جس نے ڈاکٹر غیاث الدین بلخی، فصیح الدین بلخی مرحوم، عزیز الدین بلخی مرحوم، نظام الدین بلخی مرحوم جیسے ادب کے نگینوں کو پیدا کیا، جہاں غالب دہلوی کے عزیز شاگرد خواجہ فخر الدین سخن اس طرح آئے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ عظیم آباد کے ادبی ماحول میں بخشی محلہ کو ایک خاص خصوصیت حاصل تھی کیوں کہ اس کا تعلق عظیم آباد کے دور والے محلوں کے ادبی مرکزوں سے بھی گہرا تھا اور کم و بیش روزانہ ادبی مجلسیں ہوا کرتی تھیں جس میں ضیا عظیم آبادی، یاس عظیم آبادی

(یاس یگانہ چنگیزی) خواجہ فخر الدین سخنؔ، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، حکیم فہیم الدین احمد اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد جیسی شخصیتیں تشریف فرما ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ عزیز الدین بلخی رازؔ عظیم آبادی مرحوم مصنف تاریخ شعرائے بہار کے مکان کا وسیع کمرہ صرف ادبی محفلوں کو منعقد کرنے کے لئے وقف تھا، یہ ایک ایسا ادبی مرکز تھا جو ہر اعتبار سے ادبی معاملوں میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔

حفیظ الدین بلخی مرحوم نے اپنی ادارت میں ایک ادبی رسالہ "تحفۂ بہار" نکالا تھا۔ اس کی ادارت میں جناب سید فریدالحق فرید عظیم آبادی بھی تھے (فرید عظیم آبادی خواجہ فخر الدین سخن کے تلمیذ تھے) چنانچہ جناب کلیم الدین احمد نے اپنی خود نوشتہ سوانح حیات "اپنی تلاش میں" اس رسالہ (تحفۂ بہار) کا ذکر کیا ہے، موصوف کے اپنے بڑے چچا مولوی حکیم فہیم الدین احمد مرحوم بھی حفیظ الدین بلخی مرحوم کے گہرے دوستوں میں تھے۔ کلیم صاحب مرحوم نے حفیظ الدین بلخی کی ابتدائی تین غزلیں اپنی تلاش میں، پیش کی ہیں۔

رسالہ تحفۂ بہار میں ہر ماہ شعرا کی طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ گویا یہ رسالہ ایک گلدستہ کی شکل رکھتا ہے۔ اس رسالہ کا ایک نسخہ بابت فروری ۱۸۹۷ء راقم کی نظر سے گذرا ہے جس میں یہ مصرعہ طرح ہے ؎ تیری زلفوں نے کیا مجھکو پریشاں کیسا

جناب عزیز الدین بلخی مرحوم نے اپنی ادارت میں ایک رسالہ "رفتار زمانہ" جاری کیا تھا چنانچہ یہ رسالہ ادبی معرکہ آرائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا، اس دور کے عظیم آباد میں عظیم آبادی شعرا دو گروپ میں منقسم تھے۔ ایک شادؔ اسکول کا ہمنوا تھا اور دوسرا داغؔ اسکول کا پرستار، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی اور نظام الدین بلخی مرحوم داغؔ دہلوی کے براہ راست شاگردوں میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ حضرات بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ بالخصوص حکیم فہیم الدین احمد اور خواجہ فخر الدین سخن جیسے لوگ بھی ان ادبی معرکہ آرائیوں میں حصہ لیتے تھے چنانچہ رسالہ صنم کے بہار نمبر سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ جب صفیرؔ بلگرامی اور خواجہ فخر الدین سخن میں آن بن ہوئی تو سخن صاحب نے صفیر کی ایک مشہور غزل پر مصرع طرح لگاکر ان کی ہجوگوئی کی۔ صفیر بلگرامی کی زبان میں لکنت تھی۔ فصیح الدین بلخی مرحوم خود فرماتے تھے کہ جس وقت صفیر مرحوم مشاعروں میں شعر پڑھ دیتے تھے اکثر لکنت کے سبب وہ لیٹ جایا کرتے تھے اس کی

طرف سخن نے اپنی ہجوگوئی کے ایک بند میں یوں اشارہ کیا ہے ؎

الفاظ نکلتے ہیں دہن سے جو گدا گد
اور تھوک گرے پڑتے ہیں منہ سے جولدالد
لکنت ہے کہ ہے پھلجڑی یا کرتے ہو تم رد
بجھی ہوئی ہے پھولوں کی چادر سر مرقد
تم فاتحہ پڑھتے ہو کہ گلریز ادا ہو

جناب سید تجمل حسین سلطان عظیم آبادی تلمیذ صفیر بلگرامی نے اپنی کتاب مرقع فیض میں صفیر کے شاگردوں میں سخن اور شاد کا بھی ذکر تحقیقی حوالہ سے کیا ہے چنانچہ صفیر بلگرامی کے پوتے سید وصی بلگرامی نے رسالہ ندیم" بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں ایک تحقیقی مضمون س۔ ش۔ ص لکھا جو آج بھی بہار کی ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے اپنی تصنیف صفیر بلگرامی بحیثیت ناقد و شاعر میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ موصوف نے ان دستاویزوں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا جس میں شاد اور سخن نے صفیر بلگرامی سے شاعری میں اصلاح لی تھی۔ ظفر صاحب نے یہ تبرکات وصی بلگرامی کے پاس مارچ ۱۹۶۷ء میں کراچی پاکستان میں دیکھا تھا۔

سلہ (کرم خوردہ) .... کسی کا ہو جو دیوانہ اسے ہشیار کہتے ہیں
دہن غنچہ ہے آنکھیں نرگسی شہلا ہیں اے گلرو تمہارے چہرۂ رنگیں کو ہم گلزار کہتے ہیں
اصلاح: دہن غنچہ ہے سنبل زلف آنکھیں نرگسی شہلا

ظفر اوگانوی نے سخن دہلوی کے اس خط کی بھی نقل پیش کی جو انہوں نے صفیر بلگرامی کو لکھا تھا۔ یہ خط فارسی زبان میں ہے۔

سلہ " استادی سید فرزند (کرم خوردہ) بعد تسلیم عرض رسا است بافضل تعالیٰ

سلہ صفیر بلگرامی بحیثیت ناقد و شاعر مصنفہ ڈاکٹر ظفر اوگانوی ص ۱۹۷
سلہ " " " " " " ص ۲۰۰

غزلے گفتہ ام برائے اصلاح ابلاغ خدمت است۔ قصہ سخن (کرم خوردہ) اگر طیار شدن باشد زحمت شرمندہ شود (کرم خوردہ) از نام فدوی ام دراں داخل کردہ شدند ...... گردد۔

فقط دستخط سید فخرالدین سخن عفی عنہ

بعض مرتبہ یہ ادبی معرکہ آرائیاں ناخوشگوار تعلقات کے بنا پر ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر خواجہ فخرالدین سخن کے انتقال کے بعد ان کا غیر مطبوعہ دیوان ان کے چھوٹے لڑکے خواجہ حفیظ الدین کے گھر سے چوری ہو گیا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد بلخ والے دوستوں میں سے ایک صاحب نے ایک غزل عزیزالدین بلخی مرحوم کے گھر میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں سنائی۔ فصیح الدین بلخی مرحوم بھی موجود تھے۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ مشاعرے کے اختتام کے بعد بہت سے شعرائے کرام کے اشعار ان کو یاد ہو جایا کرتے تھے۔ جب وہ حضرت نے چرائی ہوئی غزل سنائی تو مشاعرے میں فصیح الدین بلخی مرحوم نے اس غزل کے اور بھی اشعار سنا دیئے۔ اس پر وہ حضرت بہت خفا ہوئے اور چلتے بنے۔ بعض لوگوں نے یہ کوشش کی کہ گمشدہ غیر مطبوعہ دیوان کسی نہ کسی طرح حاصل ہو جائے۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو فصیح الدین بلخی مرحوم نے ایک بہت چھوٹی سی نظم بطور دیوان کا مرثیہ لکھ ڈالی جس کا درج ذیل شعر آج بھی لوگوں کو یاد ہے ؎

دیوانِ گمشدہ پہ میں پڑھ لوں گا فاتحہ
آپ اپنی شاعری کا جنازہ اٹھائیے

صوبہ بہار میں اُردو شاعری کی طرح اردو نثر نگاری کی ترویج و اشاعت بھی صوفیوں کے زیرِ اثر ہوئی۔ تحقیق کی روشنی میں حضرت عمادالدین قلندر پھلواروی کا ایک مذہبی مختصر رسالہ ہے جو "صراط مستقیم" کے نام سے منسوب ہے۔ یہ رسالہ سنہ ۱۱۸۰ھ میں لکھا گیا اس کے بعد حضرت ظہورالحق ظہور سنہ ۱۱۸۰ھ تا سنہ ۱۲۳۴ھ کے چار نثری رسالے پائے جاتے ہیں:

(۱) رسالہ نماز (۲) فضائل رمضان (۳) فیض عام (۴) کتب النبی

یہ سب رسالے سنہ ۱۲۰۰ھ تا سنہ ۱۲۳۰ھ میں لکھے گئے۔ حضرت مخدوم شاہ حسن علی متوفی سنہ ۱۲۳۴ھ

خلیفہ و مرید مجاز حضرت منعم پاکباز عظیم آباد کے ایک جلیل القدر بزرگ گذرے ہیں۔ آپ کے خطوط کا ایک مجموعہ کتب خانہ قادریہ اسلام پور میں محفوظ ہے۔ ایک خط زبان اردو ہندی میں ہے۔ حضرت تقی حسن بلخی متوفی سنہ ۱۲۵۵ھ حضرت حسین نوشہ توحید بلخی کی اولاد میں ہیں۔ آپ نے ایک کتاب لکھی ہے جو سنہ ۱۲۸۳ھ میں کلکتہ سے چھپ چکی ہے۔ اس میں عقائد و ایمان اور دینی مسائل ہیں۔ حضرت محمد اسحاق عرف پیر دمڑیا ۱۲۳۳ھ کا دو رسالہ احکام شرع سنہ ۱۲۶۶ھ اور دوسرا جذبات معینہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، محمد احسن گیلانی سنہ ۱۲۶۲ھ اور مولوی شجاع الدین رضوی متوفی سنہ ۱۲۳۷ھ کے بعض رسائل ہیں جن کی نوعیت مذہبی ہے، شاہ عطا حسین منعمی نے سنہ ۱۲۳۱ھ تا سنہ ۱۳۱۱ھ ہدایت المسافرین تالیف کی، علمائے صادق پور نے بھی اردو نثر کی تخلیق میں نمایاں حصہ لیا۔ مولوی ولایت علی اور عنایت علی نے مختلف رسائل ایمان اور عقائد سے متعلق لکھے ہیں۔ عبدالرحیم صادق پوری نے سوانح نگاری میں ایک تذکرہ الدر منثور لکھا۔

لکھنو اور دہلی میں داستان طرازی کا رواج عام تھا۔ چنانچہ بہار نے بھی اس کی طرف توجہ کی ہے چنانچہ عالم عظیم آبادی نے بوستان خیال کا ترجمہ کیا۔ خواجہ فخر الدین سخن نے سروش کی ایک طبع زاد داستان یا قصہ سنہ ۱۲۸۱ھ میں لکھا۔ یہ فسانۂ عجائب کے جواب میں لکھا ہے۔

صوبہ بہار میں جہاں تک ناول نگاری کا تعلق ہے، شاد عظیم آبادی نے اپنا ناول 'صورۃ الخیال' المعروف ولایتی کی آپ بیتی موصوف کی ذات سے منسوب ہے۔ ڈاکٹر غیاث الدین بلخی نے اپنا ناول طرز معاشرت لکھا۔ نقش طاؤس محمد اعظم علی کا ناول ہے جو سنہ ۱۸۸۱ء میں طبع ہوا۔ سید افضل الدین عظیم آبادی متوفی سنہ ۱۹۰۶ء کا ناول افسانہ خورشیدی سنہ ۱۳۰۳ھ میں طبع ہوا، صفیر بلگرامی کا ناول جوہر مقالات، سنہ ۱۸۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ان کا دوسرا ناول گلبن موزوں کے نام سے مشہور ہوا۔ رشید النساء سنہ ۱۸۵۳ء تا سنہ ۱۹۲۹ء نے ایک اصلاحی ناول اصلاح النسا لکھی جو سنہ ۱۳۱۱ھ میں طبع ہوئی۔ علی سجاد عظیم آبادی کے دو ناول نئی نویلی اور محل خانہ مشہور ہیں جن میں سے محل خانہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مطبوعہ ہے اور دوسرا حصہ غیر مطبوعہ ہے۔ ضمیر الدین احمد عرش گیاوی نے ثمرہ نافرمانی کے نام سے ایک ناولٹ لکھا۔ اسلم عظیم آبادی نے بھی ایک ناولٹ فسانہ شیریں تالیف کیا۔ اختر اورینوی کا ناول حسرت تعمیر

اور سہیل عظیم آبادی کا ناول "بے جڑ کے پودے" قابلِ ذکر ہیں، مختصر یہ کہ ناول نویسی کے اعتبار سے صوبہ بہار قابلِ قدر ہے۔

تذکرہ نگاروں کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ اردو شاعری کا جو پہلا تذکرہ لکھا گیا ہے وہ عظیم آباد میں تذکرہ شورش اور تذکرہ مسرت افزا اس کی روشن دلیل ہے۔ تذکرہ نویسوں میں غلام حسین شورش کا تذکرہ "تذکرہ شورش"، ابوالحسن کا تذکرہ "مسرت افزا"، نواب علی ابراہیم خاں خلیل کا تذکرہ "گلزار ابراہیم"، وجیہہ الدین عشقی کا تذکرہ "تذکرہ عشقی"، عبدالغفور خاں نساخ کا تذکرہ "سخن شعرا"، صفیر بلگرامی کا تذکرہ "جلوۂ خضر" نواب امداد امام اثر کا تذکرہ "کاشف الحقائق"، عزیز الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ "تاریخ شعرائے بہار" فصیح الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ "تذکرہ نسوانِ ہند" اور "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" اور مولوی احمد اللہ ندوی کا تذکرہ "تذکرہ مسلم شعرائے بہار (۶ جلد) وغیرہ ایک اہم ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوانح نگاری کا جہاں تک تعلق ہے، حیاتِ فریاد کا مصنف علی محمد شاد، حیاتِ مومن کا مصنف عرش گیاوی، زندگانی بے نظیر کا مصنف پروفیسر عبدالغفور شہباز آپ کو ملے گا۔

محققین کا جہاں تک تعلق ہے قاضی عبدالودود، پروفیسر معین الدین دردائی اور خود فصیح الدین بلخی کا نام لینا کافی ہے۔

نقادوں کا جہاں تک تعلق ہے کلیم الدین احمد کو کون نہیں جانتا۔ جن کے نام سے ہندوستان اور پاکستان کا چپہ چپہ واقف ہے ماسوا اس کے ڈاکٹر اختر اورینوی، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور ڈاکٹر عبدالمغنی کا نام بھی محتاجِ تعارف نہیں۔

الغرض سطور بالا میں عظیم آباد کے ادبی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ خالص ادبی ماحول تھا اور اس ادبی ماحول کے پروردہ ہو کر انہوں نے یہ مقام حاصل کیا جس نے ان کے نام کو ادب کی تاریخ میں زندہ رکھا ہے۔

باب دوم

عصرِ فصیح الدین بلخی مرحوم

فصیح الدین بلخی مرحوم نے ستہتر (۷۷) سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ دور خصوصی طور پر عظیم آباد کا ایک زریں عہد کہا جا سکتا ہے۔ موصوف کی پیدائش ۱۸۸۵ء کی ہے اور وصال ۱۹۶۲ء۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اُنیسویں صدی کے بالکل اواخر حصہ کے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی اور بیسویں صدی کے اواخر حصہ میں موصوف کی ادبی حیثیت اس طرح کی ہوئی جس طرح ایک طالب العلم کی حیثیت دار العلوم میں ہوتی ہے اور ایک طالب العلم کے لئے علم دانی کا نہیں بلکہ علم سیکھنے کا ہوتا ہے۔

ان کے منجھلے بھائی مولوی نظام الدین بلخی مرحوم کا قول ہے کہ جب ان کے والد محترم ڈاکٹر غیاث الدین بلخی کا انتقال ہوا' ان کی عمر لگ بھگ مشکل سے پندرہ برس کی ہو گی۔ ڈاکٹر غیاث الدین بلخی بذاتِ خود ایک جیّد عالم تھے نیز علم نجوم میں کافی مہارت رکھتے تھے اور یہ فن بلخی صاحب مرحوم نے اپنے والد محترم سے سیکھا۔ اس ضمن میں بلخی صاحب مرحوم کے اُستاد بلخی صاحب مرحوم کے والد تھے۔ ان کی ذہانت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کم عمری میں اپنے والد محترم سے یہ فن سیکھا جس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔ ظاہر ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ خالص علمی و ادبی ماحول تھا۔ ان پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے سطورِ ذیل میں ہم عصر فصیح الدین بلخی کا جائزہ لے رہے ہیں۔

بالیدہ شعور ہونے کے بعد فصیح الدین بلخی مرحوم کو کچھ نہیں تو کم از کم ساٹھ برس کا ایک ایسا دور

نصیب ہوا جس کا عہد کا عظیم آباد علم و ادب کا خصوصی طور پر مخزن تھا۔ محلے محلے علم و ادب کے چرچے اور علوم و فنون کے مراکز تھے عصر فصیح الدین بلخی علم و ادب کا ایک ایسا عہد ہے جس کو خاص صنف ادب ہی کے لئے نہیں کہا جا سکتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جس کو جگہ جگہ صرف شعر و شاعری کا نہیں بلکہ نثری ادب کے فروغ کا دور کہا جائے گا۔ جن بزرگوں سے حد درجہ قربت فصیح الدین بلخی مرحوم کو حاصل ہوئی ان میں صفیر بلگرامی بھی تھے اور خواجہ فخر الدین سخن دہلوی بھی، سلطان عظیم آبادی بھی، فضل حق آزاد بھی اور جن بزرگوں کو انہیں دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ان میں داغ دہلوی بھی تھے، وحید الہ آبادی بھی، سائل دہلوی بھی، شاد عظیم آبادی بھی، ضیاء عظیم آبادی بھی اور شوق نیموی بھی، ان کے بچپن کی ادبی محفلیں جن میں شریک ہونے کا انہیں موقع ملا ان کا ذکر وہ اپنے گھر والوں سے بار بار کرتے تھے، اس ضمن میں سید بدر الدین بدر عظیم آبادی مرحوم اپنے گرانقدر مقالے "مولوی فصیح الدین بلخی" میں یوں لکھتے ہیں۔

"صرف تاریخ سے ان کو دلچسپی نہیں تھی، ہر پرانی چیز سے ان کو لگاؤ تھا۔ اس زمانہ کے شادیات کے چلن، تہواروں اور میلوں کے تذکرے، پٹنہ کی گندی ہوئی محفلوں کی داستانیں، پٹنہ کے نامی اور معرکے کے مشاعرے کے قصے یاد تھے شاعروں کی بیٹھکیں یاد تھیں اور حضرت شاد اور آسیخ کے جھگڑے یاد تھے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کے بچپن کے زمانے میں بالخصوص ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، لودی کٹرہ کے مشاعرے، حاجی گنج کے مشاعرے، بخشی محلہ کے مشاعرے، گودڑ ہٹہ کے مشاعرے اور بادشاہ نواب رضوی کے دولتکدے کے مشاعرے، ماہ محرم میں مرثیہ خوانی کی مجلس منعقد ہوتی تھی۔ ان محفلوں میں انیس و دبیر کے خاندان سے تعلق رکھنے والے مراثی نگار شریک ہوتے تھے۔ ظاہر ہے فصیح الدین بلخی مرحوم کے عصر اور آج کے عہد میں نمایاں فرق ہے، عظیم آباد کا وہ پٹنہ سیٹی جو علم و ادب کا مخزن تھا آج ویران ہے۔ فصیح الدین بلخی کا عصر بھی اسی بیسویں صدی کا دور ہے جو حقیقتاً ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۴ر مارچ ۱۹۶۳ء کو ختم ہوتا ہے جس نے انہیں ابدی نیند سلا دیا۔ ۱۹۰۰ء یعنی بیسویں صدی کے بالکل آغاز سے جو دور شروع ہوتا ہے یہ دور نہ صرف عظیم آباد کے لئے ایک مخصوص نوعیت کا دور ہے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے، ٹھیک اسی طرح عہد اولی سے لے کر ۱۸۰۱ء تک کا

دور ہے جو ادبی اعتبار سے صرف شاعری کے لئے سر بلندی کا دور کہا جائے گا۔ اس وقت تک شعری ادب کے مقابلہ میں نثری ادب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد نثر نگاری سے اُردو ادب ہمکنار ہوتا ہے۔ شاید اس حقیقت کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں، اور سنہ ۱۸۰۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۰۰ء تک کا جائزہ لیجئے تو اس ایک مکمل صدی کے عہد میں ہمارے نثری ادب نے نمایاں ترقی کی ہے۔ ادب کے معاملہ میں ایک صدی کا عرصہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ٹھیک اسی طرح دہلی کالج بھی اس کے فروغ اور ترقی کا علمبردار رہا چنانچہ دوسری زبانوں سے اردو زبان میں ترجمہ کا رواج اپنی زبان میں کتب نویسی کے مذاق میں تبدیل ہو گیا اور تمام علوم و فنون، علم ریاضی، علم معاشیات، منطق، فقہ وغیرہ کی کتابیں اردو زبان میں بھی شائع ہونے لگیں۔

نتیجہ ہم یہ نکالتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز تک پہنچتے پہنچتے اُردو کا نثری ادب بھی اچھا خاصا فروغ حاصل کر لیتا ہے، ہندوستان گیر طور پر اگر غور کیجئے تو میر امن دہلوی، رجب علی بیگ سرور سے لے کر ڈپٹی نذیر احمد تک صف اول کے نثاروں کی ایک فہرست ملتی ہے، جن میں سر سید، حالی، شبلی، منشی ذکاء اللہ اور عبد الغفور شہباز وغیرہ ناول نگاروں کے ضمن میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبد الحلیم شرر، اور مرزا محمد ہادی رسوا وغیرہ آتے ہیں۔

صوبہ بہار کا جہاں تک تعلق ہے یہ بھی اس معاملے میں بیرونی صوبے کے اہم مراکز سے کسی طرح پیچھے نظر نہیں آتا، اس عہد کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اردو شاعری ہر اعتبار سے علم و ادب کی محفل میں اپنا قدم جما چکی تھی اب اردو نثر بھی کسی طرح سے پیچھے نظر نہیں آتی اور صوبہ بہار میں خصوصی طور پر عظیم آباد اس معاملے میں پیش پیش ہے۔ تذکرہ نویسی کے ضمن میں عظیم آباد سے کئی اہم تذکرے منظر عام پر آئے۔ ان میں صفیر بلگرامی کا تذکرہ "جلوۂ خضر"، عبد الغفور نساخ کا تذکرہ "سخن شعرا" اور امداد امام اثر کا تذکرہ "کاشف الحقائق"۔ اس طرح ادبی نوعیت کی سوانح خواجہ الطاف حسین حالی نے "یادگار غالب" لکھی۔ ٹھیک اسی نوعیت کی علی محمد شاد کے قلم سے ان کے اُستاد کی سوانح حیات فریاد منظر عام پر آئی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے جب میدانِ علم و ادب میں اپنا قدم رکھا تو ان کی نگاہ یہ دیکھنے سے قاصر نہ رہی کہ علم و ادب کے فروغ میں تحقیق و جستجو کو ایک اہم مقام حاصل ہے اس لئے کہ زمانے کے

بے درد ہاتھوں سے کتنے اعلیٰ پایہ کے فنکار ہمیشہ کے لئے گمنام رہ جاتے ہیں جیسا کہ خود صوبہ بہار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نظیر اکبر آبادی واقعی ان کی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود اور ان کی اعلیٰ شاعری کے باوجود وہ اپنا اصل مقام حاصل نہ کرتے جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر بہار کا ایک فرد عبدالغفور شہباز حیات "زندگانی بے نظیر" نہ لکھتا۔ شاید ایسی ہی باتوں نے فصیح الدین بلخی مرحوم کو متاثر کیا جس کو اپنانے کے نتیجے میں وہ اعلیٰ پایہ کے محقق ثابت ہوئے۔ فصیح الدین بلخی پر غور کیجئے تو ان کا دخل شاعری میں بھی تھا اور نثر نگاری میں بھی۔ لیکن خدمتِ ادب کے معاملے میں انھوں نے اپنا زیادہ وقت نثر نگاری کو دیا۔ موصوف نے تحقیق کے علاوہ تاریخ نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔

بلخی صاحب مرحوم جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کو بزرگانِ دین پر ناز ہی نہیں بلکہ اس خاندان کے بزرگانِ ماہرین علوم شروع ہی سے رہے ہیں۔ ان بزرگوں میں مولانا شمس الدین بلخی، مولانا معزالدین بلخی، مولانا مظفر بلخی، مولانا حسین نوشہ توحید بلخی اور مولانا احمد لنگر دریا بلخی جیسے صوفیائے کرام اور صاحبان قلم گذرے ہیں۔ جس عہد سے فصیح الدین بلخی مرحوم تعلق رکھتے تھے اس عہد کے صوبہ بہار اور عظیم آباد میں صرف اِنے گِنے ادنیٰ درجہ کے شعرا و ادبا رموجود نہ تھے بلکہ ایسے بھی اہل قلم موجود تھے جو علم و ادب کے معاملے میں ہندوستان گیر حیثیت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی، فضل حق آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عظیم الدین عظیم آبادی، عرش گیاوی، امداد امام اثر، انجم مانپوری، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی اور حمید عظیم آبادی جیسے اہل قلم کا نام آج ہند و پاک میں محتاج تعارف نہیں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کے عہد کا صوبہ بہار اس اعتبار سے خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ بیرون بہار کے حضرات صوبہ بہار اور عظیم آباد کو آنکھ لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ دلّی یا لکھنؤ کا فن کار اپنی خود پرستی (egoism) کا شکار تھا۔ صرف اس عہد کے ادبا یا شعرا جانتے تھے کہ عظیم آباد کے فراخ دل ادب نوازان کو مدعو کریں وہ اپنا رنگ جمانے کے لئے صوبہ بہار میں اپنا قدم رکھیں۔ یہاں کے بھی فنکار کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیں لیکن خدمتِ علم و ادب میں صوبہ بہار خصوصی طور پر عظیم آباد کی خصوصیت کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ اپنے برتاؤ کے باوجود خدمتِ علم و ادب کے معاملے میں صوبہ بہار نے تنگ نظری سے کام نہیں لیا اگر ایسا ہوتا تو عبدالغفور شہباز نظیر اکبر آبادی پر اپنی

جستجو و تحقیق سے گریز کرتے آگے بڑھئے تو آپ پائیں گے کہ دلی اسکول کا مایۂ ناز شاعر مومن دہلوی جو ۱۸۵۲ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوتا ہے جس نے اپنے شاگردوں کی ایک لمبی چوڑی قطار چھوڑی۔ کسی کو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ حق شاگردی کو مدنظر رکھتے ہوئے مومن کی سوانح حیات قلمبند کرتے۔ چنانچہ اس اہم ترین کام کے سلسلے میں اگر کسی کی نظر پڑتی ہے تو کسی بہاری کی، چنانچہ عرش گیاوی نے بڑی کاوش اور محنت سے "حیات مومن" لکھ چھوڑی۔

خیال عظیم آبادی ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۲ء، سید کاظم حسین نزار ۱۸۹۶ء سے ۱۹۶۳ء تک، سریہ کابری ۱۳۰۹ھ سے ۱۹۶۳ء تک، سید سلیمان ندوی ۱۸۸۴ء سے ۱۹۵۳ء تک، شاد عظیم آبادی ۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۷ء تک، امداد امام اثر ۱۸۴۱ء سے ۱۹۳۴ء تک، اختر بہاری ۱۲۷۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک، فضل حق آزاد ۱۹۴۲ء میں وفات، انجم مانپوری ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۷۸ھ تک، باقر عظیم آبادی ۱۹۲۷ء میں وفات، سہیل عظیم آبادی ۱۹۰۹ء یکم نومبر سے ۱۹۷۹ء تک، سید نظام الدین بلخی ۱۸۸۲ء سے ۱۹۶۶ء تک، لاڈلے صاحب بیتاب عظیم آبادی ۱۹۲۸ء میں وفات، ثمر آروی ۱۹۳۹ء میں وفات، حمید عظیم آبادی ۱۸۹۶ء سے ۱۹۶۳ء تک، جمیل مظہری ۱۹۰۵ء سے ۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء تک، محمود علی خاں صبا عظیم آبادی ۱۹۰۷ء سے ۱۹۸۷ء، ضیا عظیم آبادی ۱۲۹۹ھ سے ۱۳۱۹ھ، عطا کاکوی ۱۳۲۲ھ بقید حیات، ڈاکٹر عظیم الدین احمد ۱۸۸۰ء سے ۱۹۴۹ء تک، سید صدر الدین فضا ۱۹۱۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء، قتیل دانا پوری ۱۳۱۱ھ سے ۱۹۸۵ء، نواب محمد تقی جان قمر گیاوی ۱۸۹۷ء سے ۱۹۷۶ء تک، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی ۱۸۷۹ء سے ۱۹۵۶ء تک، پروفیسر مسلم عظیم آبادی ۱۳۰۵ھ سے ۵ فروری ۱۹۷۷ء تک، مناظر گیلانی ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۷۵ھ تک، ولی سنڈوی ۱۲۹۶ھ سے ۱۳۵۰ھ تک، ولی کاکوی ۱۹۶۳ء سن وفات، یاس بہاری ۱۲۹۰ھ سے ۱۹۶۰ء سن وفات، یاس یگانہ چنگیزی ۱۸۸۳ء سے ۱۹۵۶ء تک۔

ان جتنے عظیم آباد کے فنکاروں کا تعلق ہے ان میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جن سے فصیح الدین بلخی مرحوم کے گہرے تعلقات رہے تھے، نزار عظیم آبادی مرحوم، سریہ کابری، شمس منیری، انجم مانپوری، سہیل عظیم آبادی بسمل سنہاروی، عبدالمنان بیدل، ثمر آروی، جمیل مظہری، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، قمر گیاوی، پروفیسر

مسلم عظیم آبادی، یاس بہاری اور یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ۔

فصیح الدین بلخی مرحوم اپنے گھر والوں سے ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور ان کے اشعار سنایا کرتے تھے، یاس یگانہ چنگیزی نے عظیم آباد سے ترک وطن کر کے لکھنؤ کی راہ لی اور وہیں ان کی وفات ہوئی لیکن جب تک پٹنہ میں ان کا قیام رہا وہ برابر بخشی محلہ تشریف لاتے تھے، پروفیسر مسلم عظیم آبادی مرحوم نے ترک وطن کر کے پاکستان کی راہ لی لیکن جب تک وہ اپنے وطن میں رہے ہزاری باغ سے پٹنہ آتے تھے تو بلخی صاحب مرحوم سے ضرور ملتے تھے، قمر گیاوی مرحوم سے اس قدر تعلقات تھے کہ وہ خاص کر سہسرام سے ملنے کی غرض سے ان کے یہاں تشریف لاتے تھے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم اور صدر الدین فضا مرحوم سے قربت ہونے کی خاص وجہ یہ ہوگئی تھی کہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں بلخی صاحب مرحوم پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات کے انچارج رہے اور لگ بھگ روزانہ ان حضرات سے ملاقات ہوجاتی، ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم سے ان کے تعلقات کا حال یہ تھا کہ ایک جان دو قالب، ضیاء عظیم آبادی مرحوم ان کے منجھلے بھائی مولوی عزیز الدین بلخی کے گہرے دوستوں میں تھے اور ضیاء مرحوم روزانہ بخشی محلہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم ضیاء کی شاعری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ضیاء کی شخصیت اور فن پر ایک گرانقدر مقالہ سپرد قلم کیا جو رسالہ تہذیب پٹنہ سے شائع ہوا۔ محمود علی خاں صبا بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت سے فیضیاب ہونے کے لئے برابر ان کے گھر پر ملا کرتے تھے۔ قربت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد شعبۂ مخطوطات کو ان کے حوالہ کیا گیا۔ علامہ جمیل مظہری سے ان کے تعلقات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جمیل صاحب ان کے بھتیجے رفیع الدین بلخی کے گہرے دوستوں میں تھے اور ان کی عالمانہ شخصیت کے معترف وہ آج بھی ہیں، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ایک دردانگیز قطعۂ تاریخ لکھا۔

ثمر آروی گورنمنٹ اسکول میں ہڈ مولوی تھے اور بلخی صاحب مرحوم کی سسرال سے متصل محلہ فصاحت کا میدان میں ان کا قیام تھا چنانچہ اکثر غزل سنانے کے لئے اور موضوعات شاعری پر تبادلۂ خیال پر ان سے ملتے تھے۔ بسمل سنہاروی مرحوم اور نواب تقی جان گیاوی سے ان کی دوستی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی وفات سے متاثر ہو کر ان حضرات نے نہایت دردانگیز قطعۂ تاریخ قلمبند کئے۔

بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت صرف صوبہ بہار ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ ہندوستان کا ہر اہل قلم ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے ان کی مشہور کتاب تاریخ مگدھ کو انجمن ترقی اردو دلی سے شائع کرانے کی خواہش ظاہر کی اور تیج بہادر سپرو کا خط دلی سے آیا۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کی کتاب انجمن ترقی اردو دلی سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی اور اس کی نشاندہی سہیل عظیم آبادی کے مضمون "بلخی صاحب" سے ہوتی ہے۔ سہیل عظیم آبادی رقم طراز ہیں:

"شاید ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی اُردو دلی نے ان کی کتاب "تاریخ مگدھ" شائع کی۔ ان دنوں میں انجمن ترقی اردو دلی سے منسلک تھا۔ بابائے اردو کی خدمت میں اکثر باریابی کا موقع ملتا تھا۔ بابائے اردو نے اس کتاب کی تعریف کی۔"

بلخی صاحب مرحوم ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی شخصیت سے حد درجہ متاثر تھے شاید اس لئے کہ تحقیق و جستجو تواریخ نگاری سے انھیں بھی ذاتی لگاؤ تھا اور یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے بلخی صاحب مرحوم صوبہ بہار کے مشہور مورخ پروفیسر عسکری سے حد درجہ قریب تھے۔

میں نے سطور بالا میں اس امر کی طرف نشاندہی کی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت صرف صوبہ بہار تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ملک کے دوسرے اہل قلم ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ رام بابو سکسینہ بلخی صاحب کی مشہور و معروف تصنیف "تذکرۂ نسوانِ ہند" سے متعلق اپنے گرانقدر رائے کا اظہار خطوط میں یوں کرتے ہیں، یہ خط انگریزی زبان میں ہے۔

Ram Babu Saksena
Dhill Hen Canse
Member Sahitya Academy

c/o K. Kishore I.A.S
Joint Secretary U.P Govt.
Finance Department
Council House
Lucknow
21-11-1956

My dear Balkhi Saheb

Mr. Naim private secretary to Dr. Syed Mohammad has very kindly mentioned your name to me and has written to you.

It was a great pleasure to know that you have written a Tazkera of women after a considerable research and that you are devoting your life to a pursuit of literature - a noble end.

I shall be obliged if you will kindly let me have all information you posses or can collect of Urdu and Persian poets of Bihar who also wrote in Hindi.

I shall also need all information about the Medivial Urdu Literature in Bihar.

I enclose a paper which you may kindly see and return. I shall also send you a paper from Lucknow.

Needless to say that I will do all what I can in furtherance of your scholarship.

Looking forward to the pleasure of receiving reply.

With all good wishes and thanks

yours sincerely
Ram Babu Saksena

ملک کے مشہور و معروف محقق مالک رام سے بھی بلخی صاحب مرحوم کی خط و کتابت ہوتی تھی، مالک رام بلخی صاحب کو یوں لکھتے ہیں۔

12/5 WEA
Kearal Bagh
نئی دہلی ۱۸-۹-۱۹۵۸ء

کرم نامہ ملا۔ عزیزی قبلہ قاضی عبدالودود صاحب نے اطلاع دی ہے کہ سید فخرالدین حسین سخن کی تصویر آپ نے انہیں دی تھی لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ تصویر آپ کو کہاں سے ملی تھی، انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ سے رجوع کر کے دریافت کریں۔ اس لئے کرم فرما کر اس تصویر کے ماخذ کا پتہ دیں، اس کا نام اور سخن سے کیا رشتہ تھا۔

والسلام
خاکسار مالک رام

بلخی صاحب کے اکثر مقالات ملک کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئے چنانچہ موصوف کا ایک مقالہ رسالہ نگار لکھنؤ میں بھی شائع ہوا، اس ضمن میں ان کی اکثر خط و کتابت علامہ نیاز فتح پوری سے بھی ہوتی تھی۔ نیاز فتحپوری اپنے ایک مراسلہ میں بلخی صاحب کو یوں لکھتے ہیں:

دفتر نگار لکھنؤ

اپریل ۵۳ء

محترمی تسلیم

مقالہ مل گیا، شکریہ۔

والسلام

نیاز

حکومت پنجاب کی ایما سے پنجاب یونیورسٹی نے جو انسائیکلوپیڈیا ترتیب دی ہے اس میں ملا غلام یحییٰ بہاری اور نواب ابراہیم علی خاں کے حالات یونیورسٹی نے موصوف ہی سے لکھوائے، اس کا تفصیلی جائزہ آئندہ کے ابواب میں لیا جائے جائیگا۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ بلخی صاحب مرحوم کا عہد عظیم آباد کا ایک ایسا عہد تھا جب کہ علم و ادب کا آج کے اس اجڑے دیار میں طوطی بولتا تھا، شاعری کا چرچہ اور ذوق زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بلخی صاحب نے جب اپنا قدم رکھا تو ایک شاعر کی حیثیت سے، لیکن انہوں نے اپنی ذات کو صرف اس دائرے تک محدود نہیں رکھا اس لئے کہ فطرت نے ان کو وسیع النظری بخشی تھی اور حالات نے ایسے مواقع فراہم کئے کہ ہندوستان کے چپے چپے گھومنے کے مواقع نصیب ہوئے بلکہ بیرونی ممالک کے اسفار بھی نصیب ہوئے اور ساتھ ساتھ ایسا ماحول بھی ملتا گیا جو ان کی قلم کاری کو وسعت دیتا گیا یعنی بلخی صاحب صرف ایک شاعر ہی ہو کر نہ رہ گئے، بلخی صاحب مرحوم نے شاعری تو ترک کر دی تھی جو کلام کا ذخیرہ بیاض کی شکل میں تھا چوری ہو گیا اور جو محفوظ رہ سکا وہ یادداشت کا نتیجہ ہے۔ بلخی صاحب کی شخصیت نے نمایاں شہرت جو حاصل کی ہے وہ دو وجہوں سے۔ ان کی ایک حیثیت محقق کی ہے اور دوسری حیثیت مورخ کی ہے۔ شاعری سے نثر نگاری کی طرف راغب ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ملازمت کے سلسلہ میں انہیں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا ماحول بھی نصیب ہوا، کلکتہ میں کئی بار انہیں لمبی لمبی مدت تک رہنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ ماسوا اس کے فورٹ ولیم کالج کے ماحول نے جو اردو نثر نگاری کا دور اولیں کہا جا سکتا ہے، انہیں نثر نگاری کی طرف راغب کیا اور

آگے چل کر کچھ ایسی شخصیتوں سے انہیں متاثر ہونے کا موقع ملا۔ ان کی شخصیت ایک مورخ کی حیثیت سے پروان چڑھی۔ ہندوستان کے مشہور مورخ "سر جادو ناتھ" سے بھی انہیں ملنے کا موقع ملا۔ دور رہنے پر خط وکتابت کی صورتیں گاہے گاہے رہیں۔ ماسوا دوسرے بقید حیات مورخ ڈاکٹر کے کے دتا، تاریخ کے پروفیسر پرنسپل پٹنہ کالج، سابق وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی اور مگدھ یونیورسٹی سے حد درجہ قربت رہی جس کی نوعیت خالص دوستانہ تھی اس کا اندازہ ڈاکٹر کے کے۔ دتا کے ان تاثرات سے ہوتا ہے جو انہوں نے بلخی صاحب کی وفات کے بعد انگریزی زبان میں قلمبند کئے اور پروفیسر عسکری جن کی ذات تاریخ دانی کے لئے شروع ہی سے واقف تھی، وہ تو ہر حال میں ان کے گہرے دوستوں میں تھے، یہی وجہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت کو بحیثیت مورخ نکھرنے اور پروان چڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، ان کی عالمانہ بصیرت، تاریخ دانی، باریک بیں نگاہ کو صحبتوں سے مزید فائدہ پہنچا۔

تحقیق نگاری اور تنقید نگاری کی طرف جو بلخی صاحب مرحوم رجوع ہوئے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ عظیم آباد ادبی معرکہ آرائیوں میں ہمیشہ کسی بھی دبستان سے پیچھے نہیں رہا۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنی آنکھوں سے شاد اور اپنچ کے جھگڑے دیکھے، شعرا کی ایسی چشمکیں دیکھیں۔

مؤلف مسلم شعرائے بہار جلد دوم میں شاد اور ان کے مخالفین نیز شاد اور اپنچ کے جھگڑے کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"اخبار اپنچ کے صفحات اس علمی و ادبی جنگ کے مصاف (میدان جنگ) بنے ہوئے تھے۔ حالت یہ تھی کہ علامہ نے کسی مشاعرے میں، جو پٹنہ میں برابر ہوتے رہتے تھے کوئی اپنی غزل سنائی، اس ہفتہ کے اپنچ کی اشاعت میں وہ غزل تنقید کے ساتھ چھپ جاتی، شاد کا یہ شعر ہے ؎

زمانہ بھر کی ہے ان کھڑکیوں سے آمد و رفت
ادب سے دور ہے آنکھوں میں ان کو جا دینا

آپ ہی نے دو مصرعہ میں یہ اصلاح دی ؎

حیا پہ ظلم ہے آنکھوں میں ان کو جا دینا

شاد کا شعر ؎

اسی بہانہ سے دل یار کو دکھا دینا
یہ کیسی چیز پڑی ہے ذری اٹھا دینا

اصلاح آپ ہی ؎

یہ کون چیز پڑی ہے ذری اُٹھا دینا

خواجہ فخرالدین سخنؔ اور علامہ سید علی محمد شادؔ کی شاگردیٔ صفیرؔ سے انکار تھا۔ نواب[1] سید تجمل حسین المعروف بہ سلطان عظیم آبادی نے "تلامذہ صفیر" کا ایک تذکرہ یہاں تک کہ جس عہد سے بلخی صاحب مرحوم تعلق رکھتے ہیں اس عہد میں شادؔ اسکول کے پرستاروں اور داغؔ اسکول کے ہمنواؤں میں سخت ادبی معرکے ہوتے رہتے تھے اور شاعری کے معاملہ میں ہر گروہ ایک دوسرے کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش میں ہوتا اگر کسی سے لغزش ہوگئی تو اعتراض کی بوچھاریں شروع ہو جایا کرتی تھیں۔ بخشی محلہ کے ادبی معرکے میں بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت اپنی ذہانت اور علمیت کے سبب نمایاں تھی۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ محلہ لودی کٹرہ میں منعقد ہونے والے مشاعرہ میں سرِ مشاعرہ حمید عظیم آبادی مرحوم نے ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کے اس شعر پر اعتراض کیا ؎

گذاری ہیں عمریں انہیں ہمدموں میں
یہ گہرے مراسم ہیں رنج و محن سے

حمید صاحب مرحوم کا یہ اعتراض تھا کہ اس شعر میں انہیں کی "ہ" "تقطیع کرنے میں گرتی ہے" مبارک صاحب دوڑے ہوئے ان کے (بلخی صاحب) کے پاس آئے اور ماجرا سنایا۔

---

[1] عصر تیغ فیض شائع کیا تو صفیر کے شاگردوں کے سلسلے میں مختلف شواہد کی روشنی میں سخنؔ اور شادؔ کا بھی ذکر کیا۔ کیونکہ ان دونوں حضرات کو صفیرؔ بلگرامی کی شاگردی سے انحراف تھا' سلطان عظیم آبادی

نے اپنی تالیف مرقع فیض میں علامہ شاد کے ان چند خطوط کی نقلیں بھی چھاپ دی ہیں جو صفیر کے مسکن آرہ، شاہ آباد کے پتہ پر مختلف وقتوں میں لکھا تھا۔

قطع اول کا اقتباس لہ بلبل شاخسار حدیقۂ جادو بیانی جناب استادی میر فرزند احمد صاحب مدظلہٗ العالی الی احقر کمترین علی محمد عفی عنہ۔

جناب وصی احمد بلگرامی نے رسالہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں ایک اہم و قیع مضمون س۔ش۔ ص لکھا اور یہ مضمون آج بھی ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مضمون میں جناب وصی احمد نے مختلف شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ خواجہ فخر الدین سخن اور شاد عظیم آبادی بہر صورت صفیر کے شاگرد تھے)

بلخی صاحب مرحوم نے قلم برداشتہ ایک تحریر لکھی جس میں حمید صاحب کے عروضی اعتراض کو مہمل قرار دیا اور اس ضمن میں اساتذہ کے کئی اشعار پیش کئے۔ یہ معاملہ وقتی طور پر دب گیا لیکن بلخی صاحب اس قدر برہم ہوئے کہ اس کے نتیجہ میں ان کا کتابچہ "انشاد شاد" وجود پذیر ہوا۔ اس کے جواب میں حمید صاحب مرحوم نے ایک عرصہ کے بعد "کھلا چیلنج" لکھا جو حقیقتاً "انشاد شاد" کا جواب نہیں بلکہ اس میں ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کو نقاب پوش اور بلخی صاحب مرحوم کو "گوبر کا کیڑا" کہا گیا۔ جو اعتراضات بلخی صاحب مرحوم کے تھے ان کے جوابات کو الفاظ کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ معاصرانہ چشمک ایک عرصہ دراز تک قائم رہی یعنی جب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی مرحوم کا مجموعۂ کلام "جلوۂ داغ" ڈاکٹر سید محمود کے توسط سے شائع ہوا تو اس کا مقدمہ بھی بلخی صاحب مرحوم نے سپرد قلم کیا۔ یہ دبی ہوئی چنگاری ایک بار پھر آگ کی شکل میں نمودار ہوئی اور عطا کاکوی نے "جلوۂ داغ" پر اعتراضات کئے اور سخت نکتہ چینی بھی کی۔ دراصل اس فتنہ کے بانی حمید صاحب مرحوم تھے۔ مبارک صاحب مرحوم عطا کاکوی کے اعتراضات پر گھبرائے اور دوڑے ہوئے بلخی صاحب مرحوم کے پاس آئے۔ بلخی صاحب مرحوم نے فوراً قلم برداشتہ عطا کاکوی کے جواب میں ایک مقالہ

لہ تذکرہ مسلم شعرا بہار جلد دوم مصنفہ حکیم سید احمد ندوی

لکھا۔ اس ضمن میں بلخی صاحب مرحوم کا یہ خیال تھا کہ یہ مقالہ کسی کہنہ مشق شاعر کے نام سے شائع ہو۔
اس زمانہ میں یاس بہاری مرحوم بہار شریف سے پٹنہ بلخی صاحب مرحوم سے ملنے آتے تھے، چنانچہ
"ہم سخن فہم ہیں" کے عنوان سے ایک مقالہ رسالہ "اشارہ" پٹنہ میں شائع ہوا جس میں عطا کاکوی کے
اعتراضات کا جواب دیا گیا۔ یہ مقالہ بلخی صاحب مرحوم کا خود نوشتہ تھا اور مدیر اشارہ جناب قیوم خضر
کے حوالے اشاعت کے لئے دیا گیا۔ قیوم خضر صاحب اس کے شاہد ہیں کہ یہ مقالہ بلخی صاحب مرحوم
کا نوشتہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا مخطوطہ قیم خضر صاحب کے پاس محفوظ ہو۔

بلخی صاحب مرحوم اپنی بزم کے روح رواں تھے۔ خصوصی طور پر بخشی محلہ کی ادبی سرگرمیوں
میں وہ خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواجہ فخرالدین سخن دہلوی کا ایک دیوان ان کے
گھر سے چوری ہو گیا۔ خواجہ فخرالدین سخن کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ حفیظ الدین کے گھر سے دوستوں میں
منشی باقر کے حقیقی بھانجے سید حسن سید عظیم آبادی تھے۔ انہوں نے اس دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھایا
چنانچہ سخن دہلوی کا کلام سید صاحب نے مشاعرے میں پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار بخشی محلہ کی
محفل مشاعرہ میں سید صاحب نے خواجہ صاحب کی ایک غزل کے چند اشعار اپنے نام سے پڑھے۔
بلخی صاحب مرحوم کی ذہانت مشہور تھی۔ انہوں نے اس غزل کے دیگر اشعار برسر مشاعرہ سنائے اس پر
سید صاحب بہت ہی برہم ہوئے اور اٹھ کر محفل سے چلے گئے لیکن سید صاحب اپنی اس حرکت
سے باز نہ آئے۔ چنانچہ بلخی صاحب نے اُس دیوان کا ایک مرثیہ گلدستہ کی شکل میں شائع کرا کر تقسیم کیا۔

مرثیہ کا ایک شعر آج بھی پٹنہ کے لوگوں کو یاد ہے ؎

دیوان گمشدہ پہ میں پڑھ لوں گا فاتحہ
آپ اپنی شاعری کا جنازہ اٹھائیے

بلخی صاحب مرحوم نے تحقیق نگاری کی طرف جو رجوع کیا اس کی بھی ایک خاص وجہ معلوم ہوتی
ہے کہ وہ ادب میں تحقیق و جستجو کو نہایت ہی مقدم تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے شاید وہ نواب امداد
امام اثر مرحوم اور ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سے حد درجہ متاثر تھے۔ اثر مرحوم کی کتاب "کاشف الحقائق" کے
بڑے مداح تھے۔ اثر مرحوم کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے اپنی دفات

سے چند ماہ پیشتر ایک تقریر بھی آخر کی سوانح حیات اور کارناموں سے متعلق نشر کی۔ ڈاکٹر عبدالحق کو ایک ایماندار مبصر اور ذی علم محقق گردانتے تھے یہی وجہ ہے کہ تاریخ مگدھ کو انجمن ترقی اردو سے شائع ہونے کا سوال اٹھا تو کتاب کے مسودے کو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے حوالہ انہوں نے کر دیا۔

انشاد شاد اور کھلا چیلنج

مذکورہ بالا سطور میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم عظیم آباد کے ہر ادبی معرکہ آرائیوں سے خاص لگاؤ تھا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ بلخی صاحب مرحوم داغ اسکول کے پرستار بھی تھے اور خود ان کے سنجھلے بھائی مولوی نظام الدین بلخی مرحوم داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ بقول نظام الدین بلخی مرحوم ؎

جناب داغ کا یہ فیض کم نہیں بلخی
سخن زباں کے لئے ہر زباں سخن کے لئے

چنانچہ اس دور کے عظیم آباد میں شاد اسکول اور داغ اسکول کے پرستاروں میں ہمیشہ معاصرانہ چشمک رہی۔ کوئی بھی گروپ اس تاک میں لگا رہتا تھا کہ اس کے مخالف گروپ سے کوئی لغزش ہو تو وہ اپنی گرفت میں لے لے' اس کی ایک اہم وجہ تھی کہ داغ کی شاعری کے اثرات کو عظیم آباد نے کافی حد تک قبول کیا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، بہرحال ان دو گروپوں کی معرکہ آرائی ایک عرصہ دراز تک قائم رہی۔ حمید عظیم آبادی نے ابتدا میں اپنے کلام پر مبارک صاحب سے اصلاح لی لیکن بعد میں وہ شاد کے شاگرد ہوئے چنانچہ وہ بہت جلد مبارک صاحب کے مخالفوں میں ہو گئے۔ انہوں نے بر سر مشاعرہ مبارک صاحب کے اس شعر پر اعتراض کیا' شعر یہ تھا ؎

گذاری ہیں عمریں انہیں ہمدموں میں
یہ گہرے مراسم ہیں رنج و محن سے

حمید صاحب کا اس شعر کے مصرع اول میں یہ اعتراض تھا کہ شعر کی تقطیع کرنے سے لفظ "انہیں"

کی "ہ" گرتی ہے لیکن بلخی صاحب نے حمید صاحب کے اس اعتراض کو مہمل قرار دیا چنانچہ یہ معاملہ وقتی طور پر دب گیا لیکن ادبی تنازع ایک عرصۂ دراز تک قائم رہا۔ آخر کار بلخی صاحب مرحوم نے شاد کے نقائص کلام کو ایک کتابچہ کی شکل میں " انشاد شاد" کے عنوان سے سپردِ قلم کیا حمید صاحب نے بھی "انشاد شاد" کے جواب میں ایک رسالہ کھلا چیلنج "کے عنوان سے لکھا۔

باب سوئم

سوانح حیات، خاندان، نسب نامہ پدری و مادری، پیدائش، تعلیم و تربیت، شادی اولاد، ملازمت، عام مشاغل، احباب، اسفار، اوصاف، کمالات، وفات۔

خاندان

فصیح الدین بلخی مرحوم کی سوانح حیات کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ خاندان بلخیہ کا مختصر طور پر جائزہ لیا جائے۔

یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کوئی فرد بھی اپنے خاندانی روایات کو برقرار رکھے لیکن خاندان بلخیہ کے افراد کو اس ضمن میں یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے خاندانی روایات کو برقرار رکھا، یعنی اس خاندان کے افراد لگ بھگ سات سو برسوں سے صوبہ بہار میں علم و ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

لفظ بلخی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی شاہ بلخ کی نسبت سے بلخی کہلاتے ہیں جن کا شمار صوبہ کے اعلیٰ طبقے میں ہوتا ہے۔ صوبہ بہار ملک ہندوستان میں اس خاندان کے پہلے شخص حضرت مولانا شمس الدین بلخی محمد تغلق کے عہد میں دہلی میں وارد ہوئے جو شاہی دربار میں ایک اعلیٰ منصب رکھتے تھے جو بعدہٗ اعلیٰ منصب سے الگ ہو کر بہار شریف چلے آئے اور حضرت مخدوم احمد چرم پوش کے مرید ہوئے۔

بلخی خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی کا شمار ایک اعلیٰ پایہ کے صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جن کا ذکر متعدد تذکروں اور تاریخوں میں آیا ہے لہٰذا حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی کا مختصر تعارف سطور ذیل میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی غیر مطبوعہ کتاب آثار بلخیہ کے حوالہ سے کیا جاتا ہے۔

صوبہ بہار میں مناقب الاصفیا مؤلفہ حضرت مخدوم شعیب کے بعد جن فارسی اور اردو کے تذکروں میں بلخیوں کا ذکر موجود ہے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) وسیلۂ شرف مؤلفہ سید شاہ فرزند علی صوفی منیری تلمیذ غالب۔	(اُردو)
(۲) آثار شرف مؤلفہ خان بہادر قاضی نورالحسن شیر گھاٹی	(فارسی)
(۳) سیرۃ الشرف مؤلفہ خان بہادر سید ضمیر الدین احمد عظیم آبادی	(اُردو)
(۴) کنز الانساب مؤلفہ مولوی کریم الدین احمد	(فارسی)
(۵) تاریخ سلسلۂ فردوسیہ مؤلفہ پروفیسر معین الدین دردائی	(اُردو)

حضرت ابراہیم ادہم بلخی

آپ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ آپ صوفیوں کے طبقات اولیٰ میں گذرے ہیں آپ کا ذکر تاریخوں اور تذکروں میں پایا جاتا ہے ۔ نفحات الانس مصنفہ ملا عبدالرحمٰن جامی اپنی تصنیف میں حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں :

"حضرت ابراہیم بن ادہم قدس سرہٗ طبقۂ اولین سے ہیں ۔ ان کی کنیت ابو اسحاق ہے اور ان کا نسب ابراہیم بن ادہم بن سلیمان بن المنصور بلخی ہے یہ بادشاہ زادہ تھے اور جوانی ہی میں توبہ کی ۔ ایک وقت شکار کرنے کو باہر گئے ہوئے تھے فرشتۂ غیب نے ادلذی ابراہیم تو اس کام کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے ان کو تنبیہہ ہو گئی اور راہِ طریقت کو بخوبی اختیار کر لیا ۔"

نوٹ : خاندان بلخیہ کے حالات کے ضمن میں مندرجہ ذیل تصنیفات سے استفادہ کیا گیا ہے :

(۱) "آغاز سحر" مجموعہ کلام جناب نادم بلخی

(۲) وسیلہ شرف و ذریعہ دولت مصنفہ صوفی منیری تلمیذ غالب دہلوی

(۳) تاریخ سلسلۂ فردوسیہ مصنفہ پروفیسر معین الدین دردائی

(۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار مصنفہ مولوی سید احمد اللہ ندوی جلد اول تا ششم

(۵) آثار بلخیہ مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم مخطوطہ ۔

(۶) مخدوم احمد لنگر دریا بلخی حیات اور ان کی شاعری تحقیقی مقالہ مصنفہ ڈاکٹر حسن امام مخزونہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری

(۷) رسالہ تحفہ بہار بابت فروری ۱۸۹۷ء مدیر حفیظ الدین بلخی

(۸) اپنی تلاش میں مصنفہ کلیم الدین احمد

(۹) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء مصنفہ ڈاکٹر اختر اورینوی ۔

توکّل اور ایثار کی کیفیت

حضرت ابراہیم بلخی کے ہم عصر صوفیوں میں حضرت شفیق بلخی مشہور و معروف اہل معرفت میں سے گذرے ہیں، دونوں بزرگ خراسان میں تھے۔ ایک دن حضرت ابراہیم ادہم بلخی نے دریافت کیا کہ رزق کے متعلق تمہارا کیا معمول ہے؟ انہوں نے جواب دیا اگر کچھ میسّر آتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور نہ ملتا ہے تو صبر کرتا ہوں۔

حضرت ابراہیم ادہم نے فرمایا کہ خراسان کا ہر ایک کتا یہی کرتا ہے۔ حضرت شفیق بلخی نے پوچھا کہ پھر تمہارا کیا معمول ہے۔ حضرت ابراہیم ادہم بلخی نے جواب دیا کہ اگر کچھ نہیں ملتا ہے تو خدا کا شکر کرتا ہوں اور اگر کچھ مل جاتا ہے تو دوسروں پر ایثار کرتا ہوں (نفحات الانس) میں حضرت شفیق بلخی کے تذکرہ میں پایا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم ادہم بلخی سے متعلق مختلف روایتیں ہیں انگریزی کتاب Mystics and saints of Islam میں آپ کا تذکرہ ہے۔ غالب دہلوی نے بھی اپنی فارسی نظم میں آپ کا ذکر کیا ہے ؎

ہر کجا رشتۂ شوق تو جراحت بارد
جز فراش بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد
فیض تو ہر جا گل و برگ افشاند
جز نسیم بہ پرسش گہ مرہم نرسد

اس کے علاوہ بہتیرے افسانوں اور مثنویوں میں آپ کا ذکر پایا جاتا ہے۔

بلخیوں کا ہندوستان اور صوبہ بہار میں آنا

یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ابراہیم ادہم کی اولاد ہندوستان میں کب آئی۔ بلخ کے ذی علم اور ذی اثر لوگ ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان وارد ہوئے۔ تذکروں میں پایا جاتا ہے کہ سلطان

فیروز تغلق کے عہد میں مولانا شمس الدین بلخی بدر مولانا مظفر بلخی دیوان شاہی میں کوئی عہدہ رکھتے تھے۔

مولانا شمس الدین بلخی بن علی بلخی

حضرت ابراہیم ادہم بلخی کے بعد مولانا شمس الدین بلخی تک کئی نسلیں گذری ہیں لیکن ان حضرات کے سوا کوئی حال کسی تذکرہ میں نہیں پایا جاتا، حضرت مخدوم شعیب جو حضرت مخدوم شرف الدین احمد منیری کے خالہ زاد بھائی اور حضرت مخدوم حسین بلخی کے مرید تھے اپنی کتاب "مناقب الاصفیا" میں لکھتے ہیں:

"سننے میں آیا ہے کہ حضرت شمس الدین بلخی دہلی میں شاہی عہدہ رکھتے تھے ایک دن دیوان خانہ میں کسی نے دوسرے کو ایک کے اشارے سے کوئی بات کہی۔ شیخ شمس الدین کی اس پر نظر پڑ گئی اور ان کو خیال ہوا کہ یہ منافقت کی علامت ہے اس صحبت میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ عہدے کو ترک کر کے دہلی سے روانہ ہوئے اور جب بہار کے قریب پہنچے تو شیخ احمد چرم پوش رحمۃ نے آپ کے آنے کی اطلاع پاکر اپنے دوستوں سے فرمایا کہ دوست آتا ہے اور آپ نے اجازت کو ساتھ لے کر اپنا اشغال کیا۔ ملاقات کے بعد شیخ شمس الدین مرید ہوئے اور شیخ احمد چرم پوش کی خانقاہ میں رہنے لگے اور اپنی حرم کو لکھ کر بھیجا کہ میں نے دنیا کو ترک کیا۔ اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہو تو مال و اسباب کو لڑکوں کے حوالہ کر کے یہاں چلی آؤ۔ آپ کی حرم نے شیخ مظفر اور شیخ معز الدین ہر دو فرزند کو کہا کہ اسباب اور املاک کو تم لوگ رکھ لو میں تمہارے والد کا ساتھ دوں گی۔ شیخ مظفر اور شیخ معز الدین نے فرمایا کہ باپ کا ساتھ دینا اول ہم لوگوں پر فرض ہے ہم لوگ بھی اس کی موافقت کریں گے گھر کو ویران کر کے روانہ ہوئے اور بہار چلے آئے۔"

حضرت مولانا شمس الدین بلخی کے تین بیٹے تھے، مولانا مظفر بلخی، مولانا معز الدین بلخی اور مولانا قمر الدین بلخی۔ جس وقت مولانا شمس الدین بلخی دہلی سے بہار آئے غالباً مولانا قمر الدین بلخی کم سن تھے۔ جیسا کہ حضرت مخدوم شعیب کی تحریر سے پتہ چلتا ہے۔ حضرت شمس الدین بلخی کا وصال بہار شریف میں ہوا، آپ کا مزار

مبارک حضرت مخدوم احمد چرم پوش کے پاس ہے۔

حضرت مولانا مظفر بلخی

آپ کا نام مظفر اور کنیت برہان الدین تھی، پدر بزرگوار کا نام شمس الدین بلخی تھا، آپ حضرت مخدوم الملک کے چہیتے مرید اور خلیفہ تھے۔ مخدوم الملک نے آپ ہی کے بارے میں ایک موقع پر "تن شرف الدین جان مظفر، جان شرف الدین تن مظفر، مظفر شرف الدین شرف الدین مظفر" جیسا محبت سے بھرا ہوا جملہ فرمایا تھا۔

جب شمس الدین بلخی شیخ احمد چرم پوشؒ سے مرید ہو کر بہار میں خدمت کرنے لگے اور ان کے تینوں لڑکے اور اہلیہ بھی دہلی سے بہار چلی آئیں تو دو لڑکے شیخ معز الدین اور شیخ قمر الدین تو شیخ احمد چرم پوش سے مرید ہوئے۔ لیکن شیخ مظفر کی طبیعت حضرت مخدوم الملک کی طرف مائل تھی چنانچہ اپنے والد ماجد کے اشارہ کرنے پر خاموش رہے۔ لیکن شیخ شمس الدین کو معلوم ہوا کہ مولانا مظفر بلخی کی طبیعت کا میلان حضرت مخدوم الملک کی طرف ہے تو انہوں نے بخوشی اس کی اجازت دی اور فرمایا جہاں تمہاری طبیعت چاہے وہیں بیعت کرلو۔ حضرت مولانا مظفر بلخی اپنے والد کی اجازت کے بعد حضرت مخدوم الملک کے مرید ہو گئے۔

ایک دن مولانا مظفر بلخی دہلیز پر ہاتھ اونچا کئے ہوئے کھڑے تھے مخدوم الملک کی ان پر نظر پڑی دیکھا کہ صرف ہڈی کا ڈھانچہ کھڑا ہے، پوست استخواں سے چسپیدہ ہے۔ قاضی زاہد سے مسکرا کر فرمایا زاہد دیکھتے ہو یہ لا یعلم کا کہنے والا سلوک کی منزل کو کتنی تیزی سے طے کر گیا پھر عنایت فاخرہ کے بعد خلیفہ اور مجاز بنا کر خلق اللہ کی خدمت کے لئے عدن روانہ کیا۔ مناقب الاصفیا میں شیخ الاسلام شیخ حسین معز بلخی سے مروی ہے کہ حضرت مخدوم جہاں کے مریدان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان سبھوں میں چالیس حضرات اہل حق کے درجہ پر تھے اور ان چالیس حضرات میں تین بزرگ یعنی حضرت مولانا مظفر بلخی اور دو اہم تھے۔ حضرت مولانا مظفر بلخی کو عشق کی آگ ودیعت ہوئی تھی اور بقیہ کو اس کا دسواں۔

حضرت مولانا مظفر بلخی سے کرامات اور خوارق عادات کا بہت کم اظہار ہوتا تھا اس لئے کہ حضرت مخدوم الملک اسے بہت زیادہ ناپسند کرتے تھے لیکن کبھی کبھی طبیعت سے مجبور ہو کر کرامات کر بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ حضرت مخدوم الملک کے ساتھ کسی مجلس میں بیٹھے تھے۔ شیخ منہاج الدین جنہوں نے کئی حج ادا کئے تھے اس مجلس میں موجود تھے۔ بات فریضہ حج پر چلی۔ شیخ منہاج الدین نے بطور اعتراض آپ کے پیر کی طرف دیکھ کر کہا کہ حج سب مسلمانوں پر فرض ہے۔ آپ کو شیخ منہاج الدین کی باتیں ناگوار گذریں اپنی آستین شیخ منہاج الدین کو دکھائی اور بولے کتنا حج حج کا ذکر کروگے، غلامان شیخ شرف الدین کی آستین میں دیکھو۔ شیخ منہاج الدین نے جو نظر کی کعبہ مبارک کو آپ کی آستین میں دیکھا متعجب ہوئے لیکن حضرت مخدوم الملک کو بات پسند نہ آئی انہوں نے فرمایا جب تم اپنی کرامات کا اظہار کروگے اتنا ہی کرامات بخشنے والے سے دور ہو جاؤگے۔ پھر فرمایا اگر میں نہ ہوتا تو تمہارا حشر بھی منصور جیسا ہوتا۔

حضرت مولانا مظفر بلخی کی زندگی اپنے مرشد کی طرح حد درجہ درویشانہ اور فقیرانہ تھی آپ نے کبھی دو وقت کا کھانا نہیں کھایا، آپ نماز عشاء کے بعد برابر اپنے مریدوں سے فرماتے اگر تمہیں گرسنگی اور تشنگی برداشت ہو تو رہو ورنہ میرے ساتھ رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

حضرت مولانا مظفر بلخی کے بھائی شیخ معز الدین کی موت کا حادثہ مکہ معظمہ میں ہوا۔ مرنے کے وقت حضرت مولانا مظفر بلخی سرہانے کھڑے تھے اس وقت افسردگی کے ساتھ فرمایا، "معز الدین مناسب تھا کہ پہلے مجھ کو جانے دیتے اس لئے کہ میں تم سے بڑا تھا" ۹ شوال کو معز الدین بلخی کا وصال ہوا اور وہیں مقام حضرت خدیجہؓ اور فضیل ابن عیاض میں مدفون ہوئے۔

آپ عدن میں تھے کہ مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔ اکیس روز کے قریب کچھ نہ کھایا نہ پیا اور نہ کسی سے گفتگو کی۔ حضرت حسین نوشہ توحید آپ کی خدمت میں برابر حاضر رہے۔ جس روز آپ کو سفر آخرت پر جانا تھا آپ نے حضرت نوشہ توحید کو اپنی اور اپنے پیر کی نعمتیں عطا کیں اور بہار کی مسند سجادگی پر اپنا قائم مقام رکھا اس کے بعد یاد الٰہی میں مشغول ہوگئے اور اسی حالت میں رمضان المبارک ۷۸۸ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ تاریخ وفات حضرت صوفی منیری نے اپنی کتاب وسیلۂ شرف

"وذریعۂ دولت" میں لکھا ہے ؎

روح مولانا مظفر کرد چوں نقل مکاں
از عدن در عدن تاریخ ۷۸۸ھ مخدوم زماں

قطعہ

چشمۂ فیض ذات اوست کرد	رفتہ بر سوئے جوئبار شرف
سالِ نقلِ مظفرِ بلخی	جستم دریافتم بہار شرف

۷۸۸ھ

آپ کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد اس قدر تھی کہ پانچ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اس وقت صوبہ بہار میں آپ کے ماننے والے ہزاروں سے زیادہ ہیں، ممتاز خلفا میں مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی، حضرت خواجہ جمال اولیاء، صوفی خواجگی تاج نجیب الدین بدایونی وغیرہ تھے مولانا مظفر بلخی کو اپنی اولاد نہ تھی، اپنے بھتیجے مخدوم حسین پسر مولانا معز الدین بلخی کو اولاد کی طرح تربیت دی تھی۔

حضرت مولانا مظفر بلخی کی تصانیف میں ان کے مکتوبات بہت اہم ہیں، مولانا کے مکتوبات میں حضرت مخدوم الملک کا رنگ جھلکتا ہے۔ دینی قرآن وحدیث کے حوالے فلسفہ، تصوف اور روحانیت پر زور دیا گیا ہے۔ مولانا مظفر بلخی غیاث الدین اعظم شاہ حاکم بنگالہ کو پند ونصیحت برابر یاد کرتے تھے۔

حضرت مولانا مظفر بلخی کا دیوان مطبوعہ ہے، پہلی مرتبہ جناب سید حفیظ الدین بلخی نے مرتب کرکے مطبع حنفیہ بخشی محلہ سے چھپوایا تھا، دوئم ان کا دیوان ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی بہار نے شائع کرایا۔

حضرت مولانا مظفر بلخی کے کلام میں حضرت مخدوم الملک سے عقیدت ومحبت کی جھلک نمایاں ہے۔ ایک غزل میں کھل کر اپنے پیر ومرشد کی منقبت لکھی گئی ہے ؎

آں قدسی کہ نور جمال وجلال داشت	در لاتمام بود در الاکمال داشت
قطب زماں کہ بدر شرف الحق ودیں جہاں	در آسماں بہ جمع ملائک جمال داشت
آں شہسوار گوئے زمیداں صدق برد	چوگان ہمتش بہ فرسگاہ حال داشت

از نار عشق سوختہ بُد پر و بال او | از نور صرف وحدت او پر و بال داشت
او در فنا بہ حد نہایت رسیدہ بود | ملک بقائے ایزد باقی نوال داشت
او بود بے عیال ولیک از علوے قدر | جملہ جہاں ز مشرق و مغرب عیال داشت
بے ذلت و زلال قدم بر صراط بود | عصمت بذات پاک تن لایزال داشت

مولانا روم اور تقریباً سبھی صوفیا کے یہاں انسانی زندگی کی بے کیفی اور زبوں حالی کی سب سے بڑی وجہ عشق کو عقل و خرد پر ترجیح دینا ہے، مولانا مظفر بلخی برہان بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

ہمہ کار ما حرام است جز کار یار بر ما | چوں فرض فرض راہ است ایں کار و بار بر ما
عقل را جز کارسازی بیش نیست | عشق را جز پاکبازی بیش نیست

ہمہ کارہا حرام است جز کار یار بر ما | چوں فرض فرض راہ است ایں کار و بار بر ما
د و بوم عقل ہم چوں عصفور صید گشتم | عشقت چو پنجہ بر زد سیمرغ وار بر ما
"عقل" را جز کارسازی بیش نیست | "عشق" را جز پاکبازی بیش نیست

ایمان نہ ہونے کے بعد انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ تذبذب اور تشکیک انسان کو قعر مذلت میں گرا دیتا ہے۔ ایمان کے لئے سب سے بڑی چیز تذبذب اور تشکیک سے گلو خلاصی ہے۔ حضرت برہان بھی انہی خیالات کو اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں ؎

بماہ عقل می رفتم کہ مارا عشق زخم کرد | شدم من بے خبر مدہوش عقلم تیک ماتم کرد
ہر آں افسوں کہ عقلم خواند اندر گوش من ماندہ | کہ زہر عشق در سر رفت بیخود مست برہم کرد
عمارتہائے دار العقل شادم بود تا اکنوں | کنوں سیلاب عشقش زد تمامی ہم دگر خم کرد
ز دست عقل چوں تن را بچنگ عشق آوردم | ہزاراں پیادہ را در تن کہ اندر پردہ ورہم کرد
ہر آں وعظے کہ عقلم کرد عشق آں جملہ بالاند | صدائے بیہودہ اکنوں زنا دیوانگاں کم کرد

عشق کی منزل اور بندۂ عشق کے مقام کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے انسان کی افضلیت پر زور دیا ہے ؎

ما بہ بالِ عشق بالا می رویم | از زمیں بر چرخ اعلیٰ می رویم
خانہ و بازار و شہر و کوہ و دشت | ہر کجا عشقست آنجا می رویم
با خودی از تیغ لا گردن رویم | بر جمالِ عشق بالا می رویم
جذب حق است عشق در ہم جذب او | ما بہ سوئے حق تعالیٰ می رویم
خود نمی گنجد چہ برہاں در رہش | در رہش از خویش یکتا می رویم

مولانا مظفر بلخی کے نثری کارناموں میں ان کے مکتوبات کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

مکتوبات کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدا بخش خاں پٹنہ میں موجود ہے اس کا اشاریہ نمبر ۲۶۱۹ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴ صفحات پر محیط ہے۔ نہایت ہی بوسیدہ اور کرم خوردہ ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۲۶۴ھ کا ہے، کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ مخطوطہ خط نستعلیق کا بہتر نمونہ ہے، زبان فارسی ہے۔

مولانا مظفر بلخی کی دوسری نثری تصانیف میں شرح العقیدہ ہے اس کا سائز ۱۰×۱۲ ہے، یہ کتاب ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ اس کا اشاریہ نمبر ۳۹۸۸ ہے لگ بھگ ۱۲ صفحات کرم خوردہ ہیں، اس کتاب میں تصوف کے رموز و نکات پر بحث کی گئی ہے۔ جا بجا عربی کے اقوال درج ہیں، اس کتاب کا قلمی نسخہ خدا بخش خاں لائبریری میں موجود ہے۔

حضرت حسین نوشہ توحید بلخی

آپ حضرت معز الدین بلخی کے صاحبزادے اور مولانا مظفر بلخی کے تربیت یافتہ اور خلیفہ تھے۔ آپ حضرت مخدوم الملک کے بعد جانشیں ہوئے۔ حضرت مولانا مظفر بلخی اپنے بھتیجے سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مخدوم الملک نے فرمایا تھا کہ تمہارے بھائی شیخ معز الدین کے یہاں جو لڑکا پیدا ہوا ہے وہ تمہارا فرزند کہلائے گا حضرت حسین بلخی ظفرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔

تذکروں میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت مخدوم جہاں عمامہ اتار کر وضو کر رہے تھے۔ مخدوم حسین کے بچپن کا زمانہ تھا، کھیلتے ہوئے ادھر آئے اور مخدوم جہاں کا عمامہ سر پہ رکھ کر جس طرح

مخدوم کو دیکھا تھا مصلیٰ پر جا کھڑے ہوئے، مولانا مظفر بلخی کی نظر پڑی تو اس طفلانہ گستاخی پر روکنے کی کوشش کی۔ حضرت مخدوم جہاں نے فرمایا یہ بچہ اپنی جگہ کو پہچانتا ہے۔ حضرت مخدوم الملک اس طرح پر فرماتے تھے "میں نے تنور گرم کیا، مظفر نے روٹی پکائی اور حسین کھائیں گے"۔

"مونس القلوب" میں حضرت احمد بن حسن بلخی فرماتے ہیں کہ حضرت حسین نوشہ توحید جیسا جلال، وجمال، ووقار بہت کم مشائخ اور بزرگوں میں دیکھنے میں آیا تھا۔ مکہ معظمہ کے قیام کے زمانے میں آپ نے یہ درود تالیف کیا تھا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ عَدَدَ خَلْقِكَ وَرِضَا نَفْسِكَ وَزِنَةَ عَرْشِكَ وَمِدَادَ كَلِمَاتِكَ اس شب کو مولانا مظفر بلخی اور ان کے علاوہ تیس چالیس درویشوں نے خواب میں دیکھا کہ آپ ؐ فرماتے ہیں کہ میں نے اس درود کو بہت پسند کیا۔

حضرت حسین نہایت ہی خوش رو اور وجیہہ تھے۔ اخلاق ایسا وسیع تھا کہ جو شخص آپ کے پاس آتا آپ بلا قید مذہب وملت اس کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرتے تھے۔ خانقاہ میں تیس چالیس درویش ذکر وعبادت میں مشغول رہتے تھے۔ جب کوئی نیا شخص تعلیم طریقت کے لئے آتا تھا تو آپ اول اس کو قناعت کی تلقین کرتے تھے۔

اگرچہ رشد وہدایت اور درس وتدریس آپ کا محبوب مشغلہ تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ تصنیف وتالیف کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ آپ کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں آپ کی یادگار ہیں:

(۱) حضرات خمس (۲) رسالہ قضا وقدر (۳) رسالہ توحید خاص (۴) رسالہ اخص الخواص (۵) رسالہ ذکر وجود عالم بدایت آں وبیان معرفت عالم ونہایت آں (۶) رسالہ در بیان ہشت چیز ذات، جہت، نفس، صفت، اسماء، افعال، صورت جامعہ، صورت متفرقہ، بر سبیل توضیح وتشریح براصلاح موحداں (۷) اورادِ دہ فصلی (۸) گنج لایخفیٰ (۹) مکتوبات (۱۰) اجازت نامہ بنام مولانا شیخ حسن (۱۱) دیوان فارسی۔

(۱) حضرات خمس، چند صفحات کا عربی رسالہ ہے اس میں تجلیات باری تعالیٰ کی پانچ صورتیں متعین کر کے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ کتاب عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ علمائے حجاز نے بھی اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ آپ کے فرزند حضرت حسن بلخی نے اس کی شرح کاشف الاسرار کے نام سے لکھی۔

(۲) رسالہ قضا و قدر: چند اوراق کا رسالہ ہے، قضا و قدر کے اسرار و حکم اور خیر و شر کے رموز پانچ تمہیدوں میں بیان کئے گئے ہیں۔

(۳) رسالہ توحید خاص: رسالہ قضا و قدر کی طرح یہ رسالہ بھی کسی مسائل پر جواباً تحریر کیا گیا ہے۔ اس رسالہ میں مسئلۂ وحدت الوجود کو مختلف دلائل سے بتایا گیا ہے۔

(۴) رسالہ توحید اخص الخواص، آٹھ صفحوں کا یہ مختصر سا قلمی رسالہ ہے۔ یہ کتاب بھی عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

(۵) رسالہ وجود عالم ہدایت و نہایت عالم صوفیوں کے لئے بہت ہی اروح پرور اور دلچسپ رسالہ ہے، یہ رسالہ بھی قلمی ہے۔

(۶) رسالہ دربیان ہشت چیز: موحدوں کی اصلاح کے لئے لکھا گیا ہے، صوفیا اور علماء کے لئے یہ ایک وقیع رسالہ ہے یہ بھی غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔

(۷) اورادہ فعلی: اوراد و وظائف کا مستند اور قابل عمل مجموعہ ہے، یہ رسالہ ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اس کے کاتب سید ابوالحسن بلخی ہیں اور سن کتابت ۱۲۹۱ھ ہے۔

(۸) گنج لایخفی: مخدوم الملک کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس کے جامع حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی ہیں، ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے اس کے کاتب محمد یعقوب بلخی ہیں اور سن کتابت ۱۲۲۱ھ ہے۔

(۹) مکتوبات: تصوف و سلوک کے دو مجموعے ہیں۔ بیشتر مکتوبات جوابی ہیں۔ مکتوبات کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: اول تعلیم و تربیت و پند و نصائح دوم آیات و روایات اخبار و آثار کی تفسیر و تشریح، سوم بزرگان سلف کے ابیات و اشعار پر تنقید اور ان کی توضیح، چہارم مسائل شریعت کے احکام و مصالح پنجم سلوک و تصوف کے اسرار و رموز۔

توحید اور نوشہ توحید آپ کے خاص لقب ہیں، آپ کا وصال ۲۴ ذی الحجہ بروز شنبہ ۸۴۴ھ میں ظہر کے وقت ہوا۔ آپ کی تاریخ وفات درج ذیل ہے ؎

تاریخ سال وفات سید بلخی حسین — شد گل ماہ بہار شریف
۸۴۴ھ

مؤلف سلسلۂ فردوسیہ جناب معین الدین دردائی نے اپنی تصنیف میں جناب حسین نوشہ توحید بلخی کے کلام کا مختلف جائزہ لیا ہے۔ موصوف کی شاعری کا نامکمل دیوان جناب سید قسیم الدین احمد فردوسی کے پاس موجود ہے۔ اس کے کاتب عبدالعلی مرحوم ہیں یہ نسخہ جناب حضور کے زمانہ میں ان ہی کے حکم سے یکجا کیا تھا۔ شاعری میں آپ کا تخلص حسین ہے نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔ شوق و سن کا اندازہ دیدنی ہے ؎

ما خودی را جلہ در توحید ناب افگندہ ایم ۔۔۔ صورت بلبیس را از رخ نقاب افگندہ ایم

گہ بہ ہجراں می سپارد در وصالش می دہد ۔۔۔ دل بہ غمہا چوں نمک اندر کباب افگندہ ایم

مومن و ترسا و تیغ اندر سمع آوردہ ایم ۔۔۔ نالہ نواہا گہ حقیقت در رباب افگندہ ایم

گہ بہ شہر عشق جاناں ہم چوں عنقائی پریم ۔۔۔ گہ چوں بوم عقل سایہ در خراب افگندہ ایم

پارسایاں اندریں رہ بت پرستی می کنند ۔۔۔ ما ورع در جام تقوی از شراب افگندہ ایم

از شوق روئے دوست چو دیوانہ گشتہ ایم ۔۔۔ از خویش و آشنا ہمہ بیگانہ گشتہ ایم

یک جرعہ مے چو از لب لعلش چشیدہ ایم ۔۔۔ رندو شراب خوار بہ میخانہ گشتہ ایم

روز ازل چو شمع جمال تو دیدہ ایم ۔۔۔ بر آتش جمال تو پروانہ گشتہ ایم

ہم چو حسین از سر جاں درگذر کہ مست ۔۔۔ او جاں گذشتہ ایم کہ جانانہ گشتہ ایم

سلسلۂ وحدت الوجود کی وضاحت ملاحظہ ہو ؎

ما سر جمال کبریائیم ۔۔۔ در ملک وجود بادشاہیم

خورشید رود بہ برج خلوت ۔۔۔ گر طلعت خود بدو نمائیم

ہر قوم بہ قبلۂ گر آید ۔۔۔ ما حاصل جملہ قبلہائیم

در چہرۂ دلبراں بہ شوخی ۔۔۔ از خلق ہمیشہ دل ربائیم

دانی بدو کون کیست پیدا ۔۔۔ مائیم از راہ لطف مائیم

آں چیست کہ غیر ما نگفتند ۔۔۔ آں را تو بداں کہ جملہ مائیم

مولانا رومؒ اور امام غزالیؒ سب ہی نے خرد کو عشق کے سامنے ہیچ سمجھا ہے۔ بلکہ اُسے جمال الٰہی کا حجاب بتایا ہے۔ مولانا مظفر بلخی نے بھی اس خیال کو اپنے دیوان میں اکثر و بیشتر اظہار کیا ہے۔ مخدوم حسین نوشہ توحید کے یہاں بھی عشق و محبت کی شراب دو آتشہ سہ آتشہ ہو کر عجب رنگ دے جاتی ہے۔

حال او نتوئی دہد از کعبہ در بتخانہ شو — زلف او دعوی کند کز عاشقی دیوانہ شو
بر دل مشتاق آمد ایں خطاب از عارضش — کعبۂ یک سو نہ بیزار از بتخانہ شو
گر عیاں خواہی کہ بینی روئے یار جانفزا — پائے بر فرق خرد نہ عاشق دیوانہ شو
در سلامت عاقلاں را عشق نہ نماید جمال — با ملامت ساز وآنگہ رند ہر میخانہ شو
در سماع کان بسر خود مطرب خود دف بود — با نوائے عشق تن تن تن تن تن تنا نہ شو
در خرابات کہ مستاں جام وحدت در کشند — چو حسینؔ از بادۂ ہر در در اپیمانہ شو

مسئلہ توحید کی وضاحت میں جرأت گفتار ملاحظہ ہو ؎

جمال پرتوے جان قلندر — ز نور پاک حق گشتہ مصور
نگارا چند بکنی پردہ بانی — کہ تو مائی و ما با تو سراسر
کہ می گوید کہ حق صورت نہ بندد — من اینک دیدہ ام نورش منور
قتیل راہ وصلت را دمادم — ہمیشہ خنجر ہجر ست بر سر
ز ہر قطرہ کہ از خونش بریزد — بر آید نقش از واللہ اکبر
دلا، بر زن کنوں کوس بشارت — کہ ملک لایزالی شد مقرر
ز گنبد ظلمت حرماں در ینجا — حسینؔ از وجہ تو چوں شد منور

عبادت و ریاضت صرف کم بولنا، کم کھانا، کم سونا نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک اور چیز ہے اور وہ ہے اپنے نفس اور دل پر قابو پالینا۔ اس مسئلہ کو اپنے مرشد مخدوم الملک حضرت شرف الدین یحیٰی منیری کے حوالہ سے ایک قطعہ میں اس طرح لکھتے ہیں ؎

مقتدائے دین پیر منیری — ایں سخن با ما بگفت از سروری

کائے برادر گر بخواہی اصل کار	ایں سخن را در دل خود پاسدار
ایں ریاضت نیست کایں رنجے بری	کم بگوئی، کم بخسپی، کم خوری
بچگاں و طفل و ہم بیوہ زناں	ایں ریاضت می کنند از آب و نان
ہر چہ آں فضلت دہد قربت دہد	در خیال غیر حق فرقت دہد
ایں ریاضت باشد اے عالی مقام	گوش کن تفسیر آں را در کلام
پاسبان دل شو اندر کل حال	تا نیابد، ہیچ و زد آنجا مجال
ہر خیال غیر حق را و زد خواں	ایں ریاضت سالکاں را فرض داں
از ہوائے حرص دل را قطع کن	با چنیں رہ اتباع شرع کن
ہر کہ ایں رہ می رود دل شاد باد	دیں نعم از بہر او آمادہ باد

حضرت مخدوم شیخ حسن دائم جشن بلخی فردوسیؒ

حضرت مخدوم حسن بلخی حضرت نوشہ توحید بلخی کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے، آپ نے تعلیم و تربیت ظاہری و باطنی اپنے والدین سے حاصل کی اور شروع سے آخر تک ان کی برابر خدمت میں رہے۔ آپ کی ذات میں سخاوت اور فیاضی بہت زیادہ تھی، گھر میں کچھ رکھنا آپ کو پسند نہ تھا، بچپن میں جو کچھ پیسے اپنے والد ماجد سے ملتے تھے اس کو دو چار دن کے اندر خرچ کر دیتے تھے آپ کے صاحبزادے احمد لنگر دریا بلخی نے اپنے ملفوظات مونس القلوب میں یوں لکھا ہے" میاں حسن کو اگر گھر بھر دولت مل جائے تو پھر بھی یہ کچھ ہی دنوں میں اس سے فارغ ہو جائیں گے بلکہ اگر نہ پادیں تو ہمیں بھی کسی کو بخشدیں" حضرت احمد لنگر دریا بلخی اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ کچھ دنوں تک حضرت والد ماجد نے بیعت لینے اور مقراض رانی کو ترک کر دیا تھا، ایک دن انہوں نے حضرت مخدوم حسین کو خواب میں دیکھا کہ وہ بیعت نہ لینے کا سبب پوچھ رہے ہیں، حضرت مخدوم حسن نے جواب دیا کہ مجھے اپنی انگلیوں کو دیکھ کر دہشت ہو رہی ہے دوسروں کا ہاتھ کس منہ سے پکڑوں" آنکہ خود گم شدہ رہ است کرا رہبری کند "

یہ سن کر شیخ حسن نے اپنی آستین سے ایک کاغذ نکالا اور ان کے ہاتھ میں دیا۔
وہ ایک نفیس پیراہن پر فردوسی کا شجرہ لکھا ہوا تھا پھر فرمایا دیکھو تمہارا نام چوبیس پیروں کے
نام کے اوپر لکھا ہوا ہے تمہیں اگر اس کا یقین نہ ہو تو مجھے دیکھو پیچھے مڑ کر دیکھا تو حضرت شیخ مولانا مظفر
بلخی کو کھڑا پایا ان کے پیچھے مخدوم الملک کو اور ان کے پیچھے حضرت نجیب الدین فردوسی کو اور اس
طرح سلسلہ تھا۔ شیخ حسین نے پھر اپنے صاحبزادے سے مخاطب ہو کر فرمایا "حسن جن کی پیٹھ پر
اپنے اپنے پیشواہوں اُسے کیا پروا۔ صبح اٹھ کر شیخ حسن نے بیعت لینے اور مقراض رانی کا
کام شروع کر دیا۔ حضرت حسن بلخی علوم دین اور علم معرفت و حقائق میں باکمال تھے۔ تصوف کے
باریک مسائل کو نہایت سہل طریقے سے فرماتے تھے۔ آپ کی تصنیفات سے دو کتابیں بہت مشہور
ہیں۔ ایک تو کاشف الاسرار جو شیخ حسین نوشہ توحید بلخی کی عربی کتاب حضرات خمس کی بہت بلیغ
شرح ہے اور دوسری لطائف المعانی۔ ان دونوں کتابوں میں توحید، معرفت کے اسرار اور عشق و
محبت کے رموز و نکات بہت بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔

آپ کی تاریخ وفات مصنف 'وسیلۂ شرف ذریعہ دولت' نے یوں لکھی ہے ؎

گزیدہ از غم خواجہ حسن سر انگشت — بگفت طبع کہ بوئے گل بہار شرف

۸۵۵ھ

بوئے گل بہار شرف کے اعداد سر انگشت یعنی الف اور نون کے اضافے سے ۸۵۵ھ
نکلتے ہیں۔ مولانا حسن بلخی کی کتاب کاشف الاسرار کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ میں
موجود ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۰۷ھ کا مرقومہ ہے۔ اس کے کاتب محمد حسین اسلام پوری ہیں اس کے اوراق
۴۳ ہیں اور اس کا اشاریہ نمبر ۴۰۴۹ ہے۔

حضرت مخدوم الملک احمد لنگر دریا بلخی

حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخی حضرت حسن بلخی کے صاحبزادے تھے لیکن آپ نے
تعلیم شریعت اور فیضانِ طریقت اپنے جد امجد حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی سے بھی

حاصل کیا تھا۔ آپ کی پیدائش ۲۷ ر رمضان المبارک ۸۲۶ھ کو ہوئی۔ چنانچہ پیدائش کے موقع پر حضرت حسین نوشہ توحید نے اپنے قلم مبارک سے عربی میں یہ چند سطور بطور یادداشت لکھ دیے تھے جس کو خود حضرت لنگر دریا بلخی نے اپنے ملفوظات مونس القلوب میں نقل کیا ہے۔ ولد الولد اعز المسمی الشیخ احمد بن حسن بن حسین الملقب بہ برہان الدین المکی بوالدالنعائم ابت اللہ نباتا حسنا فی لیلۃ سبع وعشرین من شہر المبارک الرمضان فی سنۃ ست وعشرین وثمان مائۃ اللہم اجعل من الاحیار وسلمہ من الاسواد افعل نبا یفنہ ماانت لہ اہل ولاتفعل بنا دیہ ما نحن اہلیہ یا مولانا برحمتک یا ارحم الراحمین۔

مونس القلوب میں یہ تحریر ہے کہ پیدائش کے بعد حضرت لنگر دریا بلخی کی چالیس روز تک آنکھیں بند رہیں، اس سے گھر والے گھبرائے لیکن حضرت حسین نوشہ توحید برابر تسلی دیتے رہے اور چالیس روز تک نماز چاشت کے بعد اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں پر ملتے رہے۔ آخر چالیس روز کے بعد حضرت احمد لنگر دریا بلخی کی آنکھیں کھلیں۔ آپ نے پہلا جلوہ اپنے دادا جان کا دیکھا جب ہوش آیا تو برابر اپنے دادا جان کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان ہی سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے، حضرت حسین نے ایک مرتبہ حضرت احمد کو فرمایا "احمد ہم تو کچھ نہ ہوئے لیکن تم اگر محنت سے پڑھو اور معرفت حاصل کرو تو کچھ ہو جاؤ گے تم سے ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا نام رہے گا۔"

سفر مکہ کی راہ میں ایک مرتبہ ان کو جو خطرہ لاحق ہوا تھا اس واقعہ کو حضرت احمد لنگر دریا بلخی نے "مونس القلوب" میں اس طرح لکھا ہے:

"مکہ کے راستہ میں ایک مرتبہ جہاز ڈوبنے لگا اور دو روز تک تمام مسافر امید و بیم کے جھولے میں جھولتے رہے ناامیدی نے ہر ایک کو دہشت زدہ کا بنا دیا۔ میں اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ جہاز پر تھا اور سوچتا تھا کہ خداوندا تیرے اس کام سے میں راضی ہوں ضرور اس میں تیری کوئی مصلحت مضمر ہوگی۔ اسی اثنا میں میری لڑکی فاطمہ کو غنودگی آگئی تو اس نے حضرت امیر المومنین

علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ تسلی دے رہے ہیں کہ تم لوگ متردد نہ ہو جہاز محفوظ رہے گا' اس کے بعد ہی جہاز خطرہ سے باہر ہوا۔"

مصنف 'وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت' نے لکھا ہے کہ غالباً اس واقعہ کے بعد آپ کا خطاب لنگر دریا پڑ گیا۔

'مونس القلوب' میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت احمد لنگر دریا نے اپنے صاحبزادے شیخ ابراہیم کی پیدائش سے پہلے ان کے دل میں یہ خیال ہوا کہ وہ حضرت ابراہیم ادہم کی اولاد سے ہیں اگر اللہ ان کو ایک بیٹا دے تو وہ اس کا نام ابراہیم ہی رکھیں، کچھ روز کے بعد شیخ ابراہیم پیدا ہوئے اور مخدوم الملک کے وصال کے بعد ایک مرتبہ وہ ایسا بیمار ہوئے کہ اُمید زیست باقی نہ رہی حضرت احمد لنگر دریا بے چینی کے عالم میں مخدوم الملک کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے اور عرض حال کیا تو خواب میں دیکھا کہ وہ تکیہ کے سہارے بیٹھا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ پریشان نہ ہو وہ لڑکے گا۔

حضرت احمد لنگر دریا کو جو محبت اور عقیدت حضرت مخدوم الملک سے تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ یوں تو تمام مسلمانوں پر پانچ شکر واجب ہے ایک تو اللہ تعالیٰ نے وجود میں لایا دوسرے یہ کہ حیوان بنا دیا جماد نہ بنایا تیسرے یہ کہ حیوان مطلق نہ بنایا بلکہ انسان بنایا چوتھے یہ کہ اسلام کی دولت سے مالا مال کیا۔ پانچویں یہ کہ حضرت خاتم الرسل احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بنایا لیکن مجھ پر ایک اور شکر واجب ہے وہ یہ کہ حضرت شرف منیری کے غلام میں شمار کرایا سے

از بندہ چہ آید بجز اقرار غلامی	کاں آمدہ فخر من و عار شرف الدین
سائم بدرش جبہ کز اں داغ بہ محشر	زود آمدہ باشم بہ شمار شرف الدین
بنگر شرف اختر فیروزی بختم	طالع شدہ از برج حصار شرف الدین

آپ کی طبیعت میں عجز و انکساری بے انتہا تھی، غیبت اور عیب جوئی سے قطعاً پرہیز کرتے تھے۔ اکثر یہ شعر پڑھتے تھے سے

تر ایک ذرہ در خود عیب دیدن ۔ بہ از صد نوع عیب الغیب دیدن

آپ کی تصانیف سے مونس القلوب، عارفانہ کلام کا ایک دیوان بطور یادگار ہے جس کا یہ شعر اکثر زبان زد ہے ۔

گر من از رخ برکشائم پردۂ ابلیس را ۔ در نظر فرق نہ دارم آدم و ابلیس را

آپ کا وصال ۱۹ رمضان المبارک ۸۹۱ھ ہے۔ قطعۂ تاریخ وفات درج ذیل ہے ۔

چو شیخ احمد بلخی کہ بود منبع فیض ۔ بہ خلد رفت شدہ سال رحلتش فیا
۸۹۱ھ

ایک اور قطعۂ تاریخ ہے :

بہ باغ خلد خرامید احمد بلخی ۔ کہ بود بر ستحش ناقہ تتار شرف

پرید بوز کلامم چو سال برخواندم ۔ ہوائے طیب بوئے گل بہار شرف

جناب ڈاکٹر حسن امام ناظم شعبۂ مخطوطات اردو فارسی عربی پٹنہ یونیورسٹی نے احمد لنگر دریا بلخی کی حیات و شاعری سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا جس پر موصوف کو پٹنہ یونیورسیٹی نے Ph.D کی ڈگری عطا کی۔ حسن صاحب کے بیان کے مطابق احمد لنگر دریا بلخی کے دو قلمی دیوان خانقاہ بلخیہ فردوسیہ فتوحہ اور خانقاہ منیر شریف میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مطبع حنفیہ پٹنہ سیٹی سے آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان کو جناب حفیظ الدین بلخی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر حسن امام نے حضرت احمد لنگر دریا بلخی کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، راقم نے بھی اس تحقیقی مقالہ سے استفادہ کیا ہے، اس کا جائزہ سطور ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حضرت احمد لنگر دریا بلخی کے دیوان میں ۹۸ غزلیں، ۴ مثنویاں، ۴ قطعات، ۱۲ رباعیاں ہیں جنھیں قطعات کہنا صحیح ہے۔ ۲۸ متفرق اشعار حمد، مناجات، نعت اور دو نظمیں ہیں۔ ان غزلوں میں ہمیں چار رنگ ملتے ہیں اول صوفیانہ، دوم فلسفیانہ، سوم اخلاقی اور چہارم عام مضمون، حضرت لنگر دریا کی بیشتر غزلیں اور مثنویاں شیخ عطار، مولانا روم، عراقی، امیر خسرو دہلوی، شیخ سعدی، خواجہ حافظ شیرازی، حضرت مخدوم احمد چرم پوش و حضرت نوشہ توحید اور

اور جامی کے رنگوں میں ہمیں ملتی ہیں۔

حضرت احمد کا نثری کارنامہ مونس القلوب، قلمی ہے اس کے جامع قاضی قطب منیری ہیں۔ یہ حضرت احمد لنگر دریا کے مرید تھے۔ مونس القلوب، کی اہمیت ملفوظات کی ہے اس میں سو مجلسیں ہیں۔ ان مجلسوں میں صوفیا، علماء، شعراء اور عرب وعجم وہند ملکوں کے سماجی اور مذہبی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مونس القلوب، دوسرے ملفوظات کے مقابلے میں زیادہ فصیح اور افضل ہے۔

حضرت احمد لنگر دریا کی شاعری کی بنیاد اس طرح رکھی ہے جس طرح امیر خسرو دہلوی، عراقی، حضرت مخدوم احمد چرم پوش حضرت مولانا مظفر بر ہان بلخی، حضرت حسین نوشہ توحید بلخی کی شاعری کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ حضرت احمد لنگر دریا بلخی کا مقام فارسی شاعری میں حضرت امیر خسرو، عراقی، حضرت مخدوم احمد چرم پوش، حضرت نوشہ توحید کی طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حضرت احمد لنگر دریا بلخی کا کلام بہت ہی مختصر ہے کیوں کہ شاعری میں آپ کی ذات ثانوی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ آپ کی اولین ذات مبارک یاد الٰہی، ذکر وفکر، تبلیغ وارشاد اور دیگر خیر وبرکت کی مجلسوں میں گذری۔ آپ کو سیاحت کا بھی شوق تھا۔ عرب وعجم کے ملکوں کی سیاحت کرتے رہے، مثلاً حجاز، عراق، بغداد اور بلخ کی سیاحت کی اور وہاں کی قابل قدر شخصیتوں سے ملاقات کی چنانچہ فرصت کے اوقات میں شعر موزوں فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ نے شاعری کی تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی۔ نمونہ کے طور پر چند شعر یہ ہیں ؎

زاں خط شب مثال کہ تحریر کردہ اند — روز ازل عبث مرا تشہیر کردہ اند
اے شاہ باد مپرس زحال گدائے خویش — اندر جہاں حسن ترا اسیر کردہ اند
مردان حق شناس بہ تاثیر یک نظر — مس وجود بہ جملہ اکسیر کردہ اند
اصحاب دل زدرد بہ دارو رسیدہ اند — زاں روئے التجا بہ در پیر کردہ اند

پروفیسر مینی دردائی اپنی تصنیف سلسلہ فردوسیہ میں حضرت لنگر دریا بلخی کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں :

"آپ کے کلام میں جہاں تصوف اور اخلاق کے موتی بکھرے ہوئے ملتے ہیں وہاں دل دردمند کا سوز و گداز بھی نمایاں ہے۔ آپ کے بعض اشعار میں بادۂ محبت کی وہ سرمستی پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والے پر ایک عالم طاری ہو جاتا ہے ؎

آتش عشق تو ناگہ بر فروخت — رطب یابس ہر چہ ما را بود سوخت
ذرۂ از آتش مہر ریخت — در دل ہر خام گاں افتادہ پخت
چست آمد بر تنم بکنار عشق — گرچہ خیاط ازل بس جامہ دوخت
زاہد دیدم کہ در بازارِ عشق — نقد صد سالہ بجائے مے فروخت
سوخت از احمد ہمہ پندار وے — آتش عشقِ تو ناگہ بر فروخت

ساقیا چوں از شراب بیخودی مستیم ما — جام بشکن بادہ بفگن کز خودی رستیم ما
در حقیقت چوں بہ بینی ہیچکس موجود نیست — در دو عالم جز وجود ما کہ ہستیم ما
ما ز عبرت غیر را اندر جہاں بگذاشتیم — نقش غیر خویشتن را پاک بر شستیم ما
چند گوئی چند شنوئی نکتۂ توحید را — بے ریاضت نیست لذت بارہا گفتیم ما
چونکہ احمد از احد داری نصیبے شاد باش — میم احمد صفر آمد پس احد ہستیم ما

تصوف کا ایک نازک مسئلہ کس خوبی سے ان دو شعروں میں حل کر دیا ہے ؎

ز آفرینش خوباں مراد داشت خدائے — کہ خاص مظہر خود را نگاہ دارد جائے
مرا کہ قبلہ و قیتم ہمیشہ روئے بتان ست — چہ حاجت است کہ گذارم نماز خلق نمائے

حضرت مخدوم الملک سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار ان چند اشعار میں والہانہ انداز سے کیا ہے، وہ ایک خاص کیفیت کا حامل ہے ؎

اے بیا قلندر شو — فارغ ز دل ز جابری شو
تا چند بہ شورہ دربہ مانی — یک لحظہ بکان شکری شو

در کلیۂ عقل چند نشینی ... بر قصبۂ جنوں مظفری شو
باز اہد خشک چند باشی ... در مجلس شاہ منیری شو
روباہ ہوا چو صید کردی ... در بیشۂ پلنگ بر تری شو
از دیو ظلوم دیو بگزر ... در پرتوے روے آں پری شو
عالم چو تجلی حسین است ... آحمد ہمہ عضو ناظری شو

حضرت ابراہیم بلخی المعروف بہ سلطان بلخی

حضرت ابراہیم بلخی اپنے والد ماجد مخدوم احمد بلخی کے خلیفہ اور سجادہ نشیں تھے۔ آپ نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل اپنے والد ماجد حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخی سے کی تھی۔ زیادہ تر اوقات عبادت و ریاضت، درس و تدریس، ارشد و ہدایت میں صرف کرتے تھے۔ سخاوت اور فکر و توکل میں اپنے والد ماجد کے رویہ کو نصب العین جانتے تھے۔ آپ کا وصال بھی اس تاریخ اور اس مہینہ میں ہوا جس میں آپ کے والد ماجد کا ہوا تھا یعنی ۱۹ رمضان المبارک ۹۱۴ھ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے ؎

بہ سال رحلت مخدوم شیخ ابراہیم ... کہ بود فقر و غنا را الدشعار شرف
بہ صبح صدق صدا خیر شد نسیم نفس ... کہ موج باد بہ بوئے گل بہار شرف

۹۱۴ھ

ان بلخی خاندان کے فردوسی مشائخ کے قطعۂ تاریخ لکھنے میں لکھنے والے نے بڑا وصف پیدا کردیا ہے کہ ذرا ذرا سی بامعنی اور برمحل اضافت کے بڑھا دینے سے تاریخ رحلت نکال لیا ہے۔ مثلاً حضرت مظفر بلخی کا سن وفات بہار شرف سے نکالا ہے اور حضرت حسین کے سن وفات نکالنے میں گل کا اضافہ کرکے گل بہار شرف کر دیا ہے اور شیخ حسن میں بو کا اضافہ کرکے بوئے گل بہار شرف کر دیا ہے اور شیخ ابراہیم میں موج کا اضافہ کرکے باد بہ بوئے گل بہار شرف کر دیا ہے۔

مخدوم ابراہیم کی پانچ اولاد تھی، مخدوم شاہین، مخدوم حافظ، مخدوم درویش، مخدوم محمود اور مخدوم مجاہد، تذکروں سے معلوم ہوتا ہے ان میں مخدوم حافظ، مخدوم محمود اور مخدوم شاہین اپنے

والد ماجد سے خلافت و اجازت رکھتے تھے۔ بہار شریف میں مخدوم حافظ مخدوم محمود اور مخدوم شاہین نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری رکھا۔

مخدوم درویش سے منیر میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا، بہار شریف میں مخدوم حافظ، مخدوم شاہین اور مخدوم محمود نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری رکھا اس وقت خانقاہ میں فقیری اور ارشاد کا سلسلہ بدستور جاری تھا لیکن مجاوروں نے جو خود کو مخدوم شرف الدین کے بعض مرید خاص کی اولاد سے بتلاتے تھے اپنی ذاتی غرض اور جاہلوں سے پیسہ کمانے کے لئے خود کو ہر قسم کی کارروائی کا مجاز بنانا چاہتے تھے، صاحب سجادہ کو ایک وجود معطل قرار دینا چاہتے تھے، بالآخر صاحب سجادہ کے مخالف ہو کر خفیہ سازش کرنے لگے یہاں تک کہ مخدوم حافظ، مخدوم شاہین اور مخدوم محمود کے بعد بلخیوں نے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی، اس وقت مجاوروں نے شاہ بھیک کو جو شیخ ذکی الدین کی لڑکی کی اولاد میں سے تھے صاحب سجادہ بنایا۔ بلخیوں کو ان سے خلوصانہ ربط رہا۔ یہ واقعہ مخدوم محمود بن ابراہیم بلخی کے بعد کا ہے۔

حضرت مخدوم حافظ بن ابراہیم بلخی

حضرت مخدوم حافظ بلخی حضرت مخدوم ابراہیم بلخی کے منجھلے صاحبزادہ تھے، مؤلف سلسلۂ فردوسیہ جناب معین الدین دردائی نے لکھا ہے "از راہ محبت اور خلوص حضرت مخدوم الملک کے خاندان کے فرد حضرت مخدوم الملک کی سجادگی پر بجائے اپنے علحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے خانقاہ فردوسیہ فتوحہ میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ سلسلۂ رشد و ہدایت جاری ہے۔ آپ بڑے خدا پرست صوفی اور عالم باعمل گذرے ہیں۔

مخدوم شاہین بلخی

آپ مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی کے بڑے بیٹے تھے، بڑے ذی علم اور متوکل تھے۔ صبر و قناعت اور گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند کرتے تھے۔

مخدوم محمود بلخی

آپ نے اپنی حیات تک بہار شریف میں سجادہ نشینی کی۔

مخدوم درویش بلخی

مخدوم درویش بلخی مخدوم ابراہیم بلخی کے صاحبزادہ تھے اور مخدوم محمود بلخی سے بھی
اجازت و خلافت رکھتے تھے، آپ سے منیر میں سلسلہ جاری رہا، مخدوم درویش بلخی کے بعد
مخدوم بڈھن بلخی سجادہ نشین ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ رکن الدین بلخی تھا۔ ان کا نسب نامہ
غالباً منیر والوں کے پاس محفوظ ہو، مخدوم بڈھن مخدوم دولت منیری کے ماموں تھے۔ منیر کے
مخدوم زادوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں (شیر شاہ) عقیدت مندانہ ان کے پاس حاضر
ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہندوستان کا تخت خالی ہے، اس کے جانے کے قبل ہی ہمایوں بادشاہ کا
تسلط ہوگیا اور شیر شاہ نے کسی سبب سے ہمایوں کے طرفدار ہونے کا وہم کیا اور مخدوم بڈھن بلخی
کو مع فرزندوں کے قتل کر دیا۔ مخدوم بڈھن کے بیٹے قطب موحد بلخی جو اتفاق سے اس وقت
کہیں گئے ہوئے تھے محفوظ رہے اور والد کی جگہ سجادہ نشین ہوئے بعد میں شیر شاہ نے کچھ تحائف
بھیج کر مخدوم قطب موحد بلخی سے معافی مانگی پھر قطب موحد بلخی نے یہ کہہ کر قبول کیا کہ مرشد کسی کا
تحفہ میں قبول نہ کروں گا۔ اس کے حق میں دعائے خیر کروں گا۔ مخدوم قطب موحد بلخی کے بعد
مخدوم دولت منیری جو ان کے پھوپھیرے بھائی تھے اور تربیت یافتہ شاگرد بھی تھے ان کے
خلیفہ اور سجادہ نشین ہوئے، مخدوم دولت مخدوم جلیل الدین بن مخدوم یحییٰ منیری کی اولاد میں تھے۔

حضرت محمد تقی بلخی فردوسی

حضرت مخدوم الملک کے وصال کے بعد بلخی خاندان کے چھ مشائخ یکے بعد دیگرے
حضرت مخدوم الملک کی خانقاہ کے سجادہ نشین ہوتے رہے اور یہ سلسلہ رشد و ہدایت کا حضرت

مولانا مظفر بلخی سے لے کر حضرت حافظ بلخی تک جاری رہا لیکن حضرت حافظ نے جب حضرت مخدوم الملک کی خانقاہ کی سجادگی سے کنارہ کشی اختیار کی تو آپ نے فتوحہ میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔

حضرت محمد تقی بلخی حضرت حافظ بلخی کی اولاد سے تھے آپ حضرت محمد ظہور الحق کے ہم عصر تھے۔ حضرت تقی بلخی نے ایک مذہبی رسالہ احکام لکھا اس کا قلمی نسخہ پروفیسر ذکی الحق مرحوم کے پاس محفوظ تھا، اس نسخہ کی کتابت ۱۲۵۲ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کے کاتب شیخ خیرات علی ہیں۔ کتاب کی تقطیع "۵×"۹ ہے ۸۹ اوراق زرد اروی کاغذ کے ہیں جا بجا کرم خوردہ ہیں۔

جناب رخشاں ابدالی لکھتے ہیں کہ اس کے مصنف سید شاہ محمد تقی بلخی فردوسی سجادہ نشین خانقاہ بلخیہ فتوحہ ضلع پٹنہ ہیں۔ یہ ۱۲۸۳ھ میں مٹیا برج کلکتہ میں مرزا مہدی حسن کے اہتمام سے طبع ہوئی، ۲۱۶ صفحات پر محیط ہے اور بعد والے صفحہ پر شاہ یحییٰ عظیم آبادی کے دو قطعے تاریخ فارسی میں ہیں۔ مصنف کے صاحبزادے اور جانشین شاہ عظیم الدین صاحب نے مصنف کی رحلت کے چند برس بعد چھپایا ہے جس کی حالات اپنے مقدمہ میں انہوں نے کی ہے ۱۲۸۳ھ سال طباعت ہے۔

مولوی محمد واجد ابن قاضی طہارت التوحید بلخی

مولوی محمد واجد بلخی فصیح الدین بلخی کے جد امجد تھے۔ ذکاوت و ذہانت، خوش بیانی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ فن معماری اور نثر مرصع میں اب تک آپ کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا ہے، عرصہ دراز تک منصفی کے عہدے پر مقرر رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے زمانہ میں بتیا اور سگولی کے اطراف میں کافی ہنگامہ تھا۔ جب باغیوں کی یورش کو دیکھ کر انگریزی حکام نے وہاں سے ہٹنے کا ارادہ کیا انہوں نے کہا میں اپنے علاقہ میں کسی غدر کا فساد نہیں ہونے دوں گا۔ تھوڑے سپاہیوں کو ساتھ لے کر پورے علاقہ کی حفاظت اپنے ذمہ لی اور کوئی فساد اور بدامنی نہیں ہونے دی، ملازمت سے دستبردار ہو کر جب خانہ نشین ہوئے تو گورنمنٹ نے دو سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی جو ان کی حیات تک مقرر رہی، ۲۱ رمضان ۱۲۹۵ھ کو وفات پائی، شاہ محمد یحییٰ ابوالعلائی نے قطعات

تاریخ وفات حسب ذیل کہے ؎

مولوی میر محمد واجد — سید نامور نیک امین
فاضل باخبر و دانش مند — صاحب عقل متین باتمکین
در ذکاوت علمش بود بلند — خوبی طرز و زبانش شیریں
داشت در فن معمار شہرت — نژاد بود بغایت رنگیں
زیں جہاں رفت بماہ رمضاں — شد دل و جاں بفراقش غمگیں
آفتاب فلک فضل و ہنر — گشتہ افسوس نہاں زیر زمیں
سال تاریخ ز روئے الہام — گفت دل رفت بفردوس بریں

۱۲۹۵ھ

دیگر

فاضلے رفت کہ از حد شمار — ہست اوصاف جمیلش زائد
گفت تاریخ رحلتش دل آہ — جنتی گشت محمد واجد

۱۲۹۵ھ

مولوی حمید الدین بلخی تخلص بہ اوج

مولوی حمید الدین بلخی اوج مولوی محمد واجد بلخی کے حقیقی بھائی تھے، تصوف اور شاعری سے خاص شغف رکھتے تھے، فارسی میں اہل زبان تسلیم کئے جاتے تھے عرصہ دراز تک منصفی کے عہدے پر فائز رہے سنہ ۱۲۷۰ھ میں سہسرام کے منصف تھے وہیں انتقال کیا اور حضرت بورھن دیوان کے مقبرے کے حلقے میں چبوترے کے متصل پورب جانب مدفون ہوئے۔ پختہ قبر ابتک موجود ہے۔ صوفیانہ کلام کا ایک دیوان فارسی بطور یادگار ہے، جناب شاہ یحیٰی ابوالعلائی نے یہ قطعہ تاریخ وفات کہا تھا۔

تاریخ وفات مولوی حمید الدین بلخی اوجؔ

اوجؔ سخنداں چوں ازیں خار زار — سوئے گلستان ارم کرد راہ
شور و فغاں رفت بہ اوج پہر — حال احبا شدہ از غم تباہ
خامہ بتاریخ وفاتش نوشت — طوطی شکر شکن فارس آہ

۱۲۹۵ھ

ڈاکٹر غیاث الدین بلخی

فصیح الدین بلخی مرحوم کے والد بزرگوار نے بھی اپنے والد بزرگوار سے ہی تعلیم پائی تھی اور وہ بھی بڑے ذی علم تھے۔ دو بار حج زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ عربی میں عربوں سے بے تکلف گفتگو کرتے تھے اور فارسی بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ آقا کمال الدین تجر طہرانی جب پٹنہ آتے تھے تو ان سے ضرور ملتے تھے، علم نجوم میں بھی ایسی مہارت تھی کہ بنارس کے برہمن اکثر اکثر پترا مرتب کرنے میں مشورہ کرتے تھے۔ ان کی تصنیف سے ایک مبسوط کتاب علم نجوم پر اور دوسری کتاب مصطلحات زمینداری پر یادگار ہے ان کے علاوہ ایک ناول موسوم بہ طرز معاشرت جس میں اصول حفظ صحت کو ناول کے پیرایہ میں بیان کیا گیا تھا شائع ہو کر کچھ عرصہ داخل نصاب تھا اور ایک رسالہ موسوم بہ علاج ہیضہ بھی مطبوعہ ہو کر شائع ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۹۰۸ء میں پینتالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حفیظ الدین بلخی

فصیح الدین بلخی کے بھائیوں میں سب سے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین بلخی مرحوم اپنے زمانہ عظیم آباد کے ایک ممتاز ادیب و شاعر تھے، ۱۸۹۷ء میں ایک گلدستہ موسوم بہ تحفہ بہار اپنی اور اپنے مخلص دوست حکیم فہیم الدین احمد کی ادارت میں نکالا تھا۔ اس گلدستہ میں داغ دہلوی اور بعض مشہور اساتذہ کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ آخر عمر میں انہوں نے خود غزلیں پڑھنا چھوڑ دیا تھا لیکن غزل کہہ کر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر جس سے ان کے طرز شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے اس جگہ نقل کیا جاتا ہے ؎

پھر عالم خیال ہے جولاں گہ امید　　　ناکامیوں سے تنگ دل منتشر نہ ہو

مؤلف تذکرہ مسلم شعرائے بہار جناب احمد اللہ نے بھی آپ کا ذکر حصہ اول میں مقدمہ آغاز سحر مجموعہ کلام نادم بلخی کے حوالہ سے کیا ہے۔

تقریباً ساٹھ سال کی عمر پائی ۱۹۳۶ء میں ملک برما میں انتقال کیا اور وہیں بہادر شاہ ظفر کی طرح مدفون ہوئے۔ جناب قمر گیاوی نے حفیظ الدین بلخی کی موت سے متاثر ہو کر دو قطعات تاریخ وفات لکھے جو اس جگہ درج کئے جاتے ہیں۔ قطعات تاریخ وفات مخدوم محترم مولوی سید شاہ حفیظ الدین فردوسی وادہی سہ

صوفی نامی حفیظ الدین نے　　　ملک برما سے جناں کی راہ لی
کالے کوسوں تھے وطن سے آپ آہ　　　قبر بلخی حیف غربت میں بنی
تیسری شعبان کو وقت صبح آہ　　　چھپ گیا مرقد میں مہر ادہمی
رہ گئی دل میں یہ حسرت اے قمر　　　مرتے دم دیکھی نہ صورت آپ کی
رو کے لکھی ہے یہ تاریخ وصال　　　صاف پا طن ہائے بلخی جنتی

۱۳۵۴ھ

ایضاً

خبر وطن میں یہ غربت سے آہ آتی ہے　　　جہاں سے اٹھ گئے افسوس ناگہاں بلخی
ادیب و ماہر علم معارف و سالک　　　چراغ انجمن دین عارفاں بلخی
مہر منیر شرف نور حضرت ابراہیم　　　گل ریاض وطن فخر خانداں بلخی
جہاں کو آپ نے دوزخ سمجھ کے چھوڑ دیا　　　گئے ہیں دار فنا سے سوئے جناں بلخی
دیا ہے داغ جدائی حضور نے مجھ کو　　　اجل نے لوٹ لیا ہائے قدرداں بلخی
یہ میری زیست کے دس دن غموں میں گذریں گے　　　تمام عمر کرے گا یہ دل فغاں بلخی
ہوئی جو فکر قمر سال مرگ کی مجھ کو　　　کہا یہ دل نے کہ فردوس آشیاں بلخی

۱۳۵۴ھ

جناب کلیم الدین احمد نے اپنی تصنیف (خود نوشتہ سوانح حیات) میں جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم کی بالکل تین ابتدائی غزلیں درج کی ہیں، موصوف نے حفیظ الدین بلخی کا ذکر اپنی کتاب میں کافی التزام کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلیم صاحب کے بڑے چچا فہیم الدین احمد فہیم سے جناب حفیظ الدین بلخی کے بہت ہی مخلصانہ تعلقات تھے، موصوف نے اپنی کتاب "اپنی تلاش میں" یہ لکھا ہے کہ جناب حفیظ الدین بلخی کا کچھ کلام ان کے چھوٹے صاحبزادے رفیع الدین بلخی مرحوم کے پاس تھا، رفیع الدین بلخی مرحوم نے اپنے والد محترم کی کچھ غزلیں جناب کلیم الدین احمد کو دینے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن اس درمیان جناب رفیع الدین بلخی کا انتقال ہو گیا۔ بہر حال کلیم الدین احمد جناب حفیظ الدین بلخی کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

"تحفۂ بہار میں مجھے تین غزلیں حفیظ چچا کی ملی تھیں میں نے کہا ان کی طبیعت مشکل پسند تھی لیکن ان غزلوں میں مشکل پسندی نہیں جو ان کی بعد کی غزلوں میں ہے جن میں اکثر معنی کی تلاش دشوار ہو جاتی ہے۔ اکثر غزلیں مل جاتی ہیں تو فرق نظر آتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کا دماغ کس طرح ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے یہ تین غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں اس لئے کہ یہ محفوظ ہو جائیں، ان غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بلخی تخلص کرتے ہیں۔" [1]

سنکر سوال بوسہ کچھ ایسا خفا ہوا ‌ ‌ ‌ ‌ تیور چڑھی ہوئی ہے تو منہ ہے بنا ہوا
درد فراق و ذوق وصال پری رخاں ‌ ‌ ‌ ‌ سرکار عشق سے مجھے کیا کچھ عطا ہوا
اللہ رے پاس داشت کہ صورت بدل گئی ‌ ‌ ‌ ‌ بزم طرب میں نالہ مرا قہقہہ ہوا
حال دل شکستہ پہ رویا جو بیوفا ‌ ‌ ‌ ‌ آنسو کا قطرہ دل کے لیے مومیا ہوا
ہاں ہاں پکار کر یوں کہوں گا کہ زاہدو! ‌ ‌ ‌ ‌ جو بت سے بے نیاز ہوا وہ خدا ہوا
جاں چشم یار نے لے لی عتاب میں ‌ ‌ ‌ ‌ تیر نگاہ یار بھی تیر خطا ہوا

---

[1] ملاحظہ ہو "اپنی تلاش میں" (خود نوشتہ سوانح حیات مصنفہ کلیم الدین احمد)

جانے کا دل کے آشنا تو صدمہ ضرور ہے ۔۔۔ مدت کا تھا رفیق سو وہ بھی جدا ہوا
تو جو ملا رقیب سے اس کا گلہ ہی کیا ۔۔۔ پر فن کبھی کسی کا بھی تو آشنا ہوا
جاتا تو میکدہ سے ہے زاہد مگر بتا ۔۔۔ حق جناب پیر مغاں بھی ادا ہوا
بلخی بنے ہیں کب سے مرے غمگسار آپ ۔۔۔ جور و جفا و ظلم جو مجھ پر سوا ہوا

حفیظ الدین بلخی مرحوم کی یہ غزل گلدستہ تحفۂ بہار ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

دیگر

جو کیا اچھا کیا پھر ہے پشیماں کیسا ۔۔۔ قتل پر میرے ہوا سر بگریباں کیسا
دید لی اپنی بہر نوع تھی تجھے مد نظر ۔۔۔ شعلۂ طور کہاں موسیٰ عمراں کیسا
تم بھی گلگشت کو آؤ مجھے دیکھو تو سہی ۔۔۔ دل کے داغوں نے کھلایا چمنستاں کیسا
فرقت وصل و غم ہجر نے کی دل میں جگہ ۔۔۔ خانہ آباد ہوا خانۂ ویراں کیسا
بیعت عہد وفا کی ہے بدست گیسو ۔۔۔ تیرا وحشی بھی ہوا سلسلہ جنباں کیسا
عمر کاٹی تیرے وحشی نے بدشت غربت ۔۔۔ کوچۂ زلف ہے کیا خانۂ ویراں کیسا
موت آتی ہے جو ہجراں میں پلٹ جاتی ہے ۔۔۔ سخت جاں تو نے بنایا غم جاناں کیسا
بوالہوس تجھ پہ جو مرتے ہیں محبت جھوٹی ۔۔۔ حسرت وصل کسے ہے تیرا ارماں کیسا
دھو کا کھا نہ مرے در دیا سے زاہد ۔۔۔ کافر عشق صنم ہوں میں مسلماں کیسا
سر اڑانے کا دیا پہلے تو جلاد کو حکم ۔۔۔ تیغ کھینچتے ہی کہا تم نے ہے نالاں کیسا

پاس ناموس محبت ہوا ورنہ بلخی
دیدۂ تر نے اٹھا رکھا تھا طوفاں کیسا

دیگر

تم دیکھنے آئے تھے تماشہ میرے دل کا ۔۔۔ ہاں اور ہوا جاتا ہے نقشہ میرے دل کا
اندیشہ ہے اس ترک خود آرائی کو مت پوچھ ۔۔۔ اس بت نے بنایا ہے کلیسا میرے دل کا
جو اچاہے فلک مجھ کو مٹائے کر بگاڑے ۔۔۔ مٹنے کا نہیں نقش تمنا میرے دل کا

آنکھوں سے مری خون کی منجدھار رواں ہے | اُمڈا ہی چلا آتا ہے دریا میرے دل کا

تم جانچ بھی لو تول بھی لو دیکھ بھی لو نقش | سونے کا ملمع نہیں سودا میرے دل کا

نکلے گا شرر قبر سے میری پس مردن | رنگ لائے گا اک روز یہ سودا میرے دل کا

ٹالے نہیں ٹلتی کبھی وحشت میرے دل کی | کھویا نہیں جاتا کبھی سودا میرے دل کا

جب سے کہ گذر اس میں بتوں کا ہوا بلخیؔ | اُجڑا سا نظر آتا ہے کعبہ میرے دل کا

عزیزالدین بلخی

فصیح الدین بلخی مرحوم کے منجھلے بھائی جناب عزیزالدین بلخیؔ تھے انہوں نے اپنی ساری عمر زبان و ادب کی خدمت میں گذاری، ابتدائی تعلیم حکیم احمد حسن صوفی صاحب کے مدرسہ میں پائی اور اس کے بعد انگریزی تعلیم محمڈن اینگلو عربک اسکول میں حاصل کی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک ماہوار ادبی رسالہ "رفتار زمانہ" جاری کیا جس کو نواب محسن الملک مرحوم سکریٹری علی گڈھ کالج کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس پرچہ کے بند ہونے پر ایک مبسوط کتاب فن غبارہ بازی اور ہوائی جہاز رانی پر لکھی جس کا نام "انسان کی پرواز" ہے اور اردو زبان میں اس فن پر پہلی کتاب ہے۔ ان کی دوسری کتاب "تاریخ شعرائے بہار" ہے اس میں سنہ ۱۳۰۰ھ تک کے تمام شعرا کا ذکر ہے اور اس کی دوسری جلد سنہ ۱۳۰۱ھ سے لے کر سنہ ۱۳۵۱ھ میں تمام شعرائے بہار کے حالات اور نمونۂ کلام درج ہیں لیکن دوسری جلد ہنوز طباعت و اشاعت سے محروم ہے کیوں کہ کاتب تقدیر نے آپ کی عمر کا دفتر تمام کر دیا۔ کچھ عرصہ تک اپنے اخبار "اتحاد وطن" کے ادارہ کی ذمہ داری بھی اپنے ذمہ لی تھی، چنانچہ آپ کے انتقال پر اخبار "اتحاد" نے فروری سنہ ۱۹۳۵ء کے پرچہ میں ایک خاص مضمون لکھ کر اظہار تاسف بھی ظاہر کیا تھا۔
جناب عزیزالدین بلخی مرحوم نے بتاریخ ۱۹ شوال مطابق ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء روز جمعہ انتقال کیا اور مقام کچی درگاہ جیٹھولی مخدوم شہاب الدین پیر جگجوتؒ کے مزار سے پچھم واقع خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ آپ کی موت سے متاثر ہو کر جناب قمر گیاوی مرحوم اور جناب مولوی محمد احسان حسن احسان رئیس رسول پور ضلع مظفرپور نے قطعات تاریخ لکھے۔

قطعات تاریخ وفات مولوی عزیز الدین بلخی راز مرحوم از جناب قمر گیاوی:

عزیز الدین بلخی اٹھ گئے دنیائے فانی سے
وہ بلخی کون جو تھے صوفیوں میں ادہمی بلخی

قمر خادم ہے تو اولاد ابراہیم ادہم کا
دعائے مغفرت کر حق سے بہر متقی بلخی

سرِ مدفن ندا آتی ہے یہ زائر کے کانوں میں
پڑھو تم فاتحہ یہ ہے مزار جنتی بلخی

۱۳۵۳ھ

دیگر

وا دریغا کہ بزم دنیا کو
کر گئے تم اداس حیف عزیز

لکھی رو کر قمر نے یہ تاریخ
بلخی حق شناس حیف عزیز

۱۳۵۳ھ

قطعہ تاریخ وفات مولوی عزیز الدین بلخی راز مرحوم از جناب مولوی محمد احسان حسن احسان رئیس موضع رسول پور ضلع مظفر پور

فرید الدہر عزیز الدین بلخی
ادیب کامل و مشہور آفاق

حلیم و پارسا و صاحب دل
فرشتہ صورت و سیرت اخلاق

دریغا رفت جنت از دار فانی
کہ حوران جناں بودند مشتاق

بسال نقل از احسان گفتم
عزیز الدین، بہشتی نور آفاق

۱۳۵۳ھ

حضرت قمر گیاوی کے برادر خرد مولوی محمد تفضل حسین فراق نے بھی مندرجہ ذیل قطعہ لکھا ہے

قطعہ

عزیز الدین بلخی نے قضا کی
یہ سنکر مضطرب ہے قلب پرغم

فراق خستہ نے لکھی یہ تاریخ
بہشتی بحر احسان نور ادہم

۱۳۵۳ھ

نمونہ کلام

رازؔ بلخی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ابتدا میں فارسی زبان میں شعر زیادہ کہتے تھے چنانچہ ان کا ایک فارسی قصیدہ رفتار زمانہ میں بھی شائع ہوا تھا اس کا مطلع یہ ہے ؎

ز قطرہ ہائے ژالہ چرخ است اشکبار ۔۔۔ مردانہ گوہرے است کہ برگل شود نثار

جناب ضیاؔ عظیم آبادی اکثر ان کا کلام سننے کو اور خود اپنا کلام سنانے کو رازؔ بلخی کے گھر پر تشریف لاتے تھے، مرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آبادی (یاسؔ یگانہ چنگیزی) بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

نمونہ کلام

آنکھیں لڑا کے دل سے بڑھاتی ہے میل تو ۔۔۔ کیا ہی نگاہِ یار ہے دیدۂ دلیل تو

سایہ کی طرح ناقۂ لیلیٰ بھی ساتھ ہو ۔۔۔ اے جذبِ شوقِ قیس جو کھینچے نکیل تو

اے قیس راہ عشق کی تکمیل ہم نے کی ۔۔۔ جادہ پہ رکھ گیا تھا فقط داغ بیل تو

صبحِ شبِ وصال یہ کہتا گیا وہ شوخ ۔۔۔ گر عیش اُٹھائے ہیں تو مصیبت بھی جھیل تو

اے دل ان آنکھوں سے کبھی چشم وفا نہ رکھ ۔۔۔ ناداں ان تلووں میں نہ پائیگا تیل تو

منڈھتا ہے رازؔ عشق کو اپنے گلے عبث ۔۔۔ ناداں منڈھے چڑھا نہ سکیگا یہ بیل تو

دیگر

آتے آتے مرے گھر تک وہ اٹک جاتے ہیں ۔۔۔ ملتے ہیں راہ میں غیروں کے محلے پہلے

مجھکو یہ کد ہے دم نزع وہ آئیں اس دم ۔۔۔ ان کو یہ ضد ہے کہ دم اس کا نکلے پہلے

بادۂ نو کا ابھی ذکر ہی کیا ہے ساقی ۔۔۔ آخری جام بھی تلچھٹ کا تو چل لے پہلے

ضبطِ فریاد سے کچھ رازؔ محبت نہ چھپا ۔۔۔ کُھل پڑے آنکھوں سے اشکوں کے دھڑلے پہلے

نہ پوچھ مجھ سے کہ فرقت میں کیا گذرتی ہے ۔۔۔ ستم گذرتا ہے مجھ جفا گذرتی ہے

یہ نارسائی قسمت کہ مر مٹنے پر بھی ۔۔۔ ہماری خاک سے بچ کر صبا گذرتی ہے

رازؔ بلخی مرحوم کی مندرجہ ذیل غزل رسالہ تحفۂ بہار بابت فروری ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ موصوف کا بالکل ابتدائی کلام ہے ؎

اپنی آنکھوں میں یہ ہیں شعبدہ باراں کیسا
اپنے دل کے بخارات ہیں طوفاں کیسا

سچ ہے ہوتی ہے مکیں سے مکاں کی رونق
دشت بھی قیس کے مرنے سے ہے ویراں کیسا

اب لہو آتے ہیں آنسو کے عوض آنکھوں میں
رنگ لائے ہیں مرے دیدۂ گریاں کیسا

وعدہ کرنا تھا تم کو تو سمجھ کر کرتے
کیسا جھگڑا ہے مری جاں یہ نہیں ہاں کیسا

آج پہلو میں مرے رازؔ جو آ بیٹھے ہیں
کیسی حسرت ہو مرے دل میں جو ارماں کیسا

جناب مولوی احمد اللہ ندوی نے اپنی کتاب تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد دوم میں آپ کا ذکر شد و مد کے ساتھ کیا ہے۔

نظام الدین بلخی

فصیح الدین بلخی کے سنجھلے بھائیوں میں جناب سید نظام الدین بلخی مرحوم ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ آپ کی پیدائش ۲۲ مارچ ۱۸۸۲ء میں عظیم آباد کے مشہور محلہ بخشی میں ہوئی جناب بلخی نے اپنے والد ماجد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم حکیم صوفی صاحب کے مدرسہ سے حاصل کی پھر انگریزی سیکھنے کے لیے مسٹر ٹیکیڈو پریسو کے پاس گئے جو پادری کی حویلی میں رہتی تھیں۔ جن کی تعلیم انگریزی مادری زبان جیسی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد پٹنہ سیٹی محمڈن اینگلو عربک اسکول میں شریک ہو کر سنہ ۱۹۰۱ء میں انٹرنس کے امتحان میں اول آئے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں اول نمبر لانے کے صلہ میں کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کو سونے کا تمغہ دیا۔ پھر پٹنہ کالج میں ایف۔ اے میں داخل ہوئے لیکن والد بزرگوار کی ناگہانی موت نے آگے پڑھنے کا موقع نہ دیا اور کالج چھوڑنا پڑا چنانچہ ۱۹۰۷ء میں مولانا شجاعت علی خاں کی وساطت سے پٹنہ سیٹی اسکول میں مدرس ہوئے پھر مختلف مدارج کو طے کرتے ہوئے ۱۹۳۶ء میں آپ کا تبادلہ پٹنہ ہائی اسکول گردنی باغ میں ہوا۔ جہاں سے آپ ریٹائر ہوئے، جناب مولوی سید احمد اللہ ندوی نے آپ کا ذکر اپنی کتاب مسلم شعرائے بہار جلد دوم میں شد و مد کے ساتھ کیا ہے۔

آپ کی شاعری میں حضرت داغ دہلوی کے باضابطہ شاگرد ہوئے، شاگردی کا سلسلہ کافی دنوں تک خط وکتابت سے جاری رہا اور حضرت داغ جب عظیم آباد تشریف لائے تو آپ بھی ان کے دبستاں میں شامل ہوئے، داغ کی استادی کا فخر اس شعر میں فرماتے ہیں ؎

جناب داغ کا یہ فیض کم نہیں، بلخی — سخن زباں کے لئے ہے زباں سخن کے لئے

آپ کی وفات ۱۹۶۶ء میں بعمر چوراسی سال ہوئی، شاعری میں آپ اپنا تخلص نظام اور بلخی دونوں فرماتے۔ آپ کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے آپ کو موصوف کی زبان اور خیالات کا صحیح اندازہ ہو سکے ؎

فسردہ دل ہے نہ خلوت نہ انجمن کے لئے — یہ پھول بھی تو ہے کانٹا ہر اک چمن کے لئے
پہن لیا تھا کسی وقت جامۂ ہستی — اجل کھڑی ہے اُسی جامہ کہن کے لئے
اجل پلٹ گئی منہ پھیر کے جو یہ دیکھا — کہ ایک تار بھی باقی نہیں کفن کے لئے
نمود صبح یہ کیا حال شمع کا ہوگا — تمام رات جو رو دے گی انجمن کے لئے

الٰہی الاماں راز دل افسانہ ہوتا ہے — قیامت ہے قیامت آشنا بیگانہ ہوتا ہے
یہ مصرعہ لکھ دیا پیر مغاں نے میری تربت پر — ہمارے مے گساروں کا بھی پیمانہ ہوتا ہے
تڑپنا، لوٹنا، اُٹھنا، سلجھنا، جان سے جانا — پریشانی میں جو ہوتا ہے بے تابانہ ہوتا ہے
تغزل اب کہاں فیضِ جنابِ داغ ہے، بلخی — تمہارا شعر جو ہوتا ہے استادانہ ہوتا ہے

سراپا عشق ہے بلخی سراپا دل نہ بن جائے — بھرا گھر لوٹ لیں اُجڑی ہوئی منزل نہ بن جائے

اسی کو وہ بلکہ ہی محفل میں فرزانہ سمجھتے ہیں — جو ہستی کو عدم عالم کو افسانہ سمجھتے ہیں
کچھ ایسی خود نمائی ہے کچھ ایسے آپ بیخود ہیں — نہ آبادی سمجھتے ہیں، نہ ویرانہ سمجھتے ہیں
سمجھنے والے ہی کچھ جانتے ہیں عاشقی کیا ہے — نظام الدین بلخی کو جو دیوانہ سمجھتے ہیں

عظیم آباد کے مشاعرہ کی رپورٹ کے باعث تلاش و جستجو کے سلسلہ میں جناب نظام الدین بلخی مرحوم کی تین نایاب غزلیں ملیں وہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

غزل اوّل

غزل اوّل رسالہ تاج گیا مدیر آنجہانی جگیشر پرشاد خلش ماہ دسمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی

حشر میں داد طلب ہوئی نہ چاہت میری
میں کہیں چھوؤں کہیں جا لگی غیرت میری

جلوہ حسن ہوں تصویر ہے صورت میری
صورت آئینہ حیرت ہے حقیقت میری

میری تقدیر سے اچھی رہی الفت میری
مر گیا میں تو یہ کہتے ہیں کہ قسمت میری

دور چلنے لیے ہے دل کی صفائی دل میں
آخری جام کا تلچھٹ ہے کدورت میری

دے کے مے پوچھ لیا کرتا ہے ساقی مجھ سے
کیوں نظر آتی نہیں جام میں صورت میری

بیٹھے بیٹھے اٹھ جاتا ہے دل دنیا سے
رہتے رہتے کبھی نکل جاتی ہے حسرت میری

دوست وہ دوست جو مصیبت میں آئے آئے
غم وہ غم جو کرے ہجر میں شرکت میری

اٹھتے اُٹھتے بھی قیامت کا زمانہ ہوگا
حشر یہ ہوگا کہ مٹ جائے گی تربت میری

اور نالہ ہو میری آبلہ پائی مجھ سے
اور کانٹوں میں گھسیٹے مجھے وحشت میری

پھر خزاں آئی دبے پاؤں چلا صحرا کو
پھر بہار آئی اُچھلنے لگی وحشت میری

آپ سے آتے جو وہ آپ ہی آتے بلخی
غیر ہوتی تب فرقت میں نہ حالت میری

غزل دوم

یہ غزل ماہنامہ المصباح پٹنہ مدیر ثاقب عظیم آبادی مرحوم اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ راقم الحروف کو یہ غزل جناب شکیب ایاز کے سعی سے حاصل ہوئی۔

محبت پاؤں پڑی ہے رہا جاتا ہے دل اپنا
قدم اس راہ میں کیوں کر بڑھائے پا بہ گل اپنا

تمہیں یہ داغ دے تو یہ تمہاری تیرہ بختی ہے
ہمارا رنگ و روغن کیا ہی چہرہ پہ تل اپنا

دل ناکام مقتل دیکھ کر یوں بیٹھ جاتا ہے — کہ جیسے انجمن میں سر اٹھائے مضمحل اپنا

گلا گھٹتا ہے ہجر یار میں وحشت اچھلتی ہے — ہر اک تار گریباں بن گیا پتھر کی سل اپنا

امیدیں تیل ٹپکاتی ہیں دل پر چشم حسرت سے — چراغ زیست بجھتے بجھتے پھر ہے مشتعل اپنا

عدم سے کچھ نہیں چل دیکھ لو منہ پھیرتے کیوں ہو — زمانہ چاہتا ہے اک ٹھکانا مستقل اپنا

ہجوم یاس ہے درد و الم ہے رنج فرقت ہے — کہاں جائے یہ سب سامان لیکر منتقل اپنا

کسی کے ظلم پنہاں سے ہے اک چکر زمانے کو — سہارا ڈھونڈتا پھرتا ہے ہر یک منتقل اپنا

بنایا ہے ازل نے اس کو پچھاڑا دلفگاروں کا — تمہارے دل کا کیوں پیوند ہو عہد گسل اپنا

نکل کر خانۂ دل سے کہوں کیا مجھ پہ کیا گذری — اسی گھر سے کہیں تھا ہم نشیں گھر متصل اپنا

نہ سنتا کچھ نہ سنتا یہ تو ہم کو لوگ کہتے ہیں
نظام الدین بلخی کہہ رہا ہے حال دل اپنا

غزل سوم

میری بلا سے کوئی دوست یا عدو نکلے — طریق عشق میں سرگرم جستجو نکلے

کسی کے منہ سے کبھی آپ تم نہ تو نکلے — کہیں جنون میں جو مجنوں کے منہ سے ہو نکلے

زبان لے ہی چکا تھا زبان بھی دیدی — اب اس کو کیا کرے دل کوئی جو حیلہ جو نکلے

فراق یار میں پتہ بھی ہو گیا پانی — کہاں سے آئے رگ جاں میں جو لہو نکلے

بہار عیش کے دن اب کہاں سے آئیں گے — خزاں کے دور میں کیا شوق رنگ و بو نکلے

بھلا ہو پیر مغاں کا سبیل جاری ہے — پیاسے آئے ہیں اچھا سا اک سبو نکلے

ہمارے بعد نہ پوچھو کہ کیا تھا میخانہ — شکستہ جام تو ٹوٹے ہوئے سبو نکلے

مکاں کی قید نہیں لامکاں کی شرط نہیں — وہی بہشت ہے اپنی جہاں پہ تو نکلے

دم اخیر ہے اللہ توبہ و استغفار — گناہگار ہوں بس منہ سے تو ہی تو نکلے

یہ آرزو ہے کہ اب دل میں آرزو نہ رہے — نیاز مندوں کی اتنی تو آرزو نکلے

نکل کے دیکھ چکیں حسرتیں تو حشر اپنا — اب آرزو کی تمنا ہے آرزو نکلے
کبھی کسی کو تمہارا سراغ کچھ نہ ملا — تمہارے چاہنے والے جو چار سو نکلے
ہماری خاک کا دنیا میں کیا ٹھکانہ ہے — صبا تلاش میں ناحق نہ کو بہ کو نکلے
ہماری فصد نہیں اپنی فصد لے جرّاح — تپ درون رگ جاں سے کب لہو نکلے

چلا ہے شوق شہادت میں آج پھر بلخی
الٰہی کوچۂ قاتل سے سرخرو نکلے

سید شاہ قمر الدین بلخی

فصیح الدین بلخی مرحوم کے چچا زاد بھائیوں میں جناب قمر الدین بلخی بھی شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ جناب قمر الدین بلخی مرحوم جناب شرف الدین بلخی مرحوم کے صاحبزادے تھے، آپ کی ایک غزل رسالہ "تحفۂ بہار" بابت فروری ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی جو درج کی جاتی ہے۔ آپ شاعری میں اپنا تخلص قمر فرماتے تھے۔ غزل کے اشعار خود ثابت کریں گے کہ آپ کتنا اعلیٰ شعری مزاج رکھتے تھے، غزل یہ ہے ؎

ایک تیرے ہی نہ ہونے سے ہے ویراں کیسا — یعنی سونا نظر آتا ہے شبستاں کیسا
تیری عقل پہ بجلی گری آفت ٹوٹی — دل کے داغوں میں ہوا سوختہ ساماں کیسا
کوچۂ یار جو جنت میں کبھی یاد آیا — مجھ سے جھگڑا کیا دربانِ رضواں کیسا
حوصلے دل کے ہوئے پست ہجوم غم سے — بوجھ سر پہ گرایا شب ہجراں کیسا
خون دل پیتا ہوں میں مئے احمر کی عوض — ہے یہ انصاف ترا ساقیٔ دوراں کیسا
دل، جگر دونوں ہی چھیدے ہیں نگہ کے پیکاں — ناوک انداز ہوا دیدۂ جاناں کیسا
سچ ہے وابستہ مکیں سے ہے مکاں کی رونق — بن ترے محبلۂ دل ہو گیا ویراں کیسا
روبرو وہ رخ روشن کے جو ہوتا ہے کبھی — زرد پڑتا ہے رخ مہر درخشاں کیسا
عرض حال دل غمگیں جو سنا اس نے قمر — تمتما جاتا ہے اس کا رخ تاباں کیسا

رفیع الدین بلخی

فصیح الدین بلخی مرحوم کے بھتیجے جو ان کے بڑے بھائی جناب حفیظ الدین بلخی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے یعنی جناب سید رفیع الدین بلخی کا نام بھی ادبی دنیا میں خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ موصوف پٹنہ کے ایک مشہور قانون داں تھے۔ اپنے پیشۂ قانون میں رہنے کے باوجود علم و ادب سے خاص شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ غالب کی شاعری اور فن سے متعلق موصوف نے ایک کتاب "تجزیہ کلام غالب" لکھی، یہ کتاب پاکستان کے ایک ادبی ادارہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آف پاکستان ایجوکیشنل کالونی کراچی سے شائع ہوئی، اس کتاب کو شائع کرنے کا سہرا پاکستان کے ایک مشہور علم دوست جناب سید الطاف بریلوی کے سر ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ جناب سید علی حسنین زیبا ردولوی نے لکھا۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں غالب کی شاعرانہ مقبولیت سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں غالب کی عشقیہ شاعری سے متعلق خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں غالب کے نظریۂ زندگی کی نشاندہی کی گئی ہے اور چوتھے حصہ میں غالب کے مضامین فلسفہ کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

یوں تو آج غالب کی شاعری سے متعلق اردو کے نامور ناقدوں اور محققوں نے اپنے اشہب قلم دوڑائے ہیں جن کا تعلق ہند و پاک سے ہے، مثال کے طور پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم، پروفیسر احتشام حسین مرحوم، پروفیسر مجنوں گورکھپوری مرحوم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم، جناب ظ۔ انصاری، ڈاکٹر خورشید الاسلام کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں اور محققوں میں جناب قاضی عبدالودود مرحوم، جناب امتیاز علی خاں عرشی مرحوم اور جناب کالی داس گپتا رضا کی شخصیتیں قابل احترام ہیں، لیکن یہ کتاب غالب کی شاعری سے متعلق ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، پوری کتاب ڈیمائی سائز پر دو سو آٹھ (۲۰۸) صفحات پر مشتمل ہے۔

رفیع الدین بلخی کے قریبی دوستوں میں جناب محمد ایوب ایڈوکیٹ مرحوم، علامہ جمیل مظہری مرحوم، جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم اور جناب سید جعفر امام مرحوم کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا آزاد سبحانی جب بھی پٹنہ تشریف لاتے تھے تو موصوف سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔

افسوس یہ ہے ایسے قیمتی وجود کا بہت جلد خاتمہ ہوگیا اور صرف ترپن (۵۳) سال کی عمر میں ۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ آپ کے انتقال پر ملال پر بزم احباب پٹنہ اور دوسرے اداروں نے جلسہ ہائے تعزیت میں اظہار غم واندوہ کی تجاویز منظور کیں اور ان کے شعراء احباب نے قطعات تاریخ وفات لکھے۔ اس موقع پر علامہ جمیل مظہری مرحوم نے جو درد انگیز نظم تحریر فرمائی وہ درج ذیل ہے ؎

حیف اے ساقی میخانۂ اخلاص رفیع — بزم احباب ہے اک بزم عزا تیرے بعد

شام اجڑی ہوئی بیوہ کی طرح سوگ نشیں — جام ابلے ہوئے مینا سے خفا تیرے بعد

کس قدر سست ہے آہنگ نوائے ہر ساز — کس قدر گنگ ہے محفل کی فضا تیرے بعد

موت نے ہم سے تجھے لے ہی لیا آخرکار — ہوئی رسوائی ناموس وفا تیرے بعد

بجھ گیا ولولۂ دوست نوازی اے دوست — کیا جئے حوصلۂ مہر و وفا تیرے بعد

وائے محرومیٔ جذبات خلوص و ایثار — وائے افسردگی صدق و صفا تیرے بعد

جمع ہوں آکے جہاں مختلف الذوق احباب — آج ایسا کوئی مرکز نہ رہا تیرے بعد

یاد آیا ہمیں بے ساختہ غالب کا وہ شعر — جس کے الفاظ کو مفہوم ملا تیرے بعد

تو تھا گلدستۂ احباب کی بندش کا گیاہ
منتشر ہوگئے تیرے رفقا تیرے بعد

یوسف الدین بلخی باطن

جناب یوسف الدین بلخی باطنؔ مرحوم بلخی صاحب مرحوم کی بڑی ہمشیرہ بی بی مریم مرحومہ کے منجھلے صاحبزادے تھے، آپ کے والد بزرگوار کا نام عبدالحی بلخی تھا، آپ کا وطن موضع سائیں ضلع پٹنہ تھا، انہوں نے اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کی اور ایم۔ اے اردو فارسی میں کیا۔ کافی دنوں تک مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ملازمت سے منسلک رہے۔ اس کے بعد آپ کی بحالی گورنمنٹ رانچی کالج رانچی میں بحیثیت لکچرر اردو فارسی ہوئی، جہاں سے آپ نے ریٹائر کیا۔ موصوف علم و ادب میں اچھا خاصہ ذوق رکھتے تھے۔ موصوف کے ادبی مضامین صوبہ بہار کے مختلف رسالوں میں گاہے گاہے شائع

ہوتے تھے۔ شاعری کی طرف بھی آپ کی طبیعت کا میلان تھا اور باطن تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا وصال ۱۹۷۲ء بمقام جمشید پور ہوا۔ (باقی باطن بلخی صاحب)

ڈاکٹر سید محمد اسحاق بلخی واقف

سید محمد اسحاق بلخی مرحوم فصیح الدین بلخی مرحوم کی بڑی ہمشیرہ بی بی مریم مرحومہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام عبدالحی بلخی تھا۔ موصوف کا وطن موضع سایئں ضلع پٹنہ تھا۔ ڈاکٹری پیشہ سے منسلک رہنے کے باوجود موصوف شعر و شاعری سے خاص دلچسپی رکھتے تھے تقسیم ہند کے بعد آپ سابق مشرقی پاکستان تشریف لے گئے،" موذی مرض سرطان میں مبتلا ہوئے چنانچہ علاج کے سلسلہ میں انگلینڈ بھی تشریف لے گئے۔ لیکن عمر کی لگ بھگ پچاس منزلیں طے کر چکے تھے کہ آپ کا انتقال ۱۹۶۵ء میں ہو گیا، جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے ان کی طبیعت نظم نگاری کی طرف زیادہ مائل تھی اور اپنی نظموں کو موصوف مسدس کے پیرایہ میں پیش کرنے میں مہارت رکھتے تھے چنانچہ ان کی شاعری میں میرانیس اور چکبست کا نمایاں رنگ موجود ہے، جناب احمد اللہ ندوی نے اپنی کتاب تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد ششم میں (یہ جلد ضمیمہ کی شکل رکھتی ہے) آپ کا ذکر کیا ہے۔ اسحاق بلخی شاعری میں اپنا تخلص واقف فرماتے تھے، آپ کی ایک نظم بعنوان (پریم) رسالہ فطرت راجگیر جولائی ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی جو درج ذیل ہے ؎

پریم

نہ سمجھا ہے کوئی اب تک نہ سمجھے گا کہ کیا ہے یہ کسی کی کشتی عمر رواں کا ناخدا ہے یہ
کبھی تو عاشقوں کے خانۂ دل کی ضیا ہے یہ کبھی راحت، کبھی آفت، کبھی رنج و بلا ہے یہ
کوئی گرداب کہتا ہے کوئی ساحل سمجھتا ہے
کوئی وادی، کوئی صحرا کوئی منزل سمجھتا ہے
کبھی یہ باعث جور و جفائے آسمانی ہے کبھی وجہ سرور و انبساط و شادمانی ہے
سکون قلب پیری ہے بزور نو جوانی ہے کسی کی موت کا باعث کسی کی زندگانی ہے

غم و اندوہ و یاس و ناامیدی کا سبب ہے یہ
بنائے آفت ظلم و ستم قہر و غضب ہے یہ

دل مشتاق میں بنتا ہے گھر تیر نظر بن کر — کبھی تو درد دل بنکر کبھی زخم جگر بن کر
بھڑکتا ہے کبھی سینہ میں ہر سو یہ شرر بن کر — منور دل کے کاشانے کو کرتا ہے قمر بن کر

زبان شوق پہ حرف تمنا بن کے آتا ہے
کبھی یہ برق بن کر دل کے خرمن کو جلاتا ہے

کبھی ہوتا ہے ظاہر آنکھ سے سیل رواں بن کر — چھپا رہتا ہے سینہ میں کبھی سوز نہاں بن کر
کبھی آتشکدے میں دل کے رہتا ہے دھواں بن کر — کبھی تو ٹوٹ پڑتا ہے یہ سر پر آسماں بن کر

کسی کو اس سے حاصل گوہر مقصود ہوتا ہے
کوئی اس کی بدولت نیست و نابود ہوتا ہے

اسی نے خون کے آنسو رلایا پیر کنعاں کو — جلاتا ہے یہ اپنی آگ میں شمع شبستاں کو
اسی کا فیض پاتا ہوں نگاہ خستہ ساماں کو — جبیں کو چشم کو ابرو کو اور ہر زلف پیچاں کو

مئے پرجوش ہے یہ دل کے پیمانے میں رہتا ہے
حرم میں، دیر میں، کعبہ میں بت خانے میں رہتا ہے

اسی میں مبتلا پاتا ہوں میں شیخ و برہمن کو — یہ وہ جذبہ ہے جو رہبر بنا دیتا ہے رہزن کو
سکھاتا ہے نئے طرز ستم یہ چشم پرفن کو — ادا کو ناز کو انداز کو شوخی کو چتون کو

یہ وہ طاقت ہے جس نے آگ کو گلشن بنا ڈالا
دل تاریک کو آئینہ روشن بنا ڈالا

عموماً ابتدا میں یہ سرور انگیز ہوتا ہے — غضب ڈھاتا ہے جب یہ آگ بنکر تیز ہوتا ہے
یہی تو انتہا میں گریۂ خوں ریز ہوتا ہے — جنوں افزا ستم پرور قیامت خیز ہوتا ہے

ملاحظہ ہو رسالہ فطرت راجگیر، جولائی ۱۹۳۴ء

جو اس کا زخم کھاتا ہے ہمیشہ یاد کرتا ہے
کبھی نالہ کبھی گریہ کبھی فریاد کرتا ہے

کبھی یہ رحم کرتا ہے کبھی بیداد کرتا ہے — دل ویراں کو آ کر یہ کبھی آباد کرتا ہے
کبھی یہ خانۂ آباد کو برباد کرتا ہے — نئی صورت ستم کی دمبدم ایجاد کرتا ہے

نئے اس کے مظالم ہیں نرالے جور ہیں اس کے
مگر رحم و کرم کے بھی طریقے اور ہیں اس کے

بتاؤں کیا تمہیں اس کا اثر کس سرزمیں تک ہے — دل آفت رسیدہ ہے نگاہ شرمگیں تک ہے
غرض یہ ہے کہ فرش خاک سے عرش بریں تک ہے — جہاں مرغ تصور جا نہیں سکتا وہیں تک ہے

جو ڈوبا اس سمندر میں نہیں پھر وہ ابھرتا ہے
اسی کی ہے بقا لیکن جو اس میں ڈوب مرتا ہے

اگر اس کی ضیا سے دل سراپا نور ہو جائے — تو سینہ میں یقیناً جلوۂ صد طور ہو جائے
جو اس جذبہ سے دل انساں کا معمور ہو جائے — مصیبت برطرف ہو جائے آفت دور ہو جائے

یہی قیس بیاباں کے دل رنجور میں بھی تھا
یہی در پردہ پنہاں نعرۂ منصور میں بھی تھا

نہ پوچھ اب اے مرے ہمدم اثر اس کا کہاں تک ہے — اسیر زلف کے حق میں تو مرگ ناگہاں تک ہے
عدم سے بحر ہستی تک زمیں سے آسماں تک ہے — غرض ناچیز بندے سے خدائے دو جہاں تک ہے

خدایا پریم کی تو کاش دنیا ہی بنا دیتا
کلیسا کا حرم کا دیر کا جھگڑا مٹا دیتا

جناب مولوی احمد اللہ ندوی اپنی کتاب تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد ششم میں جناب اسحاق بلخی واقف صاحب کے متعلق یہ لکھتے ہیں۔

لہ "سید محمد اسحاق بلخی واقف متوطن موضع سائیں ضلع پٹنہ ایک خوش گو شاعر ہیں"۔

لہ ملاحظہ ہو تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد ششم مصنفہ مولوی احمد اللہ ندوی

جناب احمد اللہ ندوی نے اپنے تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد ششم میں واقف بلخی کی ایک نظم پیش کی ہے جس کو شاعر موصوف نے لندن کے ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی، یہ نظم شاعر نے اپنی صاحبزادی کی رخصتی کے موقع پر پڑھی تھی۔ اس نظم میں جذبات نگاری کی ایک کامیاب مثال ہمیں ملتی ہے ؎

صبحِ وداع

نسیم صبح چلی ہے کہ باد صرصر ہے چمن میں مائل پژمردگی گل تر ہے
پہاڑ رنج والم کا دل حزیں پر ہے صبا نہ چل کہ یہ وقت وداع دختر ہے

نہ زندگی میں مسرت نہ لطف جینے میں
تڑپ رہا ہے دل بے قرار سینے میں

یہ سبزہ زار یہ ٹھنڈی ہوا ارے توبہ چمن، یہ پھول، یہ کالی گھٹا ارے توبہ
یہ دلفریب سماں یہ فضا ارے توبہ خدا کے واسطے ان کو ہٹا ارے توبہ

دم وداع ہے واقف دم سرور نہیں
یہ صبح وہ ہے کہ خورشید میں بھی نور نہیں

ابھی تو طفل تھی آغوش میں یہ پلتی تھی یہ کل کی بات ہے گھٹنوں کے بل یہ چلتی تھی
ابھی ہنسی، ابھی روئی، ابھی مچلتی تھی ابھی تو چند کھلونوں سے یہ بہلتی تھی

سمند وقت کہاں سے کہاں یہ جا پہنچا
خدا کی شان کہ وقت وداع آ پہنچا

گلے سے ماں نے لگایا لگا کے چھوڑ دیا خود اپنے ہاتھ سے شیشے کو اپنے توڑ دیا
کسی نے جسم کا آنکھوں سے خوں نچوڑ دیا کسی نے ماں کی محبت کو بھی جھنجھوڑ دیا

مکیں تو رو ہی رہے ہیں مکاں بھی روتا ہے
نقاب ابر کی ہے آسماں بھی روتا ہے

یہ جانتا ہوں کہ دختر تو میرے گھر کی نہیں تو چند روز کی مہماں ہے عمر بھر کی نہیں

پدر کے گھر میں پلی ہے مگر پدر کی نہیں ۔۔۔ یہ گرچہ لخت جگر ہے مگر جگر کی نہیں

پلی یہاں تو وہاں جا کے گھر بساتی ہے
کہ آشیاں سے چلی ہے چمن کو جاتی ہے

چمن میں سرو بھی قمری بھی اور خار بھی ہے ۔۔۔ خزاں کا دور بھی ہے موسم بہار بھی ہے
نگاہ شوق بھی ہے چشم اشکبارہ بھی ہے ۔۔۔ گل شگفتہ بھی ہے عندلیب زار بھی ہے

چمن میں دانہ بھی صیاد بھی ہے دام بھی ہے
کھلی فضا بھی اسیری کا انتظام بھی ہے

قدم قدم پہ نشیب و فراز ہستی کا ۔۔۔ نفس نفس پہ ہے سوز و گداز ہستی کا
کلی کلی میں ہے پوشیدہ راز ہستی کا ۔۔۔ سنبھل سنبھل کہ سفر ہے دراز ہستی کا

سفر نیا ہے نئی منزلیں نئی راہیں
ہے رہنما بھی نیا اور نئی گذرگاہیں

الٰہی اس کی مسرت کو جاوداں کر دے ۔۔۔ یہ جس زمیں پہ رہے رشک آسماں کر دے
ملیں جو راہ میں کانٹے تو گلستاں کر دے ۔۔۔ زمیں کے ساتھ فلک کو بھی مہرباں کر دے

تری اماں میں شام و سحر رہے یارب
نگاہ لطف و کرم عمر بھر رہے یارب

بقول عم محترم سید غلام بدر الدین[1] مقیم کراچی پاکستان نے راقم کو ملاقات کے دوران اس امر کی اطلاع دی کہ واقف مرحوم اپنے کلام کی اصلاح اپنے منجھلے ماموں جناب راز بلخی سے لیتے تھے چنانچہ چھان بین کے نتیجے میں راقم کو جناب واقف بلخی مرحوم کا ایک خط بنام راز بلخی مرحوم دستیاب ہوا، موصوف نے یہ کلام بذریعہ خط اپنے منجھلے ماموں کی خدمت میں ارسال کیا تھا چنانچہ اس خط کے ذریعے واقف بلخی مرحوم کی غزلوں کے چند اشعار دستیاب ہوئے جو ہدیۂ ناظرین ہیں۔

---

[1] سید غلام بدر الدین اسحاق بلخی کے اپنے خالہ زاد بھائی ہیں۔

۸۹۶

بانکی پور

۲۷ر اپریل بروز دوشنبہ ۱۹۳۱ء

جناب امول صاحب

بعد ادائے آداب و تسلیمات کے عرض خدمت ہے کہ آپ کے ارشاد کے مطابق ہم اپنی غزلوں کے چند منتخب اشعار آپ کی خدمت میں بھیجتے ہیں، ان میں جنکو جنکو آپ مناسب سمجھیں اپنی کتاب میں تحریر فرمائیں۔

جواب خط تو یوں لیکر کبھی میرا نہ آتا ہے
مگر گیا ہے جو قاصد آج بیتا با نہ آتا ہے

چڑھائے آستیں چیں بر جبیں خنجر بکف برہم
ہمارے قتل کو یوں قاتل مستانہ آتا ہے

جو پیتا ہوں تو مشکل ہے نہ پیتا ہوں تو مشکل ہے
ملا کر مئے میں کچھ ساقی نئے پیمانہ آتا ہے

رہیگی توبہ بھی قائم یہ مجھ سے کب توقع ہے
کہ رہ رہ کر خیال بادہ و پیمانہ آتا ہے

کہیں کا بھی نہ رکھا اس دل بیتاب نے مجھکو
جہاں جاتا ہوں سب کہتے ہیں وہ دیوانہ آتا ہے

بیان جس شخص سے کرتا ہوں رو دیتا ہے وہ سنکر
مجھے اے ہمنشیں بس ایک ہی افسانہ آتا ہے

نکلواؤ نہ مجھ کو بزم سے کیونکہ یہ فطرت ہے
جہاں پر شمع ہوتی ہے وہیں پروانہ آتا ہے

کون شاہد ہے یہاں داور محشر اپنا
نہ تو پہلو میں ہے دل اپنا نہ دلبر اپنا

زیر خنجر مجھے قاتل نے تڑپنے نہ دیا
یہی احسان جتاتا رہا مجھ پر اپنا

راہ الفت میں جہاں وادی پرخار بھی ہے
آبلہ پاؤں کا بن جاتا ہے بستر اپنا

کوچہ یار میں ہر نقش قدم کے آگے
برسوں سجدے میں جھکائے رہے ہم سر اپنا

طوالت کے پیش نظر نظم برق کے دو بند نہیں پیش کئے گئے۔

داستاں غیر کی چھیڑی تھی کہ وہ سن لیں گے
حال دل اس میں بیاں کر دیا اکثر اپنا

چڑھاؤ آستیں اپنی سمیٹو اپنے دامن کو
یہ کہہ کر رکھ دیا ہم نے تہ تیغ اپنی گردن کو

نہ نکلی ایک بھی حسرت کہوں کیا چشم پر فن کو
جلایا برق بنکر اس نے میرے سارے خرمن کو

سیہ زلفیں نہیں اس سیمتن کے عارض گل پر
نگہباں حسن کی دولت کا سمجھو کالی ناگن کو

یہ آتی ہیں صدائیں عشق کی پر خار وادی سے
قدم اس راہ میں رکھنا بچا کر اپنے دامن کو

خوشی سے قتل واقف کو کرو لیکن قسم کھالو
دکھاؤ گے نہ اپنی شکل پھر تم میرے دشمن کو

مذکورہ بالا سطور میں خاندان بلخیہ کے بزرگان دین، عالموں اور ادیبوں کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا جن کی ذات سے ہماری علمی و ادبی دنیا مرہون منت ہے۔

بقیہ باطن بلخی

جناب یوسف الدین بلخی کی ایک کتاب "بہار لغت" کے عنوان سے کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو کتب خانہ کے موجودہ ڈائرکٹر محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں یوسف بلخی کے چند تاثرات کتاب کے متعلق ملتے ہیں۔

پوری کتاب ڈیمائی سائز میں لگ بھگ ایک سو آٹھ صفحات پر محیط ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں بہاری الفاظ مع معانی پیش کئے گئے ہیں۔ دوسرے میں بہاری محاورات اور ضرب المثل کو مع معنی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ لگ بھگ اسّی صفحات پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ لگ بھگ اٹھائیس صفحات پر محیط ہے۔ بحیثیت مجموعی یوسف بلخی مرحوم کا یہ ایک نہایت ہی لسانی تخلیقی کارنامہ ہے اب تک اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

نسب نامہ پدری و مادری

بلخی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے پروفیسر آدم بلخی کا ایک خط ماہنامہ "صنم" پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ رسالہ کے مدیر نے بلخی صاحب کی سوانح عمری سے متعلق کچھ باتیں صاحب مکتوب سے دریافت کی تھیں، انھیں کا جواب مطبوعہ اس خط میں ہے اس سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ بلخی صاحب کا سلسلۂ نسب نسل در نسل حضرت علی کرم اللہ وجہ سے جا کر ملتا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنا تیار کیا ہوا نسب نامہ بطور یادگار چھوڑا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس وقت بلخیوں کی آمد ہندوستان میں ہوئی، تغلق خاندان کی حکومت اس ملک میں تھی، مرحوم کا ترتیب کردہ نسب نامہ جو موجود ہے اس میں مولانا مظفر بلخی سے اوپر صرف ایک نام درج ہے، لہٰذا ان میں سے جن کی ایک سے زیادہ اولادیں ہوں گی ان کے بارے میں کچھ کہنا سردست مشکل ہے۔ یہاں یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نسب نامہ نسل در نسل چلا آرہا ہے اور اس کے درست ہونے کے لئے بلخی صاحب نے چھان بین کی تھی اور مندرجہ ذیل کتابوں سے تشفی کر لی تھی۔

۱۔ فوائد المریدین و ملفوظات مطلوب المبارک ملفوظ مولانا شیخ آبری

۲۔ رسالہ مؤلفہ حضرت شاہ عبداللہ

۳۔ کتاب واقعات حکومت دہلی مؤلفہ مولوی بشیرالدین دہلوی

۴۔ تاریخ فیروز شاہی مؤلفہ ضیاءالدین برنی

۵۔ طبقات ناصری مؤلفہ قاضی منہاج الدین سراج

۶۔ کتاب الغانی از ابوالفرح علی بن الحسن

۷۔ تاریخ کبیر

۸۔ طریق حقائق از ابو معصوم علی شاہ شیرازی

۹۔ ربیع الامرا از مخشری

۱۰۔ تاریخ کامل از امین اللہ الاشیر

۱۱۔ ملخص الآثار

۱۲۔ مجالس المومنین از سید نوراللہ

۱۳۔ تاریخ گزیدہ

۱۴۔ نفحات الانس از ملا عبدالرحمٰن جامی

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابوں سے بھی بلخیوں کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے اس نسب نامہ کی ترتیب میں ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔

۱۔ آثار شرف مؤلفہ خان بہادر نورالحسن شیرگھاٹی۔

۲۔ سیرت الشرف مؤلفہ خان بہادر سید ضمیرالدین عظیم آبادی۔

۳۔ کنز الانساب مؤلفہ مولوی کریم الدین

خاندان بلخیہ کا مختصر ذکر کرنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ نسب نامہ درج کیا جائے۔ ذیل میں سلسلۂ نسب، کو نسل درنسل درج کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے پدری نسب نامہ درج کیا جاتا ہے اس کے بعد مادری سلسلہ نسب جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ مرحوم کی والدہ بی بی ہاجرہ مرحومہ سے جاتے ہوئے یہ سلسلہ ملا عبدالشکور ابن رکن الدین سے ملتا ہے جو حضرت تاج فقیہہ فاتح منیر کی اولاد میں تھے اور جن کا ذکر بلخی صاحب نے تاریخ مگدھ میں درج کیا ہے۔

نسب نامہ پدری

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

سیدنا امام مظلوم حسین رضہ

سیدنا امام زین العابدین رضہ

سیدنا امام علی اصغر رضہ

سیدنا امام قاسم رح

امیر سید محمد

امیر سید زید

امیر سید اسحاق

امیر سید احمد

امیر سید احد

امیر سید یعقوب

امیر سید محمد

سیدنا ناصر الدین

امیر سلیمان

سیدنا ابراہیم ادہم بلخی رح

سیدنا سلطان محمود بلخی

سیدنا سلطان سراج الدین

سیدنا حمید بلخی

سیدنا علی بلخی

جناب سیدنا شمس الدین بلخی قدس سرہٗ

در زماں سلطان محمد تغلق عہدہ در دیوان شاہی داشتند

مولانا سید قمر الدین بلخی | مولانا سید معز بلخی | حضرت مولانا سید برہان الدین بلخی

حضرت مولانا سید برہان الدین بلخی
مظفر حسین خلیفہ حضرت
مخدوم شرف الدین بہاریؒ

مولانا سید معز بلخی

حضرت مخدوم نوشہ توحید بلخی
سجادہ نشین حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاریؒ

مخدوم حسن بلخی

مخدوم احمد المعروف بہ لنگر دریا بلخی

مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی

مخدوم شاہین بلخی

مخدوم ابراہیم بلخی

مخدوم جنید بلخی

دیوان سید معین الدین بلخی

حضرت دیوان معمور شاہ بلخی

حضرت فخر الاسلام بلخی

مخدوم سید شاہ فہیم اللہ بلخی

قاضی سید طہارت التوحید بلخی

سید محمد واجد بلخی

مولوی ڈاکٹر سید غیاث الدین بلخی

مولوی فصیح الدین بلخی

پدری سلسلہ نسب جو درج ہے اس کے درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں اس لئے کہ میں نے خاندان کے مکمل نسب نامہ سے نقل کرنے کے بعد مرحوم کی نوٹ بک میں درج ذیل سلسلہ پدری سے ملا لیا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم نے اپنے بڑے بھائی حفیظ الدین بلخی کے لوح مزار کے لئے جو قطعہ تاریخ کہا ہے وہ بھی ان کے نوٹ بک میں درج ہے اور اس نوٹ بک میں ان کے ہاتھ کا تحریر کردہ سلسلہ نسب بھی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے درست ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔

مادری سلسلہ نسب کا جہاں تک تعلق ہے اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ سلسلہ حضرت تاج فقیہہ تک پہنچتا ہے اس کی تصدیق پروفیسر نادم بلخی نے مولانا سید عبدالرؤف ندوی مرحوم سے موصوف کی زندگی میں کر لی تھی۔

مادری نسب نامہ فصیح الدین بلخی مرحوم

ملا رکن الدین منیریؒ

از اولاد حضرت تاج فقیہہ در قصبہ منیر شریف

۱۔ ملا عبدالشکور	۷۔ قاضی امین الحق
۲۔ ملا عبدالحلیم	۸۔ قاضی واعظ الحق
۳۔ ملا عبدالرقیب	۹۔ مولوی سید عبدالحق
۴۔ ملا غلام اشرف	۱۰۔ بی بی مدینہ
۵۔ ملا غلام یحییٰ	۱۱۔ بی بی ہاجرہ اہلیہ ڈاکٹر غیاث الدین بلخی
۶۔ قاضی کمال الحق	۱۲۔ حضرت فصیح الدین بلخی

پیدائش

فصیح الدین بلخی مرحوم کی پیدائش ۱۸۸۵ء کی ہے۔ اس کے درست ہونے کے سردست تین ثبوت ہیں۔ مرحوم کے انتقال کے قبل جبکہ نادم بلخی کا مجموعہ کلام "آغاز سحر" کا مقدمہ مہجور شمسی مرحوم سپرد قلم فرما رہے تھے تو انہوں نے خود مرحوم سے سن پیدائش کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق حضرت مہجورؔ نے ۱۸۸۵ء درج کیا تھا۔ دوسرا ثبوت نادم بلخی کے بیان پر مبنی ہے۔ انہوں نے نظام الدین بلخی مرحوم سے جب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا "میری پیدائش ۱۸۸۲ء کی

اور مجھ سے فصیح مرحوم تین برس چھوٹے تھے۔
اس کی ایک دستاویزی سند بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ فصیح الدین بلخی مرحوم کی چھوڑی ہوئی جاگیر
میں جو کتابیں اور کاغذات ہیں ان میں ایک چھوٹی سی نوٹ بک بھی ہے جس میں انہوں نے اپنے
علاوہ اپنے خاندان کے چند افراد، اپنے دوستوں اور عزیزوں کی جنم کنڈلی بناکر رکھ چھوڑی ہے
یہ بھی بلخی صاحب مرحوم کی خود نوشتہ ہے۔ مرحوم کے بنائے ہوئے زائچہ کے مطابق ۱۰ فروری
۱۸۸۵ء مطابق پھاگن ۱۹۱۰ سمت مطابق ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ روز سہ شنبہ بوقت
۳ بجے شب وہ پیدا ہوئے۔ اس زائچہ پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ دراز کا بنایا ہوا ہے۔
جیساکہ سیاہی کی رنگت بتاتی ہے، اس کے بعد اس میں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ملتی ہے
جس کا رنگ تازہ معلوم ہوتا ہے اور جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً انتقال سے کچھ سال قبل کی
تحریر ہے۔ زائچہ پیدائش دلچسپ ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے۔

زائچہ پیدائش فصیح الدین بلخی

۱۰ فروری ۱۸۸۵ء مطابق پھاگن بدی ۱۹۱۰ سمت مطابق ۲۵ ربیع الثانی
۱۳۰۲ھ روز سہ شنبہ دن گذر جانے کے بعد بوقت ۲ بجے شب پیدا ہوئے۔ پچھتر سول ڈنڈا
۱۵ پلا دیر تھا اور اشت کال ۵۰ ڈنڈا ۲۸ پلا جنم کے پہلے بیت چکا تھا اور زنب ۱۵ جن میں
۲۱ دور زنب میں سے چھ برس ۱۰ مہینہ ۳۶ دن ۳۵ ڈنڈا ۳۲ پلا گذر چکا تھا۔ صرف ایک مہینہ
۳۰ دن ۲۴ ڈنڈ ۲۷ پلا باقی تھا مگر ([illegible]) کا سورج ۲۹ انش بیت گیا۔

زائچہ پیدائش فصیح الدین بلخی مرحوم

عطارد
۱۰ مریخ
زہرہ
۹
۸
۱۱ آفتاب
ماہتاب
۷
۱۲
۶
ذنب
راس
۱
۳
۵
۲ زحل
۴
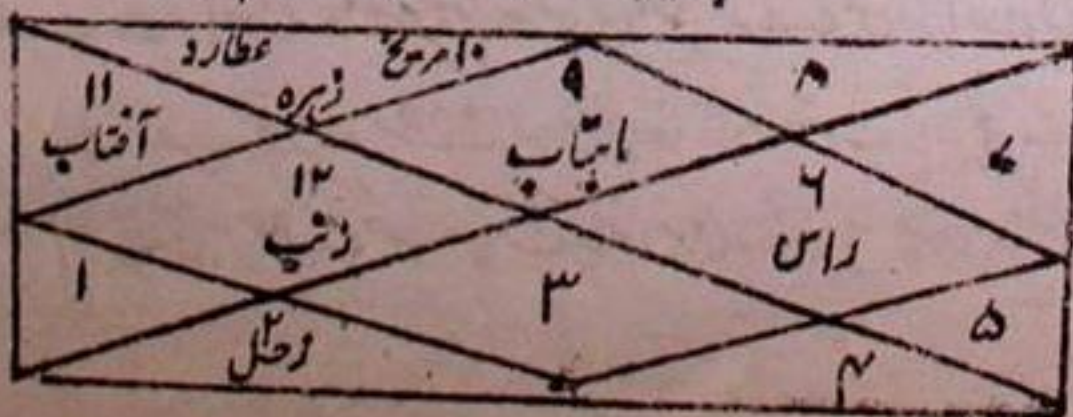
تعلیم و تربیت

فصیح الدین بلخی مرحوم کی ابتدائی تعلیم و تربیت والد بزرگوار کے زیر سایہ ہوئی جو بذات خود عربی و فارسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ حکیم صوفی صاحب کی علمی اندنوں مشہور زمانہ تھی آج شہر عظیم آباد کی دھڑکتی ہوئی چھاتی پر جس عمارت کو بادشاہ محل کے نام سے پکارتے ہیں۔ مرحوم کے عہد طفلی میں حکیم صوفی صاحب کا مدرسہ اور اس سے متصل ان کا دولت خانہ تھا، حکیم صوفی صاحب کے طریقۂ تعلیم کا صرف شہر ہی میں نہیں بلکہ شہر کے باہر اور بیرون صوبہ میں بھی شہرہ تھا۔ ان کی لکھی ہوئی ابتدائی درسی کتابیں دور دور تک چلی ہوئی تھیں۔ خصوصی طور پر ان کی تصنیف کردہ اردو کی ابتدائی کتاب حیدرآباد تک چلتی تھیں، بچوں کے نصاب، اور ان کی دشواریوں کو مدنظر رکھ کر یہ کتاب خاص ڈھنگ پر لکھی گئی تھی۔ ان کی مدرسے بچے اردو، قرآن شریف پڑھنا جلد ہی سیکھ لیتے تھے مرحوم کے سب سے پہلے معلم مرحوم کے والد محترم ہوئے ان کی نگرانی میں تعلیم یافتہ ہو کر صوفی صاحب کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ چنانچہ اردو عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ سے حاصل کی۔ مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کا داخلہ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ہوا۔ اس اسکولی زندگی میں مرحوم کو کھیل کود سے بہت کم رغبت تھی، باتونی، بدخصلت، بد اطوار اور کھلاڑی لڑکوں سے مرحوم کو کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن اپنی ذہانت اور علمیت کے سبب مرحوم اپنے تمام ساتھیوں میں مقبول اور عزیز تھے۔ گھر سے بغل کے نیچے کتاب لے کر اسکول آنا، اسکول میں فرصت کے اوقات کتب بینی میں مشغول رہنا، پڑھائی کے وقت ٹیچروں کی باتوں پر دھیان دینا ان کی طالب علمی کی زندگی کی باتیں تھیں جو عملی طور پر اسکول کے تمام طلباء میں نہیں پائی جاتیں۔

مرحوم کی اسکولی زندگی کے قریب ترین دوست نواب اسمٰعیل عرف ججن تھے جو بعد کو خان بہادر کے خطاب سے بھی سرفراز کئے گئے۔ یہ مرحوم کے کلاس فیلو تھے اور پڑھنے لکھنے کے معاملے میں ان سے کمپیٹیشن رہتا تھا۔ یہ دونوں طالب علموں کی خصوصیت تھی کہ سارے سبجکٹ میں طاق تھے ججن صاحب کا ذکر مرحوم اپنی زندگی کے آخری وقتوں تک کرتے رہے تھے۔ ان کی ذہانت کی تعریف اکثر میں نے مرحوم کی زبان سے سنی ہے۔ ان میں تقریر کا مادہ شروع سے تھا جس کی بنا پر وہ آگے

آگے چل کر اپنی سیاسی زندگی میں ایک مشہور مقرر مانے گئے، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کو تقریر کرنے کا مادہ تھا۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی کتاب "تذکرہ نسواں ہند" میں صفہ ۱۲ تا صفہ ۱۳ گوہر کے پٹنہ آنے کا ذکر کرتے ہوئے جس رئیس کی شادی کا حال لکھا ہے وہ نواب جمّن مرحوم تھے۔ یاد داشت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ مرحوم جمّن صاحب سے چھوٹے تھے جن کی شادی بہت ہی کم عمری میں ہوئی اور اس موقع پر گوہر نے جو غزل گائی تھی وہ مرحوم کے ذہن میں محفوظ رہ گئی جس کا مقطع "نسوان ہند" سے درج کیا جاتا ہے ؎

شاید کہ یاد بھولنے والے نے پھر کیا
ہچکی اسی سبب سے ہے گوہر لگی ہوئی

یہ واقعہ ۱۹۰۲ء کا ہے جبکہ مرحوم کی عمر لگ بھگ ۱۷ سال کی تھی، مرحوم کے والد بزرگوار کا انتقال جس وقت ہوا اس وقت مرحوم کی عمر بہ مشکل پندرہ سال کی تھی۔ انتقال کے بعد چاروں بھائیوں کے منجھلے چچا جو بقید حیات تھے۔ مرحوم کی چھوڑی ہوئی جائداد اور چھ عدد اولادیں (چار لڑکے دو لڑکیاں) کے سرپرست ہوئے لیکن خاندان کے سرپرست اُٹھ جانے کے سبب پہلی جیسی حالت نہ رہی۔ منجھلے اور سنجھلے بھائیوں نے ملازمت کرلی، منجھلے بھائی نے جنہیں ملازمت ناپسند تھی اپنی جائداد پر اکتفا کرلی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا چھوٹے بھائی کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ستانے لگا چنانچہ اپنی قابلیت اور حاصل کئے ہوئے علم کی بنیاد پر کوئی اچھی سی سند حاصل کرنے کا دل میں خیال پیدا ہوا۔ مرحوم نے محمڈن اسکول کس سال میں چھوڑا اس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۰۵ء یا اس سے قبل، چھوڑے ہوئے کاغذات کی چھان بین کرتے وقت محمڈن اسکول کے ہیڈ ماسٹر اعظم علی خاں کا دیا ہوا ایک سرٹیفکٹ ملا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرحوم نے انٹرنس کا امتحان پاس کرلیا تھا بقول نظام الدین بلخی یہ سرٹیفکٹ نہایت بوسیدہ حالت میں ہے۔ زبان انگریزی ہے۔ کہیں کہیں کے حصے کیڑے کے کھائے ہوئے ملتے ہیں۔ نقل درج کی جاتی ہے۔

I know Mr. Fasihuddin Balkhi from his very infancy. He is young gentleman of good parts and .... respectably counted. He has ...... intrane .... of the Calcutta University and has fair knowledge of English, Persian, Urdu and Hindi. He is intelligent enough to do .... all works. So far as I know him he is physically fit for active service and bears a good moral character. I should be glad enough of his getting suitable post. I wish him every success in life.

Date	Azam Ali Khan
Gulzar Bagh	Head Master
31st October	M.A.A School
1905	Patna City

نظام الدین بلخی فرماتے تھے کہ طالب علمی کے دور ہی سے فصیح الدین بلخی مرحوم کو شاعروں کے لئے غزلیں کہنے کا شوق ہوا اور کئی کئی غزلیں کہہ کہہ کے اپنے دوستوں کو بانٹ دیتے تھے "تحفہ بہار" کا اجرا جس وقت ہوا، مرحوم کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سخن فہمی اور سخن سنجی کا شعور مرحوم میں بچپن ہی سے ہو چکا تھا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ والد بزرگوار کی وفات کے بعد خاندان کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مرحوم بھی سن شعور کو پہنچ چکے تھے چنانچہ فکر معاش دامن گیر ہوئی، مرحوم میں سیاحی کا

جذبہ بھی بیدار ہو چکا تھا۔ کیونکہ بچپن ہی سے ورزش اور کشتی لڑنے کے شوق کے علاوہ علم و ادب کا بھی ذوق تھا۔ لہٰذا مرحوم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ایسی نوکری ملے جس میں سپاہی کا بھی موقع نصیب ہو اور پڑھنے پڑھانے کا بھی سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ اس جذبہ کے تحت فوجی رجمینٹل منشی فاضل کا امتحان پاس کر لینا ہی مرحوم نے ضروری سمجھا۔ رجمینٹل فاضل منشی کا امتحان لفٹننٹ کرنل سکریٹری بورڈ آف اکزامینرز فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی زیر نگرانی ہوتا تھا۔ اس کے مراکز ہندوستان کے ان شہروں میں ہوتے جہاں فوجی چھاؤنیاں تھیں، اپنی لیاقت، قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر امتحان دہندہ کو سب سے پہلے سکریٹری صاحب موصوف سے اجازت لینی پڑتی تھی، اجازت مل جانے پر فیس داخل کرنی پڑتی تھی۔ دانا پور کی فوجی چھاؤنی بھی امتحان کا ایک سنٹر تھی۔ ۳ جنوری ۱۹۰۱ء کو صبح ۱۰ بجے سے امتحان شروع ہونے والا تھا، بلخی صاحب مرحوم کے کچھ ملاقاتی بھی اس امتحان میں شریک ہونے والے تھے۔ امتحان ہونے سے دو دن قبل مرحوم کے کچھ دوست ان کے پاس آئے اور کہا کہ صرف تھوڑے روپیوں کی ضرورت ہے امتحان کے سوالات بہ آسانی معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم لوگوں نے آپس میں چندہ جمع کر لیا ہے، تم بھی چندہ دے کر ہم لوگوں کی منڈلی میں شریک ہو جاؤ۔ مرحوم نے فرمایا مجھے آپ لوگوں کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں۔ آپ لوگوں کی جو طبیعت چاہے وہ کیجئے ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس طرح پاس کر کے سند حاصل کرنے سے بہتر ہے کہ انسان امتحان نہ دے۔ مرحوم کے سبھی احباب اس بات پر ناخوش ہوئے آخر سب کے سب گھر لوٹ گئے۔

۳ رجنوری سے امتحان شروع ہوا۔ مرحوم روزانہ امتحان دے کر خوش خوش گھر واپس لوٹتے۔ مرحوم کے ملاقاتیوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے امتحان کے پرچے کیسے گئے ہیں۔ ہاں چہرے سے یہ ضرور ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنے پرچوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ امتحان ختم ہوا، کچھ دنوں کے بعد امتحان کا نتیجہ برآمد ہوا۔ مرحوم نے یہی نہیں کہ اول درجے سے امتحان پاس کیا بلکہ حیرت کی بات ان کے ملاقاتیوں کے لئے تھی کہ سارے امتحان دینے والوں میں مرحوم نے سب سے زیادہ نمبر لایا پہلا پرچہ سو نمبر کا تھا جس میں سوال کی نوعیت کے مطابق انگریزی کی دشوار ترین عبارت کا سلیس

اُردو میں ترجمہ کرنا تھا اس میں مرحوم نے اٹھاسٹھ نمبر لایا، دوسرے پرچہ میں علم بیانیہ کی تحریری عبارت کو علم بول چال کی زبان میں تبدیل کرنا تھا اس میں مرحوم نے تہتر ۷۳ نمبر لایا اور اس طرح دوسرے پرچوں میں بھی فرسٹ کلاس سے بہت زیادہ نمبر لایا، اس امتحان میں نمایاں کامیابی کو مرحوم کی ایک دلچسپ سیر و سیاحت کی حامل زندگی کا ایک حسین باب کہنا چاہیئے۔

ادھر اسپیشل اسٹاف افیسر لفٹننٹ جیمین (G. C. Rek) نے ایک خط ۲۲ جون ۱۹۱۹ء کو داناپور کینٹ سے لکھا لیکن اس درمیان مرحوم نے نارتھ بہار سٹلمنٹ میں قانون گو کی ملازمت اختیار کرلی جیسا کہ اے۔ آر۔ ٹاپلس (A. R. Tapples) والی سی۔ ایس۔ اے، اس۔ جی کی دی ہوئی 3.7.1910 کی سند سے ظاہر ہوتا ہے "مرحوم اپنی اس مختصر سی ملازمت میں ہر دلعزیز ثابت ہوئے۔ جفاکشی، محنت و مشقت، ایمانداری اور کاموں کو بحسن و خوبی انجام دینے کے نتیجے میں ٹاپلس صاحب مرحوم کو بہت مانتے تھے یہ کام مزاج کے مطابق نہیں تھا لہٰذا مرحوم بہت جلد مستعفی ہو گئے۔"

شادی و اولاد

فصیح الدین مرحوم کی دو شادیاں ہوئیں، پہلی شادی جناب سید مظہر حسین مرحوم ساکن محلہ لودی کٹرہ کی صاحبزادی بی بی نور فاطمہ مرحومہ سے ہوئی۔ لیکن ان کی پہلی اہلیہ جلد ہی انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کی دوسری شادی جنگ عظیم سے لوٹنے کے کئی برس بعد ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ دوسری شادی اپنے ہی خاندان میں ہوئی یعنی محلہ دوندی بازار کے ڈاکٹر سید محمد وارث بلخی مرحوم کی منجھلی صاحبزادی بی بی رسولن مرحومہ سے ہوئی۔ دوندی بازار کا یہ گھرانہ جہاں بلخی صاحب مرحوم کی دوسری شادی ہوئی ایک اوسط زمیندار گھرانہ تھا، ساتھ ساتھ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ بہار کے صوفیائے کرام کا گھرانہ تھا۔ بلخی صاحب مرحوم کے خسر محترم ڈاکٹر وارث بلخی فتوحہ کے خاندان بلخیہ سے تعلق رکھتے تھے جن کی شادی بہار کے ایک متقی پرہیزگار اور صوفی منش حضرت مولانا سید امین اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، دوندی بازار کی خانقاہ پورے صوبہ بہار میں دینی تعلیم کے مرکز کی حیثیت رکھتی تھی اور اس خاندان میں حضرت مولانا امیر الحسن، حضرت امین اللہ، حضرت مولانا محامد جیسے صاحب علم بزرگان دین گذرے ہیں۔

بہار کے مشہور شاعر جناب فضل حق آزاد مرحوم نے اسی مدرسۂ دینی سے علم حاصل کیا تھا۔ بزرگان دین جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے آج بھی ابدی نیند اس محلے میں سو رہے ہیں، ان سبھوں کے مزارات اب تک درست حالت میں داتا شاہ یتیم کی درگاہ میں بہ مقام دوندی بازار پٹنہ سیٹی میں موجود ہیں۔

اولاد: پہلی شادی سے بلخی صاحب مرحوم کو اولاد نہ ہوئی، دوسری سے تین اولادیں ہوئیں جن میں دو یکے بعد دیگرے جلد ہی داغ مفارقت دے گئیں۔ ان حادثات کا ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا اور آخر میں ۱۹۲۸ء میں ایک اولاد ہوئی جس کا نام سید محمد ابراہیم بلخی ہے۔ مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم نے اولاد کے روپ میں یہی ایک نشانی چھوڑی جس کو وہ تادم آخر اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

ملازمت

فصیح الدین بلخی مرحوم نے ملازمت کی ابتدا ناردرن بہار سٹلمنٹ میں قانون گو کی حیثیت سے کی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے لیکن چونکہ طبیعت کے موافق یہ ملازمت نہیں تھی لہٰذا مرحوم بہت مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے فوجی ملازمت کی جس کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

قانون گو کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد بلخی صاحب مرحوم نے ملٹری اسکول کرکی میں معلمی کے لئے درخواست دی۔ موصوف کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا، مرحوم تشریف لے گئے اور منتخب کئے گئے۔ یہ ملازمت بہت عرصے تک نہیں رہی محکمہ کے افسر اعلیٰ اف۔ جی۔ ایگن (F. G. Eggen) نے جو ۳۰ جون ۱۹۱۲ء کو انہیں ایک سرٹیفکیٹ دی اس میں درج الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم جون ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک معلم کی حیثیت سے اس اسکول میں رہے۔ مرحوم اس اسکول میں انگریز فوجیوں کو فارسی اور اردو کی تعلیم دیتے رہے۔ اپنے انگریز طالب علموں کے قصے بلخی صاحب مرحوم گھر والوں کو سناتے تھے خصوصی طور پر ان لوگوں کی فارسی دانی اور اردو دانی کے قصے خود بھی لطف لے کر سناتے تھے۔ اپنے ذہین گورے چٹے والے چند انگریز طالب علموں کے بھی قصے سناتے تھے۔ ایک بار اپنے لڑکے (ابراہیم بلخی) کو ان کے بچپن کے زمانے میں مرحوم انگریزی کی درسی کتاب کا سبق دے رہے تھے، انگریزی کا ایک جملہ لڑکے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مرحوم یہ چاہتے تھے کہ لڑکا اپنی ذہانت سے کام لے کر اس جملے کا مفہوم سمجھ لے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ مرحوم اس جملے کا مطلب اسے سمجھا دیں۔ مرحوم نے کہا کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ذہانت سے کام

لے اور فرمایا کہ میں نے پونا ملٹری اسکول میں اپنے انگریز طالب علموں کو انگریزی عبارت اردو میں ترجمہ
کرنے کے لئے دی۔ ایک انگریز یہ نہیں جانتا تھا کہ " Bull " کو اردو میں کیا کہتے ہیں۔ بہرحال اس
بے چارے نے اپنی ذہانت سے کام لیا اس کا ترجمہ "گائے کا شوہر" کر دیا۔ کاپی دیکھ کر تو مجھے بہت ہنسی
آئی لیکن اس کی ذہانت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اس سے بہت خوش ہوا۔ الغرض مرحوم نے ایک سال تک
اس اسکول میں ملازمت کی۔ بلخی صاحب مرحوم کی کتابِ زندگی کا ہر باب یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے
لئے اور خدمتِ خلق کے واسطے بہتر سے بہتر ذریعہ نکالنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ بالغ العمری کے ابتدائی
حصے میں وہ جم کر کبھی بھی نہ رہے۔ ملازمت کے اس پہلو سے اپنے ضمیر کا کبھی سمجھوتہ نہ کرتے جس کے نتیجے
میں انسان غلام بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف انہوں نے اپنے ایک شعر میں اشارہ بھی کیا ہے ؎

خواہاں جو خیر کا ہے وہ دنیا میں یوں رہے
آقا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو

پونا ملیٹری اسکول سے سبکدوش ہو کر وہ اپنے وطن واپس آئے اور چند ہی دنوں کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے
کلکتہ تشریف لانے کے فوراً بعد انہیں فورٹ ولیم کالج میں معلم کی جگہ مل گئی جیسا کہ لفٹننٹ جے۔ اس
کوکس (J. S. Cocks) کی سند سے ظاہر ہوتا ہے، یہاں بھی وہ ہر دلعزیز رہے۔ وہ فرماتے تھے کہ
کلکتہ آنے کے بعد یہاں کی علمی و ادبی ماحول سے براہ راست ان کا واسطہ ہوا جس کے خصوصی طور پر مولانا
ابوالکلام آزاد علمبردار تھے۔ مولانا آزاد مرحوم سے ان کا گہرا رابطہ ہو گیا تھا اور قربت کا سبب خالص علمی و
ادبی تھا، اکثر شام کو ان کے یہاں جاتے رہتے تھے اور علمی و ادبی نکات پر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔
کوکس (Cocks) صاحب بلخی صاحب مرحوم کو بہت مانتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس ملازمت
سے سبکدوش ہوں لیکن بلخی صاحب مرحوم کو سیر و سیاحت کا چسکا لگ گیا تھا۔ ماسوا اس کے اچھی ملازمت
کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا تھا۔ کوکس صاحب نے فورٹ ولیم سے ان کی سبکدوشی پر افسوس
کا اظہار کیا۔ اس کے خواہش مند رہے کہ اگر پھر بلخی صاحب دستیاب ہو جائیں تو فورٹ ولیم کالج کے
ماحول سے ان کا رابطہ قائم کیا جائے ' دل ' کوکس صاحب بلخی صاحب مرحوم سے کس درجہ متاثر تھے
اور کس قدر مانتے تھے اس کا اندازہ ان کی دی ہوئی سند سے ظاہر ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی علمی

درسگاہ میں معلمی کرنے والے کو منشی کہا جاتا تھا۔ فورٹ ولیم کا کالج ۱۸۰۱ء سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ ہم تاریخ ادب اُردو کے حوالے سے جانتے ہیں، یہیں سے گویا اُردو نثر نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انگریزوں نے جتنے بھی یہاں معلم بحال کئے ان کی یہی کوشش رہی کہ ہندوستانی ہندوستان کے گوشے گوشے سے تعلق رکھنے والے اچھے ذی علم اشخاص کا انتخاب ہو، میر امن دہلوی، للولال جی وغیرہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم اس اعتبار سے فورٹ ولیم کالج کے معلموں کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔

فورٹ ولیم کالج میں بلخی صاحب مرحوم بہت دنوں تک نہیں رہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں اس سے نہایت بہتر ملازمت مل گئی یعنی جزیرہ فی جی کے سپریم کورٹ میں ترجمان کی حیثیت سے بلخی صاحب مرحوم کی بحالی ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے افسران بلخی صاحب مرحوم کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لئے کہ ان کی علمیت اور ذہانت و ایمانداری سے بہت متاثر تھے اس کے لئے سکریٹری بورڈ آف اکزامنرس نے اپنے جانتے ایک طرح کی رشوت دی تھی یعنی بلخی صاحب مرحوم کو خوش کرنے کے لئے فورٹ ولیم کے علاوہ انہیں باہر بھی ایک اچھی جگہ دلائی۔ ایشیاٹک پٹرولیم کمپنی ۹ کلایو اسٹریٹ کے افسر اعلیٰ کو پڑھانے کے لئے ایک بہت اچھی ٹیوشن انہیں دلائی تھی۔ اس افسر کا نام الڈر کنگسٹن (Elder Kingston) تھا۔ اس افسر نے مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۲ء کو ایک خط مرحوم کے نام لکھا اس سے اس کی تفصیل ظاہر ہوتی ہے۔

فی جی عدالت عالیہ میں ترجمان کی حیثیت سے ان کی ملازمت خراب صحت کے سبب بہت زیادہ دنوں تک نہ رہ سکی اس کی تفصیل اس باب میں کی جائے گی جس کا تعلق بلخی صاحب مرحوم کے اسفار سے ہے۔ بلخی صاحب مرحوم غالباً ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء کے درمیان جزیرہ فی جی سے لوٹے اور کچھ دنوں تک فکر معاش کے سبب متفکر رہے لیکن جلد ہی انہیں بہار کوآپریٹیو سوسائٹی (نوادہ) میں نگراں کا عہدہ مل گیا اور اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ انہوں نے ایک نئی سند حاصل کرنے کے لئے کوآپریٹیو کورس کا امتحان پاس کر لیا۔

اس عہدہ پر بلخی صاحب مرحوم لگ بھگ دو برسوں تک برقرار رہے، مرحوم کی ایمانداری

اور کارگذاریوں کو حکومت بہار و اڑیسہ نے بہت سراہا جیسا کہ رپورٹ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء سے ظاہر ہوتا ہے۔ الغرض اس محکمہ نے ان کی کارگذاریوں کو سب سے زیادہ لائق تسلیم کیا۔ اس عرصے کے بعد اس ملازمت سے بھی ان کی سبکدوشی ہوئی۔ مرحوم کے چھوڑے ہوئے کاغذات یہ بتاتے ہیں کہ وہ سیوان میں پھر قانون گو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔

پہلی جنگ عظیم اور فصیح الدین بلخی

پونا ملیٹری اسکول اور فورٹ ولیم کے شہرت یافتہ معلم فصیح الدین بلخی مرحوم کو ایک بار پھر فوجیوں کی معلمی پر بلایا گیا۔ بلخی صاحب کو سردست مصر (Egypt) بھیجا جا رہا تھا لیکن فوجی ملازمت ہونے کے سبب معاہدہ کے پیش نظر انہیں دیگر بیرونی ممالک میں ہر جگہ جانے کے لئے آمادہ کیا گیا اور اس ملازمت سے بلخی صاحب مرحوم کب تک وابستہ رہے اور اس سے متعلق کون کون سی دلچسپ معلوماتی باتیں ہیں ان کا ذکر اسفار سے متعلق باب میں کیا جائے گا، فوجی ملازمت سے ۱۹۱۹ء کے اواخر میں بلخی صاحب مرحوم سبکدوش ہوئے اور بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو ان کی اچھی کارگذاریوں کے سلسلے میں حکومت ہند نے قلعہ رہتاس کے قریب ان کو کافی زمین دی۔ بقول نظام الدین بلخی جیسا کہ انہوں نے اپنے بھتیجے نادم بلخی سے کہا تھا لیکن مرحوم چونکہ قناعت پسند اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے ان زمینوں سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا، بلخی صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد معیز الدین خادم بلخی کا ایک مضمون "بہار کی خبریں" میں شائع ہوا تھا اس سے بھی اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ ہندوستان تشریف لانے کے بعد بلخی صاحب مرحوم کو انگریز حکام نے سب ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر جونپور میں انہیں فائز کیا۔ لیکن بعد میں ان کی تقرری سرکل آفیسر کی حیثیت سے ہوئی۔ چنانچہ ۵ دسمبر ۱۹۲۰ء کے پروانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مونگیر میں سرکل افسر ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر ذی ہوش اور ہندوستانی مسلمان علی برادران کی تحریک خلافت سے متاثر تھا۔ گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک اور تحریک خلافت کا ملک کے چپے چپے میں زور تھا۔ مرحوم کے سب سے بڑے بھائی حفیظ الدین بلخی مرحوم

تازندگی نیشنلسٹ (Nationalist) رہے اور بلجی صاحب مرحوم پر ان کی برادرانہ شفقت پدری شفقت کی طرح معلوم ہوتی تھی اس لئے کہ برادر کلاں خورد سے عمر میں لگ بھگ دس سال بڑے تھے۔ بلجی صاحب مرحوم بھی Nationalism کے جذبہ سے کافی متاثر ہوئے چنانچہ انہوں نے انگریزوں کی دی ہوئی نوکری کو ٹھکرا دیا اور جو زمین رہتاس قلعہ کے پاس ملی تھی اسے بھی واپس کر دیا۔ مرحوم کی شریک حیات جن کا انتقال ۱۹۶۸ء میں ڈالٹن گنج میں ہوا فرماتی تھیں کہ مرحوم اسقدر نیشنلسٹ (Nationalist) تحریک سے متاثر ہوئے کہ گھر میں سبھوں کو کھدر پہننے کا حکم دیا۔ جتنے انگریزی لباس تھے انہیں جلا دیا گیا نوکری کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا چنانچہ کچھ دنوں تک گھر کی پونجی کھائی گئی۔ آخر میں بڑے بھائی کے مشورے سے سبھی بھائیوں نے جائداد فروخت کر دی اور بارہ بنکی میں بس سروس شروع کی گئی لیکن دیش بھکتی میں انگریزوں کے مظالم کے آگے یہ بزنس (Business) پنپ نہیں سکا وجہ یہ تھی کہ اس کے لئے ملازم Nationalist تحریک کے سرگرم رکن تھے اور تحریک کی سرگرمی دکھلانے میں حکومت برطانیہ نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس کاروبار کے ختم ہو جانے کے بعد مرحوم اپنے وطن تشریف لائے، معاشی بحران میں سارا خاندان متاثر ہوا۔ ان کی شریک حیات کہتی تھیں کہ یہ زمانہ مرحوم اور ان کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ آخر کار ۱۹۲۶ء میں مرحوم نے ریاست سرائے کیلا میں ملازمت کی۔ ملازمت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم مجسٹریٹ، ریونیو افیسر اور ادمنل افیسر کے عہدے پر فائز رہے۔

مرحوم ۱۹۴۷ء تک سرائے کیلا میں بسلسلہ ملازمت رہے۔ اس عرصے میں افیسر کی حیثیت سے ان کی کارگزاریاں اس قدر مشہور تھیں کہ بیچ بیچ میں دوسرے محکموں نے اسٹیٹ سے گذارش کر کے عارضی طور پر اپنے یہاں رکھا۔ مثال کے طور پر اڑیسہ کا ڈھیکانال اسٹیٹ جس کے مہاراجہ بھی رولنگ چیف تھے۔ انہوں نے ایک بار افیسر کی حیثیت سے سرائے کیلا رولنگ چیف ادت پرتاب سنگھ سے گذارش کر کے انہیں بلایا، خراب نظم و نسق کو سنبھالنے کی ان سے گذارش کی چنانچہ مرحوم لگ بھگ ایک سال تک سرائے کیلا اسٹیٹ سے لی ان (Leeon)

پرڈھیکا نال اسٹیٹ میں رہے۔ اس درمیان حکومت بہار ضلع سنگھ بھوم میں زمین کی پیمائش کا
کام کرا رہی تھی۔ سنگھ بھوم کے ڈپٹی کمشنر ایک انگریز نے بلخی صاحب مرحوم کی کارگذاریوں کو اسٹیٹ
میں دیکھا تھا یہی وجہ ہوئی کہ حکومت بہار نے ایک عرصے تک Land Revenue
Section Officer کی حیثیت سے انہیں سنگھ بھوم کے صدر مقام چائباسہ میں رکھا۔
مرحوم نے اپنی ملازمت کے دوران گویا بادشاہت کا دور گذارا، ان کی خواہش نہ ڈھیکا نال
جانے کی تھی اور نہ حکومت بہار کی درخواست منظور کرنے کی۔ لیکن سرائے کیلا کے رولنگ چیف
سے ان کے تعلقات اس قدر گہرے اور مخلصانہ ہو گئے تھے کہ مرحوم ان کی باتوں کو ٹھکرا نہ
سکے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ایک لمبے عرصے میں بلخی صاحب مرحوم اپنے وطن سے دور
رہے لیکن یہ مطلب نہیں کہ وطن سے ان کا واسطہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ بیچ بیچ میں چھٹیوں اور
تعطیلوں کے علاوہ بلخی صاحب مرحوم پٹنہ تشریف لاتے تھے۔ ان کی تشریف آوری سرکاری
کاموں کے سلسلے میں ہوتی تھی جس کے نتیجے میں اپنے دوستوں سے بھی ملنے کے مواقع فراہم ہوتے
رہتے تھے۔ صاحب علم ہونے کے سبب خصوصی طور پر ایک مورخ اور محقق ہونے کے نتیجے میں ان کا
رشتہ پٹنہ کی مشہور لائبریریوں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، خدا بخش اور سنہا لائبریری سے تھا۔
۱۹۴۷ء میں کوشش کر کے بلخی صاحب مجسٹریٹی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور پنشن حاصل
کی یہ پنشن انہیں تادم مرگ ملتی رہی اور ۱۹۴۷ء کے بعد وہ عظیم آباد تشریف لائے۔ پٹنہ یونیورسٹی
میں شعبۂ مخطوطات کے انچارج کی حیثیت سے اس عہدے پر سفر آخرت سے دو سال قبل تک
یعنی ۱۹۶۰ء تک رہے۔

یہ ایک دلچسپ داستان جو ان کی ملازمت سے تعلق رکھتی ہے اس سے متعلق بہت ساری
باتیں دائرہ تحریر میں آنے سے رہ گئی ہیں اس لئے کہ ان کا ذکر آئندہ کے ابواب میں ضروری سمجھا گیا۔

عام مشاغل

فصیح الدین بلخی مرحوم کے علمی و ادبی مشاغل سے آج کے عظیم آباد کا ادب نواز اور علم نواز

طبقہ بہر حال واقف ہی ہے۔ ان کے عام مشاغل کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے کی بہت ساری دلچسپ باتیں لوگوں کو معلوم نہیں اس لئے کہ بلخی صاحب مرحوم جنھیں لوگ علم کا بحر بیکراں کہتے ہیں، انھوں نے اپنے علوم کا بذاتِ خود کوئی ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بلخی صاحب مرحوم ایک ماہرِ علم نجوم بھی تھے۔ علمی اور ادبی مشاغل کے علاوہ اور بہت سارے مشاغل ان کی زندگی سے وابستہ تھے۔

سائیکل: بلخی صاحب مرحوم کے عہد طفلی کے زمانہ میں سائیکل چڑھنا بہت کم لوگ جانتے تھے۔ بقول نظام الدین بلخی مرحوم یہ واقعہ ۱۸۹۴ء کے لگ بھگ کا ہے۔ اس وقت مرحوم لگ بھگ دس سال کے ہوں گے۔ مرحوم سائیکل سیکھنے کے خواہشمند ہوتے تھے۔ سائیکل کا انتظام ہو گیا۔ مرحوم نے پیڈل پر پاؤں رکھ کر مشق شروع کی اور بہت جلد سائیکل چڑھنا سیکھ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے محلہ کے لڑکوں کو سائیکل چڑھنا سکھایا۔

ورزش: مرحوم کو بچپن ہی سے ورزش کا شوق تھا چنانچہ یہ شوق زمانہ شباب تک قائم رہا لیکن کشتی یا دنگل کے میدان میں کبھی بھی نہیں اترتے۔ پہلوان کے پیچ اور داؤں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اس فن میں شہر کے مشہور پہلوان کھجو استاد سے مرحوم نے پنجہ لڑانے کا فن بھی سیکھا۔ کھجو استاد کی اس وقت شہر میں کافی دھاک تھی۔ شہر کے، بلکہ یوں کہئے کہ صوبہ بہار کے نامی گرامی پہلوان کیگل جوگیان کے نام سے مشہور تھا کھجو استاد کا شاگرد تھا، مرحوم کے زمانۂ شباب کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ورزش سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ کھجو استاد مرحوم کو اور ان کے دوستوں کو ورزش سکھانے کے لئے بخشی محلہ آتے تھے بعد میں حکیم فہیم الدین مرحوم کے یہاں اکھاڑہ بنایا گیا اور مرحوم کھجو استاد سے ورزش سیکھنے کے لئے جاتے تھے۔

تیراکی: مرحوم شناوری میں بلاشبہ ماہر تھے، نادم بلخی کا کہنا ہے کہ اس فن میں ان کے سارے کرتبوں کو دیکھنے کا موقع انہیں ملا، کئی بار دریائے گنگا میں مرحوم کے ساتھ غسل کے لئے انہیں جانے کا اتفاق ہوا، عہد پیری میں بھی نوجوانوں کی طرح تیرتے ہوئے دیکھا۔ یہ بھی دیکھا کہ مرحوم پانی کی سطح پر نہایت ہی نزاکت کے ساتھ لیٹے رہتے ہیں۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

سطح آب پر ایک لاش تیر رہی ہے، مرحوم اس فن میں ایک بہت بڑے استاد کے شاگرد تھے جن کا نام خان بہادر خاں رامپوری تھا وہ بندیل کھنڈ کے ایک پٹھان تھے ان کی فن شناوری کے بہت سارے قصے سننے میں آئے ہیں۔ مرحوم کے منجھلے بھائی نظام الدین بلخی مرحوم خان بہادر خاں کے ساتھ نہانے جاتے تھے۔ ایک روز خان بہادر خاں نے لڑکوں سے کہا تم میں بہتوں کا حال پڑھنے طوطے کا ہے لاکھ کوشش کی جائے تم اس فن کے ماہر نہیں ہو سکتے۔ دیکھو ہمارے فصو بابو تم سبھوں سے بہت چھوٹے ہیں لیکن تم سبھوں سے عقل میں بہت بڑے ہیں کس قدر جلدی "ملاحی" میں ماہر ہو گئے۔ مرحوم کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار انہوں نے سیلاب کے زمانے میں گنگا ندی کو پار کیا تھا۔

بیت بازی : بقول نظام الدین بلخی فصیح الدین بلخی مرحوم کو بچپن میں بیت بازی کا بہت شوق تھا اور شوق کے نتیجے میں وہ برابر شعراء کے دواوین پڑھتے تھے اور کچھ ذہن میں اشعار محفوظ رکھتے تھے۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار بھی سننے پر انہیں غزلیں یاد ہو جاتی تھیں۔ بیت بازی کے معاملے میں ان کے آگے کوئی بھی نہیں اُترتا تھا۔

معمّے اور پہیلی : معمہ اور پہیلی کو حل کرنے میں انہیں دیر نہیں لگتی تھی یہاں تک کہ اگر کسی بھی بچے سے کوئی پہیلی یا معمّہ حل نہیں ہوتا تو فوراً دوڑا ہوا مرحوم کے پاس آتا تھا اس یقین کے ساتھ کہ وہاں ضرور حل ہو جائے گا چنانچہ زیادہ تر ایسا ہی ہوتا تھا۔

شکار : شکار کا شوق بھی انہیں بچپن ہی سے تھا اور اس شوق نے جوانی میں شدت اختیار کر لی جو بڑھاپے تک یعنی جب تک ان کی صحت قائم رہی شوق بھی غالب رہا۔ شکار کے بہت سارے قصے وہ سناتے تھے۔ جنگلی جانوروں کا شکار کرنے وہ اکثر جاتے تھے۔ وہ کئی کئی دنوں کا سامان مہیا کر کے جاتے تھے اور شکار کے بعد واپس آتے تھے۔ مرحوم کو چڑیوں کے شکار کا بھی شوق تھا چنانچہ دور دور کے دوست بھی آتے تھے اور تین چار دنوں کا راشن لیکر یہ لوگ گنگا میں مصروف رہتے تھے۔ چڑیوں کے شکار کے لئے "ہلدی" چھپرہ، مہنار، سنہاگھاٹ اور پورب کی طرف مونگیر کی طرف یہ لوگ جاتے تھے۔ سرائے کیلا ملازمت کے دوران اپنے لڑکے کو بھی شکار میں ساتھ رکھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سہسرام کے ان کے پرانے شکاری دوست مولوی ابراہیم صاحب ان کے یہاں

خاص طور پر سرائے کیلا شکار کی غرض سے آیا کرتے تھے۔

عام مشاغل میں جو اہم تھے ان کا اوپر ذکر کیا گیا ہو ان کے علاوہ ان کے خاص مشاغل تھے وہ بھی خالص علمی، ادبی اور مذہبی تھے جن کا ذکر آئندہ کے ابواب میں کیا جائے گا۔

احبابؔ

فصیح الدین بلخی مرحوم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا جن میں وطن سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے، اپنے محلے کے لوگ بھی، اپنے شہر کے لوگ بھی، اپنے صوبہ کے لوگ بھی اور ہندوستان کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے بیرونی صوبے کے لوگ بھی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے دائرۂ احباب میں مختلف قسم کا ذوق رکھنے والے لوگ تھے۔ یعنی ایسی بات نہیں تھی کہ صرف ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں ہی سے ان کا گہرا رابطہ تھا۔ مثال کے طور پر کلاسکی گانوں کے ماہر لوگوں سے بھی تعلق اور ربط تھا۔ شہر کے اس عہد کے مشہور گانے والے شری الفت رائے بھی ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ الفت رائے ان کے کلاس کے ساتھی تھے۔ اس دوستی کو انہوں نے مرتے دم تک نبھایا۔ الفت رائے کے انتقال سے مرحوم حد درجہ متاثر تھے۔ الفت رائے کو حکومت کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا اس سلسلے میں مرحوم نے نہایت فراخدلی سے کوشش کی تھی۔ خواجہ فخر الدین کے گھرانے سے ان کی گہری دوستی تھی۔ ماسوا اس کے خواجہ فخر الدین سخن کے سبھی لڑکے ان کے نہایت ہی قریبی دوستوں میں سے تھے۔ یہ تو ہوئے بخشی محلہ کے لوگ یعنی بخشی محلہ سے تعلق رکھنے والے ان کے گہرے دوستوں کے احوال، ماسوا اس کے حکیم نعیم الدین مرحوم ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم اور ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی ان کے نہایت ہی گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مبارک حسین کا یہ حال تھا کہ اپنی کوئی بھی فنی تخلیق بغیر بلخی صاحب مرحوم کو دکھلائے کہیں بھی نہیں سناتے تھے۔

بلخی صاحب مرحوم کے حلقۂ علم و ادب میں کہنہ مشق حضرات بھی تھے اور مبتدی بھی۔ اور ان سبھوں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔

بلخی صاحب مرحوم جب تک بخشی محلہ میں رہے زیادہ تر احباب انہیں سے ملنے انہیں کے گھر پر آتے تھے، وہ ان کے یہاں نہیں جاتے تھے۔ وہ اپنے رشتہ کے بھائی نصیر الدین، شعیب صاحب بیرسٹر

اور عبدالجلیل مجسٹریٹ وغیرہ کے یہاں بانکی پور اکثر ملنے جاتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے، بانکی پور میں خان بہادر پروفیسر سید حسن عسکری سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے۔

تحقیق و جستجو کے سلسلے میں بلخی صاحب مرحوم کا لکھنؤ، الٰہ آباد، حیدرآباد، نیپال کا جو سفر ہوا اس میں پروفیسر عسکری صاحب بھی شامل تھے۔ عسکری صاحب نے آخر آخر وقت تک اپنی دوستی کو نبھایا۔

عظیم آباد کے باہر رہنے والے لوگوں میں انجم مانپوری سے ان کی گہری دوستی تھی، گیا کے اہل قلم میں بسمل سنسہاروی سے بھی ان کی گہری یاری تھی۔ بسمل سنسہاروی کے علاوہ سریر کابری مرحوم سے بھی ان کی گہری دوستی تھی۔ بلخی صاحب مرحوم سے گہری دوستی نواب نعمت جان قمر گیاوی مرحوم سے بھی تھی۔ قمر صاحب مرحوم کی شخصیت بھی ذی علم تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں انہی کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔

شہر کے لوگوں میں سید محمد یوسف وکیل بھی ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ بیرونی صوبے کے ان کے احباب کا جہاں تک تعلق ہے اس کی فہرست مرتب کرنا بہت مشکل ہے اس لئے کہ بلخی صاحب مرحوم سے خط و کتابت ہر علم کا متوالا کرتا رہتا تھا لیکن چند ایسی شخصیتیں ہیں جن سے بلخی صاحب مرحوم حد درجہ متاثر تھے۔ مثال کے لئے بمبئی کے سفر میں خواجہ فخر الدین سخن کے نواسے فلم ڈائرکٹر شرف الدین خلیل اور لکھنؤ کے آرزو لکھنوی سے ان کا گہرا تعلق ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ بمبئی گئے ادبی اشخاص کے علاوہ ہر فنکار سے ملنے کی کوشش رہتی تھی۔ حالانکہ وہ تھیٹر نہیں دیکھتے تھے لیکن فنکار کی دل سے قدر کرتے تھے، لتا منگیشکر اور سریندر کور کا جو ذکر انہوں نے "نسوانِ ہند" میں کیا ہے اس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے حیدرآباد کے عبدالرحیم صاحب سے بھی ان کا گہرا ربط تھا۔ بلخی صاحب مرحوم جب لکھنؤ تشریف لے جاتے تو پروفیسر مسعود حسین رضوی سے ایک گہرا تاثر لے کر آتے تھے۔

بلخی صاحب مرحوم کے احباب کا جہاں تک تعلق ہے ایک وہ طبقہ ہے۔ جو پٹنہ یونیورسٹی اور عظیم آباد کے مشہور کتب خانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے لائبریرین آنجہانی اندر دیو نرائن سنہا تھے جو آنجہانی سچیتانند کے بھتیجے تھے ان سے بھی ان کا گہرا ربط تھا۔ بلخی صاحب مرحوم جتنا وقت شعبۂ مخطوطات میں گذارا کرتے تھے ان کے اردگرد ریسرچ اسکالروں کے علاوہ پروفیسر حضرات بھی رہتے تھے۔ بلخی صاحب مرحوم

سے ڈاکٹر اختر اورینوی، پروفیسر جمیل مظہری، ڈاکٹر صدر الدین فضا شمسی، پروفیسر ذکی الحق وغیرہ کس درجہ متاثر تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اختر اورینوی صاحب نے "بہار میں اردو ادب کا ارتقا" کی مطبوعہ کاپیاں بلخی صاحب مرحوم کو بطور خلوص دلی دی تو اس پر اپنے ہاتھ سے یہ لکھا "اعتراف سعادت کے طور پر حضرت فصیح الدین بلخی کی خدمت میں" اختر اورینوی، کلکتہ سے تعلق رکھنے والوں میں پروفیسر شاہ مقبول احمد خصوصی طور پر ان کے دوستوں میں سے تھے۔

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔

اسفار

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ پونا ملیٹری اسکول سے سبکدوش ہونے کے بعد فصیح الدین بلخی مرحوم اپنے وطن واپس آئے اور چند دنوں رہ کر کلکتہ تشریف لے گئے۔ کلکتہ میں جب تک بلخی صاحب مرحوم قیام پذیر رہے گورنمنٹ امگریشن ایجنٹ فی جی (Emigration Agent Figi) سے بھی ایک عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء کو مرحوم نے جو خط ایجنٹ کے نام لکھا تھا اس کا جواب بحوالہ نمبر ۱۰۶-۱۱۷۶ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۲ء کو بلخی صاحب مرحوم کو ملا۔ ایجنٹ کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم کلکتہ چھوڑ کر پھر پٹنہ تشریف لائے۔ اس خط میں ایجنٹ نے یہ لکھا تھا کہ ان کا انتخاب ہو جانے کے بعد انہیں ہندوستان چھوڑ دینا پڑے گا۔ مختصر یہ کہ جزیرہ فی جی کے سپریم کورٹ میں ترجمان (Interpreter) کی بہت اچھی جگہ بلخی صاحب مرحوم کو مل گئی، ایجنٹ نے ان کو خط لکھا تھا اس میں انہیں بورڈ آف اکزامنرس کے دفتر کاونسل ہاؤس اسٹریٹ کلکتہ میں بلایا گیا تھا۔

چونکہ مرحوم ان دنوں کلکتہ سے پٹنہ تشریف لائے تھے اس لئے اس کی تصدیق دو عدد ٹیلی گرام سے ہوتی تھی جو ایجنٹ نے یکے بعد دیگرے ۲۰ اور ۲۱ کو بھیجا۔

الغرض ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو مرحوم نے کلکتہ میں دوپہر کو ایجنٹ کے معاہدہ پر دستخط کر دیا، معاہدہ کئی دفعات پر مشتمل تھا جو بہت طویل ہے۔

الغرض مرحوم فی جی کے لئے روانہ ہو گئے، بڑے بھائی حفیظ الدین بلخی مرحوم اور چھوٹے بھائی

مرحوم کو کلکتہ اور کلکتہ سے مدراس تک پہنچانے کے لئے گئے۔ مرحوم اپنے وطن سے یہ امید لے کر گئے تھے کہ کم از کم وہاں چار برسوں تک کی سیر کرنی ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا، وہاں پہنچتے ہی مرحوم نے اپنا عہدہ تو سنبھال لیا، سیر و سیاحت کی عادت سی ہو گئی تھی۔ مرحوم اپنی محنت اور کاموں کے سبب بہت مقبول ہوئے لیکن وہاں کی آب و ہوا ان کے مزاج کو راس نہ آئی۔ لگ بھگ چھ ماہ کے بعد مرحوم سخت علیل ہوئے۔ علالت سے کہنے کو تو وقتی طور پر نجات ملی لیکن ان کی تندرستی کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ شکایت رہی لہٰذا مرحوم اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور اپنے بڑے بھائی کو اپنی آمد کی خبر بھیجی بڑے بھائی مرحوم کے استقبال کے لئے مدراس روانہ ہو گئے اور چند دنوں کے بعد ان کو لیکر عظیم آباد آئے۔

پہلی جنگ عظیم اور بلخی صاحب مرحوم

ڈاڈہ کو آپریٹیو بینک کی ملازمت بھی بہت دنوں تک نہیں رہی۔ پرانے کاغذات یہ بتاتے ہیں کہ پھر وہ سیوان میں قانون گو کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ چکی تھی اور جاری تھی۔ پٹنہ ملیٹری اسکول کے شہرت یافتہ معلم منشی فصیح الدین بلخی کو ایک بار پھر اسی عہدے پر بلایا جا رہا تھا، بلخی صاحب کو سر دست مصر (Egypt) بھیجا جا رہا تھا۔

مصر کا سفر: فوجی ملازمت ہونے کے سبب معاہدہ کے پیش نظر انہیں دیگر ممالک میں ہر جگہ جانے کے لئے آمادہ کیا تھا، ۱۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو معاہدہ کا مسودہ مرحوم کے سامنے پیش تھا، معاہدہ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان اور مرحوم کے درمیان ہوا تھا۔

الغرض مرحوم سفر کے لئے روانہ ہو گئے، چونکہ ایک نوکر بھی ساتھ لے جانے کی اجازت تھی لہٰذا گھر کے پرانے ڈاکیہ پتھر میاں ساتھ گئے، یہ مرحوم کا دوسرا بحری سفر تھا، مرحوم کی یہ ملازمت خالص فوجی نوعیت کی تھی۔ فوجیوں کو اردو، فارسی اور عربی پڑھانا مرحوم کا کام تھا۔ اس سفر میں مرحوم نے مصر، اسکندریہ، دمشق، سیریا، فلسطین، بیروت، بیت المقدس نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کی۔ پتھر میاں مرحوم کے وفادار نوکر تھے۔ مصر، اسکندریہ اور دوسرے بڑے شہروں کے عالیشان ہوٹلوں

میں پتھر میاں نے عظیم آباد کے بہت سارے اچھے ہوٹلوں سے بھی بہتر زندگی گذاری، محاذ جنگ پر بھی انھوں نے گویا آقا کا ساتھ دیا۔ مرحوم اور پتھر میاں کے لئے دو کمرے پہلے سے ہی ٹھیک تھے پتھر میاں کا کمرہ مرحوم کے بغل میں تھا، پتھر میاں اپنے کمرے میں آئے کہنے لگے بابو ایسا کمرہ ملا جس میں کی ساری چیزیں ہم کیا ہمارے لکڑ دادا کو سپنے میں بھی نہیں ملی ہوں گی۔

مختلف کاغذوں کی چھان بین کرنے سے مرحوم کی فوجی زندگی کے اسفار کا پتہ چلتا ہے۔

مرحوم فوج میں بھی معلمی اور پڑھانے کے کام پر مامور تھے۔ فوجی رجمنٹ کے ۵۳ ڈویزن سے مرحوم کا تعلق تھا اور عشاریہ نمبر ۴۷ تھا، مرحوم جس فوجی دستہ سے وابستہ تھے اس کا نام رزسٹنس اکسپی ڈیشنری فورس (Resistance Expeditionary Force) تھا۔ مرحوم Enthofield بیروت، اسکندریہ، ریاض، طائف، کتارا، اسٹر، بیت المقدس، مصر وغیرہ جگہوں میں فوجی کمانڈر کے حکم سے تشریف لے گئے۔ فوجی دیئے پاس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بار چھٹی لے کر ریاض (Reyart) سے ہا ہاک بھی تشریف لے گئے ۱۹۱۸-۱۹ء کے موومنٹ آڈر سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم انہی دنوں نوکری سے سبکدوش ہو کر پتھر میاں کے ساتھ اپنے وطن کے لئے روانہ ہوئے۔

مرحوم مصر اور اسکندریہ میں جہاں کپڑا سلواتے تھے اس کمپنی کا نام امام الدین محمد جان ٹیلرنگ کمپنی تھا، اس کی شاخیں مصر میں سلیمان پاشا اور کامل اسٹریٹ ۹ میں اور اسکندریہ بادو بوس محمد علی میں تھیں۔

پرانے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم ۱۹۱۹ء کے اواخر میں ممالک بیرونی کی سیر کرنے کے بعد وطن تشریف لائے۔ مرحوم نے فوجی ملازمت بحسن وخوبی اور نہایت دیانتداری کے ساتھ انجام دی اس کا اندازہ فوج کے اعلیٰ افسروں کی دی ہوئی سندوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

مرحوم اپنی فوجی زندگی کے بہت سارے قصے سناتے تھے جن کو قلم بند کرنا مشکل ہے۔ مرحوم کہتے تھے کہ میں ان دنوں تین بار موت کے منہ سے نکلا۔ آج مرحوم کا ایک شعر یاد کرتا ہوں تو حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی غزل کے ایک شعر میں مرحوم فرماتے ہیں ؎

مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی اسکی تیغ تیز
پابندہ وہ بھی حلقۂ جوہر ہیں رہ گئی

ایک بار کا ذکر ہے مرحوم چند ساتھیوں کے ساتھ مجیبے سے باہر رات کے وقت نکلے، رات تاریک تھی۔ یہ لوگ اگرچہ نہایت ہی آہستہ آہستہ قدم زمین پر دھر رہے تھے لیکن تھوڑی سی کھڑکھڑاہٹ پہ دور سے گولی چلنا شروع ہو گئی، دو ساتھی مارے گئے، مرحوم کو ایسا معلوم ہوا کہ گولی ان کے قریب سے گذری لیکن وہ بال بال بچ گئے۔

اس طرح مرحوم ایک بار قاتلانہ حملہ سے بچ گئے اس لئے کہ قدرت کو ایسا منظور تھا ان سے "تاریخ مگدھ لکھوانا تھا"، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات کو ان کے علمی خدمات کا رہین بنانا تھا۔ کتنے ادب نوازوں، ادب دوستوں، ریسرچ اسکالروں کو ان سے فیضیاب کرانا تھا۔

اوصاف و کمالات

بلخی صاحب مرحوم کے اوصاف و کمالات کو قلم بند کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ بلخی صاحب مرحوم کے متعلق جو چند اہل قلم حضرات ہیں ان کے تاثرات کو قلم بند کروں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی فرماتے ہیں "میں نے جب حضرت فصیح الدین بلخی کو قریب ہو کر دیکھا ہے مجھے ان کے جسمانی وجود سے زیادہ ان کے روحانی وجود کا احساس ہوا اور جب وہ وفات پا گئے تو مجھے اچانک سادھکا نہیں لگا، ان کے جسم کے فنا ہو جانے کا المناک اثر اس لئے گہرا نہ پڑا کہ اس کی توانا متحرک کارفرما کارساز روح آج بھی میرے لئے زندہ حقیقت ہے"

"ڈاکٹر کالی کنکر دت، پروفیسر حسن عسکری اور حضرت بلخی پٹنہ یونیورسٹی کی ارواح تحقیق میں شامل ہیں، بدر و حنین ابدی ہیں دار العلوم کی ان مقدس ارواح کے فیض سے ہماری مادر علمی زندہ ہے۔"
"حضرت بلخی پٹنہ یونیورسٹی کے ریسرچ افیسر تھے انہوں نے مخطوطات کا انبار لگا دیا۔ اس خرمن کے خوشہ چیں کم ہیں مگر بلخی نے دولت بے پایاں جمع کر دی ہے۔ نیپال، دکن، بہار اور اتر پردیش کے گوشے گوشے سے بوریوں میں بھر بھر کر قلمی نسخے سمیٹے ہیں۔ کتب خانہ خدا بخش خاں

اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے ادبی خزانے کی وجہ سے عظیم آباد آج مدینۃ العلم ہے۔"

"حضرت بلخی مرحوم مورخ، محقق اور جامع الحقائق تھے۔ وہ صرف پیر تحقیق نہیں تھے بلکہ شیخ دستگیر بھی تھے۔ نجانے کتنوں نے ان سے فیض پایا۔ بہار میں اردو زبان وادب کے ارتقا کے سلسلہ میں حضرت بلخی مرحوم سے مجھے بھی ارادت رہی ہے۔ حضرت بلخی مرحوم کی کتاب "تاریخ مگدھ" کے علاوہ ان سے براہ راست استفادہ کیا، حضرت آیت اللہ جوہری پھلواروی کی مثنوی "گوہر جوہری" کا نادر قلمی نسخہ پروفیسر عسکری کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے تو جوہری کی تصویر حضرت بلخی مرحوم کے انکشاف کی دلیل ہے، مرحوم نے کئی ریسرچ کرنے والے اسکالروں کی مدد فرمائی اور اس طرح کہ امداد سے وہ خود احسان مند ہوتے جا رہے ہیں۔ نام ونمود کی خواہش، بے جا فخر ومباہات اور کبر وپندار کی رمق کبھی دیکھی ہو تو کوئی بلخی مرحوم کو دیکھتا۔ نادم بلخی سلمہٗ شعبۂ اردو میں میرے شاگرد تھے۔ حضرت بلخی اور میرے درمیان مراسم قائم ہو چکے تھے لیکن انہوں نے اپنے لڑکے کے لئے کبھی کسی قسم کی سفارش نہیں کی۔ وہ ان باتوں سے بلند تھے۔"

"ایک بار میں ان کے گھر گیا۔ وہ تشریف نہیں رکھتے تھے۔ دو ریسرچ اسکالر میرے ساتھ تھے، حضرت بلخی سے انہیں تحقیقی مواد دلانے گیا تھا، انہیں جب معلوم ہوا تو بہت متاسف ہوئے اور مجھ سے مل کر مدد کا وعدہ فرمایا۔ نہایت سادگی اور قناعت سے رہتے تھے۔ بڑی صاف ستھری رہائش اور مہذب طرز زندگی، شریفوں کا انداز اور رکھ رکھاؤ تھا۔"

"وہ بیمار تو بہت دنوں سے چلے آتے تھے لیکن دم خم اتنا تھا کہ وہ مرض کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ بڑے حوصلہ اور ہمت سے تحقیق کے کاموں میں مشغول رہے۔"

"ایک روز کلیم الدین صاحب سلمہٗ اور کوئی اور صاحب مجھ سے ملنے آئے اور یہ تشویشناک خبر سنائی کہ حضرت بلخی خطرناک طور پر علیل ہیں۔ مجھے ملنے لازماً دو گھڑی ان کا دل خوش کرنے جانا چاہیئے۔ آخر گیا۔ نادم بلخی سلمہٗ ان کی تیمار داری میں جی جان سے لگے ہوئے تھے۔ حضرت بلخی مجھے دیکھ کر متبسم ہوئے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ بولی میں بڑی نقاہت تھی، میں نے پوچھا کیا حال ہے فرمایا آپ لوگوں سے مل کر جی خوش ہو جاتا ہے اور یہی میری غذا ہے ویسے بھوک نہیں لگتی ہے۔" پروفیسر سید علی حیدر نیر

ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ بلخی صاحب مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں :

"ایک بار کا موقعہ ہے کہ میر سوز پر اپنے تحقیقی مطالعہ کی ترتیب کے سلسلے میں پٹنہ یونیورسیٹی کے شعبہ مخطوطات میں گیا وہاں پہلی بار بلخی صاحب سے ہماری ملاقات تھی۔ آپ بے حد شفقت اور رغبت سے پیش آئے۔ میر سوز کے کلام کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ جو اس شعبہ کی ملکیت ہے اس سے استفادہ کا موقع دیا علاوہ بریں ایک قدیم انتخاب کلام شعرائے اردو سے بھی مطلع فرمایا جس میں میر سوز کے کلام کا انتخاب تھا اور مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی ہدایت کی۔ ہم چند لمحوں کی ملاقات سے بلخی صاحب سے اس قدر متاثر ہوا جو بیان سے باہر ہے۔"

مولانا عبدالروف ندوی نے بلخی صاحب سے متعلق اپنے تاثرات "حضرت فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت" میں تفصیل سے ان کے کردار اور اوصاف و کمالات پر روشنی ڈالی ہے جس میں ان کی تحقیقی، ناقدانہ، شاعرانہ صلاحیت اور ان کی تاریخ نویسی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کے عقائد اعمال سے متعلق اسی مضمون میں فرماتے ہیں۔ "مرحوم کے عقائد اسلامی بہت صاف اور صحیح تھے تلاوت کو بڑا وظیفہ خیال کرتے تھے آپ کو آیات قرآنی کے ترجمہ اور مطالب پر عبور تھا، گاہے گاہے سند کے طور پر پیش کرتے تھے۔ آپ کو بدعات اور لایعنی رسوم سے نفرت اور پرہیز تھا، بدعات پر اعتراض آپ کو وراثت میں ملی تھی۔"

سید بدرالدین احمد بدر عظیم آبادی اپنے مضمون "مولوی فصیح الدین بلخی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں صرف تاریخ سے ان کو دلچسپی نہ تھی۔ ہر پرانی چیز سے ان کو لگاؤ تھا۔ اس زمانے کی شادیات کے جشن، تہواروں اور میلوں کے تذکرے، پٹنہ کی گذری ہوئی محفلوں کی داستانیں۔

بلخی مرحوم کو شعر و ادب سے ذوق نہیں تھا بلکہ وہ سخن فہم، سخن شناس اور شعر و ادب کے نکات کو جاننے والے اور اچھے ناقد تھے۔ اساتذہ کے اشعار خوب یاد تھے۔ پٹنہ کے نامی اور معرکہ کے مشاعروں کے قصے یاد تھے، شاعروں کی بیٹھکیں یاد تھیں اور حضرت شاد اور راسخ کے جھگڑے یاد تھے، ان سب کی طولانی داستانیں سنکر مزا آجاتا، شعر و ادب کے ساتھ ان کی وابستگی اور لاتعداد فارسی اور اردو کے منتخب اشعار کا ان کے ذہن میں محفوظ رہنا اس بات کی دلیل تھی کہ بلخی صاحب مرحوم سخن فہم ہونے

کے ساتھ سخن سنج بھی تھے۔ میں نے ان کی زبانی ان کے اشعار کبھی نہیں سنے۔ جب شعر و شاعری کی باتیں نکلتیں تو وہ دوسروں کے اشعار سناتے ہوئے تنقید کرتے اور شاعرانہ نکات پر روشنی ڈالتے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بلخی صاحب اگرچہ اچھے اچھے شعر کہتے تھے مگر دوسرے شعرا کی طرح اپنے شعر کہنے کو اہمیت نہیں دیتے تھے، فن عروض میں انہوں نے کتابیں لکھیں۔ نسوانِ ہند کے نام سے شاعرہ عورتوں کا تذکرہ لکھا مگر اپنی شاعری کا کبھی ڈھول نہیں پیٹا۔"

ڈاکٹر افضل امام ام۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی سابق ناظم شعبۂ مخطوطات پٹنہ یونیورسیٹی موجودہ پروفیسر شعبۂ فارسی بی۔ این۔ کالج اپنے مضمون 'پٹنہ یونیورسیٹی اور بلخی صاحب' میں رقم طراز ہیں:۔

"عظیم آباد کے جن لوگوں نے ہندوستان اور بالخصوص صوبہ بہار کی تاریخ اور ادب پر گہری نظر رکھی ہے، ان میں پروفیسر عسکری، ڈاکٹر کے کے دتا (سابق وائس چانسلر مگدھ یونیورسیٹی و پٹنہ یونیورسیٹی) اور فصیح الدین بلخی مرحوم قابل ذکر ہیں اول الذکر حضرات کا مرد کار پٹنہ یونیورسیٹی سے تھا مگر بلخی صاحب سرائے کیلا اسٹیٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد وطن واپس آئے تھے۔ عمر کا تقاضہ تھا کہ اب آرام کیا جائے مگر سہ

جنوں شوق تمنائے نامراد نگر

اُمید ختم شود انتظار باقی است

انہوں نے (بلخی صاحب نے) پٹنہ یونیورسیٹی سے منسلک ہونے کی راہ نکالی، یہ زمانہ سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء کا تھا جبکہ ملک سیاسی بحران میں مبتلا تھا۔۔۔ لوگ ایک نئے ملک کے قیام کے لئے کوشاں تھے اور پٹنہ کے چند اہل علم ایک علمی مرکز کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے جو آج شعبۂ مخطوطات پٹنہ یونیورسیٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے دو سکشن ہوئے۔ ایک فارسی، عربی، اردو اور دوسرا ہندی، سنسکرت اور میتھلی مگر بلخی صاحب اگرچہ انچارج عربی و فارسی کے تھے مگر شعبہ کی تمام ذمہ داریاں انہیں کے سر تھیں، وہ ناظم شعبۂ مخطوطات سمجھے جاتے تھے۔

مرحوم کو شعبۂ مخطوطات سے کیا شغف تھا صرف وہی حضرات بیان کر سکتے تھے۔ کرسی بغرض روشنی کھڑکی کے قریب کر لی گئی خود کو اس پر اس طرح جکڑ بیٹھے ہیں کہ ٹخنہ ٹھوڑی سے ملا ہوا ہے ہاتھ میں ایک بڑا سا شیشہ ہے۔ آنکھ شیشہ سے لگی ہوئی ہے اور شیشہ کتاب سے۔ اس عالم انہماک میں

اگر کوئی صاحب ذوق تشریف لے آئے تو خیر علمی گفتگو شروع ہوئی ورنہ صرف ایک سگریٹ دے کر انہیں واپس کر دیا ...... دفتر کی حاضری ان کا مذہب تھا۔ بارہ برس میں ایک روز بھی غیر حاضر یا رخصت پر نہیں رہے۔ اس طرح ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۹ء تک وقت گذرتا رہا۔ ۱۹۶۰ء میں نقاہت کے آثار نمایاں ہوئے پھر بھی یارانِ میکدہ اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ بلخی صاحب کو آرام میسر ہو۔ اگست ۱۹۶۰ء کے آخری مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد انہیں اجازت ملی کہ وہ اپنا سلسلہ یونیورسیٹی سے ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیں۔

ان کی دفتری ذمہ داریاں مختلف تھیں۔ ریسرچ اسکالر کی ہر ممکن معاونت، مخطوطات کی فراہمی ان کی فہرست کا کیٹلاگ تیار کرنا۔ نادر نسخہ کی طباعت، برٹش میوزیم انڈیا سے کسی نسخہ کی حاصل کردگی وغیرہ۔ سکشن کے قیام کے بعد تقریباً جتنے لوگوں نے پٹنہ یونیورسیٹی سے اردو فارسی یا تاریخ میں ریسرچ ڈگریاں حاصل کی ہیں وہ بلا استثنا بلخی صاحب کی مرہون منت ہیں، خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے اپنا مقالہ ان کی زندگی میں تیار کر لیا جو بچ گئے وہ اب تک یوسف بے کارواں بنے پھر رہے ہیں۔"

بلخی صاحب مرحوم سے متعلق پروفیسر عبدالمغنی کا مضمون "سو وہ بھی خوش ہے" کہ چند اقتباسات دئے جاتے ہیں جن سے مرحوم کی شخصیت اور ساتھ ساتھ اوصاف و کمالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

"عظیم آباد میں مجھے قلندروں کی جوڑی نظر آئی، ایک بلخی دوسرا عسکری۔ ان صاحبوں کے متعلق لفظ قلندر پر یقین نہ آئے تو مرحوم و موجود کی صورت و سیرت کے متعلق آپ ان کے کسی واقف حال سے پوچھ لیجئے۔"

قلندری کے اوصاف اس نقشے میں اتنے نمایاں ہیں کہ صرف ان کا بیان سن کر آپ انہیں پورے شہر میں ڈھونڈ نکال سکتے ہیں۔

بلخی صاحب نہایت متانت کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں اس طرح بلخی صاحب کی گفتگو میں شبنم کی طرح پھوار اور عسکری صاحب کی گفتگو میں بارش کا میلان۔

اذ کہی وضع کے یہ عاشق تحقیق بڑی استواری کے ساتھ اپنے مخصوص تماش کے تاعمر وفادار رہے۔

بلخی صاحب کی ذات بہار میں خصوصاً عظیم آباد میں ہونے والے ہر علمی کام کا مرجع امید تھی مجھے

معلوم ہے کہ بلخی صاحب ایک زمانے میں شاد کی علمی مخالفت کے سربراہوں میں رہ چکے ہیں چنانچہ
فن شاعری میں شاد کے نقائص کو ایک رسالے "انشاد شاد" میں بیان کر چکے ہیں۔ اس پس منظر میں
میرا گمان تھا کہ شاید وہ مجھ سے تعاون نہ کریں لیکن اس دور کے عظیم آباد میں شاد کے معاملات کی واقفیت
بلخی صاحب سے زیادہ کسی کو حاصل نہ تھی لہٰذا ۱۹۵۹ء میں شاد کی رہگذر کا سراغ لگانے کے لئے
بلخی صاحب کے در پر ہزار بار جانا پڑا۔ میرے سلام کرنے کے بعد کرسی کی طرف بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔
خیریت کے بعد مدعا پوچھا اس کے بعد بغیر کسی تامل اور تکلف کے گھنٹہ بھر اس ولولے سے باتیں کرتے
رہے .... جیسے یوم شاد کا انعقاد انہیں کی تجویز پر ہو رہا ہے ....
آپ سمجھتے ہوں کہ شاد کے متعلق ان کے خیالات بدل گئے ہوں لیکن آپ کو سن کے حیرت ہونی چاہئے
کہ یوم شاد کے متعلق مذکورہ تمام کرم فرمائیوں کے ساتھ ہی بلخی صاحب نے اہتمام کے ساتھ مجھے اپنا
کتابچہ "انشاد شاد" اس تمہید کے ساتھ دیا کہ شاد کی شاعرانہ عظمت مسلم لیکن ان کے نقائص کو بھی پیش
کرنا چاہئے تاکہ ان کی پوری شخصیت دیانتداری کے ساتھ سامنے آئے ورنہ علم و تحقیق کے ساتھ انصاف
نہیں ہوگا۔

بلخی صاحب کی یہ انسانیت وسیع المشربی تک پہنچ گئی تھی۔ عمر کے درمیانی حصے میں وہ اجزائے
ایمان کی جستجو میں لگ گئے تھے یہاں تک کہ جویائے حق اپنی گہری اسلامیت کے باوصف اشتراکیت تک
کو گوارا کرنے لگا تھا۔ بہر حال عقیدے کی یہ لچکداری کسی مصالحت کے طور پر نہیں تھی غرض مندی
اور مفاد پرستی سے مرحوم بالاتر تھے۔ یہ وسیع المشربی دراصل اس صوفیت کی ایک شکل تھی جو بلخی خاندان
کے امتیازی ورثہ میں رہا ہے۔ ایک بار بلخی صاحب میرے گھر پر یا اپنے گھر میں والد صاحب اور ہم لوگوں
سے مصروف گفتگو تھے موضوع اسلام کی تبلیغ کا تھا۔ بلخی صاحب پہلے تو اس کی ضرورت اور اہمیت پر بولتے
رہے اس کے بعد تبلیغ کی عملی تدبیر کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے ایک چونکا دینے والی بات کہی۔
"کہتے ہیں کسی کو مسلمان بنانے کے لئے پہلے کلمہ پڑھانے کی ضرورت نہیں اس کی بجائے اسے سب سے
پہلے ان صالح اعمال کی تلقین کی جائے جنہیں وہ عام انسانی نیکی سمجھ کر قبول کر لے۔"
سہیل عظیم آبادی کے مضمون "بلخی صاحب" سے بھی کافی حد تک مرحوم کے اوصاف و کمالات پر

روشنی پڑتی ہے۔ ضرورت تو اس کی تھی کہ پورا مضمون نقل کیا جاتا لیکن مجبوری کے پیش نظر چند اہم اقتباسات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سہیل صاحب کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کی سادہ طرزِ زندگی، رہائش اور علمیت نے خصوصی طور پر انہیں متاثر کیا، سہیل صاحب فرماتے ہیں:

"انسان کی عظمت ظاہری چیزوں سے نہیں ہے بلکہ اس کی صفتوں سے ہے، بڑائی انسان کو ظاہرداری سے بے نیاز کرتی ہے، انگریزی زبان کا ایک مقولہ ہے۔

Simple living and high thinking

سید فصیح الدین بلخی مرحوم اس کی بڑی اچھی مثال تھے۔ دنیا کی ہر چیز کی طرف سے بے پروا، انہیں صرف کتابوں سے کام تھا۔ پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں انہیں شاید اس کی بھی فکر نہیں ہوتی کہ دنیا میں ایک طرف خود ان کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔

میں سید فصیح الدین بلخی کے نام سے اس وقت آشنا ہوا جب ندیم کا پہلا بہار نمبر شائع ہوا...... یہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا، مرحوم نے کتبوں اور سکوں کے حوالے سے ایک قیمتی مضمون لکھا تھا۔ ان کا یہ مضمون مجھے بے حد پسند آیا، یہی زمانہ میری ادبی زندگی کے آغاز کا بھی تھا اور میں نے انجم صاحب مرحوم کو خط لکھا تو اس مضمون کا سب سے پہلے ذکر کیا، اس وقت سے میں نے مرحوم کے بارے میں .... ضروری باتیں معلوم کرلیں۔ ان دنوں وہ سرائے کیلا کی ایک چھوٹی سی ریاست میں ریونیو افیسر تھے، ملاقات کا کوئی موقع نہیں نکل سکا، دو چار اور چھوٹے چھوٹے مضامین میں نے دیکھے مگر ان کے بارے میں آج کی طرح اس وقت بھی کوئی زیادہ معلومات نہیں حاصل تھی۔

شاید ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو (دلی) نے ان کی کتاب "تاریخ مگدھ" شائع کی۔ انہوں نے میں انجمن ترقی اردو سے منسلک تھا اور خاص قسم کے کام میرے سپرد تھے اور بابائے اردو مرحوم کی خدمت میں اکثر باریابی کا موقع ملتا تھا، بابائے اردو نے اس کتاب کی تعریف کی اور وہ چاہتے تھے کہ بلخی صاحب انجمن کے لئے اور کتابیں بھی لکھیں مگر اپنی دلچسپیوں کے سبب وہ اس کا موقع نہیں نکال سکے۔"

"اسی زمانے میں غیر متوقع طور پر ان سے ملاقات ہوگئی جب رفیع صاحب مرحوم نے ان کا تعارف کرایا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ بے حد دبلے پتلے تھے اور کھوئے کھوئے سے آدمی، معمولی کپڑے اور

معمولی طور طریقے۔۔ ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات، کچھ مقبرے کے کتبے کی نقلیں اور کچھ فرامین کی نقلیں جو انہوں نے بڑی کاوش سے حاصل کی تھیں، سچی بات یہ ہے کہ مجھے مل کر بہت مایوسی ہوئی۔ بڑے آدمیوں کے خیال کے ساتھ جتنی باتیں ذہن میں عام طور پر آتی ہیں ان میں سے کوئی بات ان میں نہیں تھی۔ اگر تعارف نہ ہوتا تو شاید ان کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا، لیکن تعارف ختم ہو چکا تھا۔ پھر جو انہوں نے ان کتبوں اور فرامین کے بارے میں باتیں شروع کیں تو جیسے علم کے سمندر میں طوفان آگیا۔ بات ختم ہوتی ہی نہ تھی۔ جب ۱۹۴۶ء میں رانچی سے پٹنہ واپس آگیا تو نجمی صاحب مرحوم ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقلاً پٹنہ آگئے تھے اور ملازمت بھی چھوٹی سی ریاست کی یعنی ان کے پاس کوئی بڑا اندوختہ نہیں تھا مگر انہوں نے کبھی شکایت نہیں کی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ کبھی اس سلسلے میں بات کرتے ہی نہیں تھے۔ جس حال میں تھے خوش تھے۔ جب بھی باتیں ہوتیں تو وہ اپنی نئی تحقیق کی باتیں سناتے، ان دنوں میں نے ایک روزانہ اخبار جاری کیا تھا، مالک بھی تھا اور اڈیٹر بھی۔ بڑی مصیبت میں مبتلا تھا لیکن ان کے عزم و استقلال اور لگن کو دیکھ کر بڑی ہمت بندھتی۔ وہ بزرگ تھے اور میں ان سے بہت چھوٹا۔ میں بڑی نیاز مندی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ بالکل دوستانہ برتاؤ کرتے ایک دن میں نے پٹنہ کے جواں مرگ شاعر ضیاؔ عظیم آبادی کا ذکر کیا تو ان کی ساری داستان سناگئے۔ پھر یونیورسیٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سنہا نے انہیں پٹنہ یونیورسیٹی میں ریسرچ اسکالر مقرر کیا۔

"انہیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ان کے پاس ایک بڑی لائبریری تھی اور وہ ان کتابوں سے کام لے سکتے تھے۔ اتنی عمر میں ناشتہ کرنے کے بعد لائبریری آجاتے تھے اور شام تک وہاں پڑھتے رہتے۔ انہوں نے اس شعبہ کو بڑی ترقی دی اور بہت سے قلمی نسخے اس لائبریری کے لئے جمع کیے۔ پٹنہ یونیورسیٹی کا شعبہ ان کی انتھک محنت کی دین ہے۔"

"میں نے جب "ماہانہ تہذیب" جاری کیا تو ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتا ان کی عادت تھی جب کوئی کام شروع کر دیتے تو درمیان میں اسے کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ جب میں نے ان سے مضمون کی درخواست کی تو انہوں نے فوراً وعدہ فرمایا۔ پہلے ضیاؔ عظیم آبادی مرحوم پر ایک مفصل مضمون لکھا پھر ایک بے حد قیمتی مضمون ماہ و سال کی تعریف پر اور ایک مضمون عروض و موسیقی کے تعلق پر۔ یہ سارے

مضامین نہایت ہی عالمانہ تھے۔ افسوس یہ ہے کہ آخری مضمون کی اشاعت کی نوبت نہ آئی اور "تہذیب" بند ہوگیا۔ اور یہ مضمون کسی دوسرے رسالے کی زینت بنا۔"

"فصیح الدین بلخی مرحوم علم کے سمندر تھے، انہیں صرف ادب یا تاریخ ہی سے دلچسپی نہیں تھی انہیں فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے سے گہری دلچسپی تھی اور اس کے بارے میں ان کی معلومات بہت اچھی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار علم نجوم کی بات چلی تو وہ علم نجوم کی بہت سی بات بتا گئے۔ پٹنہ اور بہار کے بہت سے نامی نجومیوں کی دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن یہ بھی فرمایا کہ یہ فن بہت مشکل ہے اور مسلسل ریاضت چاہتا ہے۔

فصیح الدین بلخی مرحوم جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھے۔ کثرتِ مطالعہ اور شب بیداری نے ان کی صحت کو اور بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ آنکھوں کی بینائی بھی کم ہوگئی تھی .... اور وہ بھی اس لئے کہ مطالعہ میں اس سے رکاوٹ پیدا ہوتی ....

میں نے کئی بار ان سے کہا کہ ریڈیو کے لئے بھی کچھ وقت نکالیں لیکن انہوں نے معذوری ظاہر کی .... پھر بھی میرے اصرار پر نواب امداد امام اثر پر ایک تقریر نشر کی۔ ان کی موت سے بہار ایک مایہ ناز محقق اور عالم سے محروم ہوگیا جس کی جگہ بہت دنوں تک خالی رہے گی۔"

قیوم خضر ایڈیٹر "اشارہ" بلخی صاحب سے متعلق اپنے تاثراتی خاکہ میں لکھتے ہیں:

"دسمبر ۱۹۵۳ء کے دوسرے ہفتہ میں جب میں نے دوبارہ "اشارہ" نکالنے کا مشورہ طلب کیا تو خاموش سوچنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا خضر صاحب میں کسی کو بھی بہار میں رسالہ نکالنے کا مشورہ نہیں دیتا ہوں اگر آپ کہتے ہیں تو ضرور نکالیں۔ پیسوں سے تو نہیں مگر مضامین سے ضرور مدد کروں گا۔" بلخی صاحب نے اپنا یہ وعدہ مرتے دم تک نبھایا۔ مجھے فخر ہے کہ بلخی صاحب کے جتنے مضامین "اشارہ" میں چھپے، بہار کے کسی دوسرے رسالے میں نہیں چھپے۔ وہ ہر لمحہ میری ترقی و کامیابی کی دعا کرتے رہے اور عملی طور پر بھی جو ممکن ہوتا گریز نہیں کرتے۔"

"وہ تو کافی کمزور اور بوڑھے ہو چکے تھے مگر جی چاہتا تھا کہ وہ کچھ دن اور جیتے، ان کے مرنے کے بعد میں جانتا ہوں کہ کتنے نونہالان کے باغ علم و تحقیق کے بے ثمری پر مہر لگ چکی ہے،، بہال

تک انہوں نے زندگی کے چراغ کو اس طرح روشن کیا کہ اس کی روشنی میں زندگی کی راہوں کو روشن کر سکتے ہیں۔"

"بلخی صاحب مرحوم اگرچہ اپنی وضع داری کے اعتبار سے درویش نظر نہیں آتے تھے لیکن درویشی ان کی فطرت میں داخل تھی۔ فقیروں، درویشوں اور صوفیائے کرام سے ان کا والہانہ تعلق تھا، ان کے اوصاف و کمالات کے پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے سید شاہ تقی حسن بلخی سجادہ نشیں خانقاہ فردوسیہ فتوحہ کے مضمون "عقیدت فصیح الدین بلخی بمخدوم شرف الدین" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"آہ کس دل و جگر سے محترم سید فصیح الدین بلخی مرحوم و مغفور کے متعلق اظہار خیال کیا جائے، وہ پیکر اخلاص و خلوص تھا، وہ جو صاحب فضل و جود تھا جس کا ہر بول علمی میدان کے اصناف و فنون میں سند (Authority) تھا جس کی ساری زندگی دوسروں کو سہارا دینے کے لے وقف تھی۔ جس کی حیات کا ہر لمحہ مقالے، نفیس لکھنے والوں کو تاریخ و تذکرہ کے تاریک گوشہ اور پہلو کو اجاگر بنانے کے لئے مشعل راہ تھی۔

خیال آیا کہ موصوف مرحوم کی اس عقیدت پر روشنی ڈالی جائے جو مذہب و روحانیت کے ساتھ عموماً اور حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ کے ساتھ خصوصاً اس مادّی دور میں وہ رکھتے تھے کیونکہ یہ مشکل ہی سے احساس کیا جا سکتا ہے کہ ایک مغربی لباس میں اپنے نحیف و ناتواں جسم کبھی ایسا حساس و بیقرار دل بھی رکھ سکتا ہے جو ایک ہلکی سی ٹھیس پہ تڑپ اُٹھے۔

میں نے بار بار حضرت مخدوم الملک کے ذکر پر ان کی اشکبار آنکھیں دیکھی تھیں، میں نے اکثر ان کی زبان سے حضرت مخدوم کا تذکرہ جس عقیدت و والہانہ انداز پر سنا ہے اس کا کیف اس کی لذت اب تک فراموش نہیں کر سکا ہوں۔"

بستر مرگ سے لے کر لحد تک بفصیح الدین بلخی مرحوم سے متعلق جو پہلو قابل ذکر ہے اس کا اندازہ علیم الدین بلخی ندوی لکچرر طبیہ کالج پٹنہ کے مضمون "ایک روشن دماغ تھا نہ رہا" سے ہوتا ہے۔

میں مرحوم کو جب بھی ہسپتال میں دیکھنے گیا انتہائی کرب و اذیت کے عالم میں بھی بے ہوش و حواس پایا۔ اکثر بہت متحرک نظر آتے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ تسبیح و تہلیل میں مشغول ہیں۔ دو بجے نماز ظہر

کے بعد مرحوم کی صلوۃ جنازہ ہوئی اور تین بجے انہیں پٹنہ سیٹی کے محلہ دوندی بازار میں مولانا سید امین اللہ جو پٹنہ سیٹی کے ایک ممتاز جید عالم دین تھے اور مرحوم کے خسر تھے کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم کا چہرہ اس خاکدان میں لٹائے جانے کے بعد مجھے کچھ ایسا نظر آرہا تھا جیسا کہ زندگی میں ہمیشہ نظر آیا کرتا تھا، چہرہ پر اس وقت بھی وقار، تمکنت پوری طرح نمایاں تھی، لبوں پر وہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو ایک مرد مومن کے لبوں پر ایسے وقت کھیلا کرتی ہے ؎

نشان مرد مومن با تو گویم

چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

سطور بالا میں جو اقتباسات چند مشہور اہل قلم ادیبوں اور علمائے دین کے پیش کئے گئے ہیں ان سے حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم کے اوصاف وکمالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے پیش کئے جانے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ مرحوم راقم کے دادا تھے اور رشتے کی قرابت کے سبب اگر انہیں نظر انداز کر کے مرحوم کے اوصاف وکمالات کو قلمبند کیا جاتا تو مدحت سرائی کے الزامات راقم پر عائد ہونے کے اندیشے تھے ماسوا اس کے مرحوم کے اوصاف وکمالات سے متعلق رہنمائی بھی اس مقالے کی ترتیب میں ان مضامین سے راقم کو ہوئی ہے جس کا اظہار بھی ضروری ہے۔

یوں تو مرحوم کی تمام عمر عہد طفلی سے لیکر سفر آخرت تک اوصاف وکمالات کی حامل رہی، مرحوم کے انتقال کے بعد رسالہ کوئل" ڈالٹن گنج کے ادارے نے نکالنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ فصیح الدین بلخی نمبر نکالا جائے۔ بہت سارے مراحل طے ہو چکے تھے۔ کافی حد تک مضامین کی فراہمی ہو چکی تھی۔ تقریباً ان سب ہی اہل قلم نے معاونت کی پوری پوری توقع دلائی تھی، جن کے مضامین حاصل نہ ہو سکے تھے اور بہت ساروں نے وقت کی پہلی فرصت میں مضامین قلم بند کر کے ارسال فرمائے لیکن رسالہ مذکور معاشی بحران کا شکار ہو گیا اور منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جتنے مضامین دستیاب ہوئے تھے ہنوز محفوظ ہیں اور ان سے اس مقالے کی ترتیب میں حد درجہ مدد لی گئی ہے، مختصر یہ کہ سطور بالا میں درج اقتباسات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ مرحوم ازل سے اوصاف وکمالات لے کر اس دنیائے فانی میں ہیکر وارد ہوئے لیکن دنیا کے بے شمار علوم سے ان کی گہری واقفیت نے ہمیشہ ان کے اوصاف وکمالات کی جلا کی اور قدرت نے جو ذہانت اور بیداری شعور

انہیں عطا کی تھی، ان سے تا دمِ مرگ ان کے علوم میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا ظاہر کسی پہ نمایاں نہیں ہوتا تھا کہ ان کی ہستی علم کا سمندر ہے لیکن ان کے باطن سے جن کی وابستگی ہو جاتی تھی ان کی شخصیت ان کو حیرت میں ڈال دیتی تھی، ہر نوعیت کے علم کو پڑھ لینا دوسری بات ہے لیکن اپنے ذہن کے گوشوں میں محفوظ کر لینا ہر شخص کے بس کا کام نہیں۔ جس میں ایسے اوصاف و کمالات ہوں گے اس کو دنیاوی و دینی علوم کا چلتا پھرتا اور بولتا ہوا (Encyclopedia) کہا جائے گا۔ گھر والوں کو اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی علم سے اپنی پیاس بجھانے والے نے اگر کتبوں، مخطوطات یا کتابوں میں چھپے ہوئے رموز و نکات کی عقدہ کشائی کے لئے ان سے درخواست کی تو فوراً انہوں نے قلم اور کاغذ ہاتھوں میں لینے کے لئے ایسا کہا اور اس طرح تقریر شروع کر دی جیسے کہ اپنے سوالات کو حل کرنے کے لئے کوئی طالب علم اسباق کو یاد کر لیتا ہے اور بوقت امتحان اس کے قلم اگلنے لگتے ہیں۔

مرحوم کے زیادہ تر اوقات کتب بینی اور انشاپردازی میں گذرتے تھے۔ مجموعی طور پر ہر صاحب علم اپنے مذاق کے مطابق کوئی نہ کوئی خاص راہ نکال لیتا ہے اور اس کا Taste ذہن تک محدود رہتا ہے لیکن مرحوم کی علمی شخصیت اس مقابلے میں خصوصی انفرادیت رکھتی تھی کہ علوم کے معاملے میں وہ کسی خاص Taste تک اپنے کو محدود نہیں رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ فنون لطیفہ کا جہاں تک تعلق ہے موسیقی، خطاطی، مصوری، رقص، ادب غرضکہ تمام صنعتوں کا نہایت ہی گہرا مطالعہ ان کا تھا، ان کے مذہبی علوم کا جہاں تک تعلق ہے تصوف کے تمام رموز و نکات کی انہوں نے چھان بین کی تھی ان سبھوں کا اندازہ مذکورہ بالا اقتباسات سے ہوگا۔

مختصر یہ کہ فصیح الدین بلخی مرحوم کے اوصاف و کمالات کو بیان کرنے کے سلسلے میں صرف یہی کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ وہ اعلیٰ پایہ کے محقق و ناقد تھے۔ ایک اچھے شاعر تھے یا ایک نامور مورخ۔ جس قدر علوم ان کے سینے میں محفوظ تھے اس کا بہ مشکل ایک تہائی حصہ انہوں نے چھوڑا جس کے کچھ حصے مطبوعہ ہیں اور کچھ ہنوز محروم طباعت رہے۔ ان کے علوم کا اکثر سرمایہ ان کے سینہ پر محفوظ رہا، آرزو انہیں ضرور تھی کہ انہیں بھی بطور یادگار چھوڑ جائیں لیکن وقت اور عدیم الفرصتی نے انہیں موقع نہیں دیا اس لئے انہوں نے ایسا شعر کہا ہوگا سے

یوں دل کی آرزو دلِ مضطر میں رہ گئی
آندھی سی اُٹھکے گنبدِ بے در میں رہ گئی

مذکورہ بالا سطور میں جو اقتباسات فصیح الدین بلخی مرحوم کے اوصاف وکمالات کو بیان کرنے کے سلسلے میں پیش کئے گئے ہیں وہ ذمہ داران اہلِ قلم حضرات کے ہیں۔ یہ اہل علم حضرات ان کی عالمانہ شخصیت سے متاثر تھے اور متاثر ہیں چنانچہ ان کی علمیت کو مدنظر رکھ کر ان کی خوبیوں پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کا اس اعتبار سے ان کے ساتھ گہرا تعلق نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ان کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جیسا کہ ان کے گھر والوں کا ان کے ساتھ تھا جنہوں نے بہت قریب رہ کر ان کی حالت کو دیکھا۔ ان سے انتہائی قربت کا جہاں تک تعلق ہے ان کی شریکِ حیات ان کے لڑکے کے سوا کسی دوسرے کو نہیں پیش کیا جاسکتا۔

ان کی ازدواجی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے اول تا آخر خوشگوار رہی۔ ان کی شریکِ حیات تادمِ آخر دائم المرض تھیں۔ مرحوم نے اپنی شریکِ حیات کا تازندگی ہر ممکن علاج کیا لیکن اس کا بھی کچھ حوصلہ افزا نسخہ برآمد نہ ہوا اسی غم سے وہ زندگی بھر متاثر رہے لیکن صبر وتسکین اور تحمل وقناعت ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس کی ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ ان کی شریکِ حیات کہتی تھیں کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مرحوم جب فکرِ معاش میں حد درجہ پریشان تھے اور گھر کی ساری پونجی ختم ہوگئی تھی تو فاقہ سے بُرا حال تھا۔ انہوں نے اس کا اظہار اپنے شوہر کی اجازت سے اپنے میکہ والوں سے کرنا چاہا، مرحومہ ایک چھوٹے موٹے دال روٹی میں خوش زمیندار کی بیٹی تھیں جس کا ذریعہ معاش اس کے علاوہ پیشۂ طبابت بھی تھا۔ اگر ادھر خبر ہوتی تو فوراً یہ دشواری حل ہوجاسکتی تھی۔ مرحوم نے قرآن کریم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا' خدا جس کو پیدا کرتا ہے اس کے رزق کا سامان مہیا کرتا ہے یہ کہتے ہوئے اُٹھے گھر کے اندر خانہ تلاشی میں مشغول ہوگئے۔ ایک ٹوکرا میں کچھ پرانی شیشیاں دواؤں کی جمع تھیں، شریکِ حیات کو کہا گیا کہ ان شیشیوں کو دھویا جائے جب شیشیاں دھودی گئیں تو انہیں تھیلا میں رکھا گیا اور مرحوم ہاتھ میں تھیلا لے کر باہر چلے گئے بازار سے کچھ چیزیں آئیں اور کھانا پکا اور فاقوں کی آگ بجھائی گئی۔

اس واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ غیر متوقع طور پر سرائے کیلا سے ریڈیو افسر کا پروانۂ ملازمت

آگیا۔ ایک عرصہ ہوا تھا کہ مرحوم نے درخواست بھیجدی تھی مگر انتظار اس کا تھا کہ انٹرویو میں بلایا جائے گا۔ لیکن یہاں تو سیدھے پروانۂ ملازمت آگیا۔ پاس میں صرف دو تین کھدر کے کرتے اور پاجامے تھے۔ آپس میں مشورہ ہوا کہ زیور رہن رکھ کر کچھ کپڑے جلد از جلد بنوائے جائیں اور ریل کے کرائے کی صورت نکالی جائے تاکہ دوسرے روز مرحوم روانہ ہوجائیں۔ اس بیچ میں بڑے بھائی صاحب حفیظ الدین بلخی مرحوم یک بیک تشریف لے آئے اور فوراً حکم دیا کہ تم آج ہی رات کو روانہ ہوجاؤ۔ مرحوم نے معذوری ظاہر کی اور دوسرے دن روانہ ہونے کے ارادے سے انہیں آگاہ کیا۔ بڑے بھائی فوراً تاڑ گئے کچھ بولے نہیں پہلے گھر واپس گئے وہاں سے چنی میاں کو بھیجا کہ وہ فوراً مرحوم کو اپنے ساتھ لے آئیں۔

مختصر یہ کہ رات ہوتے ہوتے کپڑوں کا انتظام بھی ہوگیا اور مرحوم اس روز نوکری پر روانہ ہوگئے۔ اس واقعہ سے ان کے ضبط و تحمل کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے صاحبزادے نادم بلخی کا کہنا ہے کہ اگر مرحوم کو اپنے لڑکے کی حرکت ناگوار معلوم ہوتی تو بجائے غصہ کرنے کے وہ سمجھاتے تھے اور حق و صداقت کو انہوں نے کبھی بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس سلسلے میں دو مثالیں نہایت دلچسپ ہیں۔ مرحوم چند دنوں ریاست سرائے کیلا میں مجسٹریٹ تھے۔ ایک بھنیاں مرحوم کے بنگلے پر روزانہ تین وقت صبح، دوپہر اور شام کنویں سے پانی بھر کر پہنچاتا تھا، پانچ برسوں تک لگاتار پانی بھرنے کی ملازمت ان کے یہاں وہ کرچکا تھا، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چوری کے مقدمہ میں وہ ماخوذ ہوگیا۔ الزام اس پر ایک شخص کے بیل چرانے کا نہیں تھا بلکہ رنگے ہاتھ پکڑے جانے کا بھی تھا۔ مقدمہ بھی مرحوم کے اجلاس میں تھا۔ اس واقعہ نے گھر کے اندر کھلبلی مچادی تھی۔ مقدمہ کے سلسلے میں کسی کو سفارش کی ہمت نہیں تھی پھر بھی مرحوم سے اس پر نگاہ کرم کے امیدوار ضرور تھے۔ سبھوں کو اس رویہ سے ظاہر تھا جب مرحوم نے فیصلہ سنایا تو پولس نے فوراً ہتھکڑی ڈال دی۔ بے چارہ چار ماہ تک قید بامشقت کے برے دن گذار کر گھر لوٹا تو وہ سب سے پہلے بنگلے پر آیا اور قدموں پر گر کر معافی مانگنے لگا اور گھر والوں سے بھی سفارش کی التجا کی کہ اس کی ملازمت برقرار رہے۔

چار ماہ تک جب وہ جیل خانہ میں رہا، پانی کی گھر کے اندر سخت دشواری رہی اس لئے کہ بنگلے سے کنواں دور تھا۔ گھر کا نوکر حبیب حد درجہ مشغول تھا غرضکہ مشکل سے پانی کا انتظام ہوتا تھا

لیکن جب وہ واپس آیا تو اسے ملازمت پر بحال کر لیا گیا اور وہ ۱۹۴۶ء تک کام کرتا رہا اور اس وقت چھوڑا جبکہ مرحوم اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ حقیقت کے جاننے کے لئے بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ کسی مقدمہ کے سلسلے میں مرحوم جائے وقوع کا معائنہ کرنے کے لئے نکل جاتے تھے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شریف بنگالی جنکا نام "گورا بابو" تھا کچھ دشمنوں نے انہیں ایک مقدمہ میں پھنسا دیا اور صورت یہ پیدا کی گئی کہ ایک بدچلن عورت کو ایک تاریک گلی میں جدھر سے بنگالی بابو اپنے گھر جاتے تھے کھڑا کر دیا۔ کہنے کے لئے اس مقدمہ میں چشم دید گواہ بھی تھے لیکن مرحوم کا کہنا ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد کا معاملہ کھل کر سامنے آیا، چنانچہ کئی گواہوں نے بیان میں اندھیری رات کا ذکر کیا حالانکہ چاند کی بارہویں تاریخ تھی اس وقت چاند کی روشنی کو شباب پر ہونا چاہئے تھا چنانچہ جائے وقوع کا معائنہ کرنے کے بعد مقدمہ جھوٹا ثابت ہوا، چنانچہ بے قصور بنگالی کو رہا کر دیا گیا۔

مقدمہ کے فیصلے کرنے والے ایک حاکم کی حیثیت سے ان کی ذات کو فخر حاصل تھا کہ ان کے فیصلے اپیل میں ان کی مجسٹریٹی کی لگ بھگ بیس یا بائیس برسوں کی زندگی میں دو چار ہی ٹوٹے ہوں گے۔ یہ گھر والے جانتے ہیں کہ مرحوم نے عمر بھر سیاہ جوتا اور سیاہ موزہ کبھی نہیں پہنا۔ ان کے صاحبزادے نے ایک بار اس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے صرف یہی کہا کہ میرا جی نہیں چاہتا اور طبیعت گوارہ نہیں کرتی اس لئے کہ خانہ کعبہ کا غلاف سیاہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مرحوم سنگھ بھوم کے جنگل میں ہرن کے شکار میں پا پیادہ جا رہے تھے۔ لڑکے کی عمر بارہ سال کی ہوگی۔ سر راہ ایک میدان کے کھلے حصے میں جنگلی کبوتروں کا ایک بڑا جھنڈ تھا ساتھ ہی مرحوم کا حد درجہ شوخ وعزیز Orderly سمیٹے رام نامی ایک کول تھا دونوں نے کبوتر کے شکار پر زور دیا، مرحوم خاموش آگے بڑھتے رہے۔ چنانچہ دونوں کو اس کا بہت افسوس ہوا اتفاق سے ہرن کے شکار میں بھی ناکامی ہوئی گھر آئے پھر لڑکے نے پھر ان جنگلی کبوتروں کا ذکر کیا اس پر مرحوم نے فرمایا کہ کبوتر کے شکار کے لئے میرے ہاتھ کبھی نہیں اٹھتے۔ گرچہ کبوتر حلال پرندہ ہے۔ خیال فوراً دماغ میں آتا ہے کہ کبوتروں کا مسکن خانہ کعبہ بھی ہے۔

ان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے یہ نہایت ہی چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں ان پر غور کیجئے تو ان کے مذہبی جذبوں، ان کے اوصاف و کمالات، کے باریک پہلوؤں کے یہ چھوٹے چھوٹے واقعات

عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ اوصاف وکمالات کہاں تک بیان کیے جائیں اس کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ چند باتوں پر اکتفا کیجئے۔

وفات

فصیح الدین بلخی مرحوم پٹنہ یونیورسٹی کی ملازمت کے آخری دنوں میں گردے کے مرض میں مبتلا ہوئے چنانچہ اس مرض نے بھیانک شکل اختیار کرلی اور جان لیوا بھی ثابت ہوا حالانکہ یونیورسیٹی کے اعلیٰ حکام اس بات کے خواہش مند نہیں تھے بلخی صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوں۔

ایک روز بلخی صاحب مرحوم جب یونیورسیٹی سے شام کے وقت اپنے گھر لوٹے، دوسرے دن علی الصباح انہیں قارورہ میں خون آنے لگا۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنے مرض کا معائنہ پٹنہ کے مشہور ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر اے۔ کے سین سے کرایا لیکن بعضوں نے مرض سے اچھے ہونے کی ناامیدی ظاہر کی۔ بلخی صاحب مرحوم کو گردے کا یہ مرض ۱۹۶۰ء کے آخری مہینہ میں شروع ہوا اس درمیان ان کا علاج ہوتا رہا لیکن خاطر خواہ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر کار جنوری ۱۹۶۲ء کے آخری ایام میں اس مرض نے سخت پیچیدگی اختیار کرلی۔ بلخی صاحب مرحوم اپنی زیست سے ناامید ہو گئے۔ بلخی صاحب مرحوم کا داخلہ ڈاکٹر ہاشم اور ڈاکٹر ار۔ بی۔ پی۔ سنہا نے پٹنہ ہسپتال کے راجندر سرجیکل بلاک میں کرایا جہاں ان کا علاج ہوتا رہا انہیں کئی بار خون چڑھانا بھی پڑا، ایک مرتبہ ان کے صاحبزادے پروفیسر نادم بلخی نے بھی اپنا خون دیا۔

بلخی صاحب مرحوم کی عیادت کے لئے کافی حضرات دوران علاج ہسپتال آتے رہے ان میں ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم، ڈاکٹر صدرالدین فضا مرحوم، پروفیسر سید حسن عسکری، ڈاکٹر قیام الدین احمد، ڈاکٹر مظفر اقبال اور پروفیسر عبدالمغنی کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ یونیورسیٹی کے ارکان بھی ان کی مزاج پرسی کے لئے آتے رہے، ماسوا اس کے بلخی صاحب مرحوم کے بہت سارے ملاقاتی اور شہر کے معزز حضرات برابر ہسپتال میں آتے رہے۔

بلخی صاحب مرحوم کی علالت کے دوران ان کے رشتہ داروں میں ان کے ہم زلف سید عبدالرحیم احمد مرحوم، ان کے بھتیجے شفیع الدین مرحوم، ان کے نسبتی برادر زادہ سید امین اشرف بلخی اور

ان کے رشتہ کے بھانجے سید نہال حسین ان کی تیمارداری میں برابر پیش پیش رہے۔

آخر وہ گھڑی آگئی جس کا انتظار بلخی صاحب مرحوم کو خود تھا یعنی ۱۳ مارچ کی شب کو گذار کر یعنی ۱۴ مارچ کی رات کے ایک بج کر بیس منٹ پر بلخی صاحب مرحوم کی روح عنصری پرواز کر گئی بلخی صاحب مرحوم کے وصال کے وقت ان کے صاحبزادے نادم بلخی، ان کے ہم زلف محمد محی سید رحیم الدین احمد، ان کے بھتیجے سید شفیع الدین بلخی مرحوم اور ان کے بھانجہ سید محی الدین احمد موجود تھے۔

صبح کے وقت ان کی میت گھر پر لائی گئی اور ان کی تجہیز و تکفین کا سامان شروع ہوا، حالانکہ بلخی صاحب مرحوم نے ایسی کوئی وصیت نہیں کی تھی کہ کہاں ان کو دفن کیا جائے۔ بلخی صاحب مرحوم کے صاحبزادے نادم بلخی نے یہ کوشش کی کہ انہیں اپنے آبائی قبرستان موضع جیٹھلی میں دفن کیا جائے جہاں ان کے والد ڈاکٹر غیاث الدین بلخی مرحوم اور ان کی والدہ بی بی ہاجرہ مرحومہ آرام فرما ہیں لیکن اس میں ناکامی ہوئی، آخر کار بلخی صاحب مرحوم کے برادر نسبتی سید محمد بشیر بلخی کے صاحبزادے جناب امین اشرف بلخی نے انہیں محلہ دوندی بازار میں ان کی آخری آرام گاہ بننے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کو ان کے نن سسر جناب سید شاہ امین اللہ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

بلخی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد صوبہ بہار کے مختلف ادبی رسالوں نے اپنے اداریہ میں اظہار تاسف کیا، ان میں رسالہ صبح نو پٹنہ، رسالہ اشارہ پٹنہ، رسالہ سہیل گیا اور رسالہ کوئل ڈالٹن گنج کے مدیروں نے اپنا الگ الگ اظہار تاسف کیا۔

رسالہ 'صبح نو' کے مدیر جناب وفا ملک پوری اپریل ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں بلخی صاحب کی موت کا تاثر "ایک شمع تحقیق بجھ گئی" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> "گذشتہ ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء کو چند دنوں کی علالت میں اردو کے مشہور اہل قلم جناب سید فصیح الدین بلخی مرحوم نے انتقال فرمایا، مرحوم اردو کے ایک کہنہ مشق لکھنے والوں میں تھے بالخصوص تحقیق و تنقید میں ان کا اہم مقام تھا، تمام عمر لکھنے لکھانے میں گذاری اور آخری وقت تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے اور یہ تمام علمی اور قلمی خدمتیں سرکاری و نیم سرکاری ملازمتوں کی پابندی میں رہ کر انجام

مرحوم نیک اور پاک باطن بزرگ تھے اپنے خردوں سے بھی بڑی محبت و شفقت اور فروتنی سے ملتے تھے، نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے..... بلاشبہ ان کی موت اردو کے لئے ایک عظیم حادثہ ہے..... جناب مرحوم کے وابستگان میں ان کے لائق فرزند پروفیسر ناوم بلخی سے دلی ہمدردی ہے، خدا ان کو صبر اور مرحوم کو جوارِ رحمت عطا فرمائے۔

رسالہ "اشارہ" کے مدیر جناب قیوم خضر نے بلخی صاحب مرحوم کے وصال سے متاثر ہو کر اپنے رسالہ "اشارہ" پٹنہ کے اپریل ۱۹۶۲ء کے شمارے میں "ہماری ادبی عمارت کا ایک ستون گر گیا" کے عنوان سے لکھا۔ نیز انہوں نے بلخی صاحب مرحوم کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

قیوم خضر اپنے رسالہ کے اداریہ میں یوں لکھتے ہیں:

"۲۴ر مارچ ۱۹۶۲ء کو ملک کے مشہور و معروف مستند ادیب، نقاد، مورخ حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ افسوس کہ بہار کے ادبی و علمی عمارت کے ستون گرتے جا رہے ہیں اور سب سے افسوس کی بات ہے کہ ان کی جگہ پر نئے ستون کے قائم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بلخی صاحب مرحوم ان ادیبوں میں تھے جنہوں نے اردو کے دامن میں کچھ نئے پھولوں کا اضافہ کیا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم زندگی بھر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی طرح خموش رہ کر کام کرنے والوں کی کمی ہے تحقیق و تنقید ان کا محبوب فن تھا، تاریخ پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے تاریخ مگدھ لکھ کر بہار کے نام کو اونچا کیا، شاید انگریزی کے علاوہ ہندوستان کے کسی بھی زبان میں بہار کی ایسی تاریخ موجود نہیں ہے۔ تذکرہ نسوانِ ہند کو اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت حاصل ہے، تذکرہ ہندو شعرائے بہار بھی ترتیب دے رہے تھے۔ اگر کچھ دنوں تک زندہ رہتے تو شائع ہو جاتا...... بلخی صاحب مرحوم سے میں بہت قریب تھا، وہ مجھے بہت مانتے تھے، "اشارہ" میں ان کے کافی مضامین شائع ہوئے جو کسی دوسرے رسالہ میں شائع

نہیں ہوئے۔"

رسالہ "کومل" ڈالٹن گنج نے اپنے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء کے اداریہ میں بلخی صاحب کی موت سے متاثر ہوکر اپنا گہرا اظہار تاسف پیش کیا چنانچہ مدیر رسالہ "کومل" نے فصیح الدین بلخی نمبر نکالنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ بہت سارے اہل قلم نے بلخی صاحب کی شخصیت اور فن پر اپنے تاثرات قلمبند کرکے ادارہ رسالہ کومل" کو ارسال کیا، لیکن رسالہ کومل کچھ ناسازگار حالات کا شکار ہوا، یہ مسودات راقم کے پاس محفوظ ہیں۔

رسالہ "سہیل" گیا نے اپنے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء کے اداریہ میں بلخی صاحب کی موت سے متاثر ہوکر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا چنانچہ ابو اللسان جناب بسمل سنسہاروی مرحوم نے بلخی صاحب مرحوم کی موت سے متاثر ہوکر ایک قطعہ تاریخ وفات لکھا جو رسالہ سہیل کے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا، قطعہ تاریخ وفات یہ ہے ؎

قطعہ تاریخ وفات از ابو اللسان بسمل سنسہاروی گیاوی

بگوشم از عظیم آباد ایں ناگہ خبر آمد　　فصیح الدین بلخی زیں جہاں ہیہات رخصت شد
چہ گویم شرح غم از انتقال پر ملالِ او　　بپا در مجلس علم و ادب شور قیامت شد
سنین رحلت او گفت بسمل از سر ابجد　　فصیح الدین بلخی وارد ایوان جنت شد

۱۹۶۲ء

قطعہ تاریخ وفات از بلبل بہار فردوسی ہند حضرت سرور کابری گیاوی مینائی

جناں کو گئے بلخی پاک باطن　　زمانے میں ہے ماتم مرگ بلخی
سرور از سر آہ سال وفاتش　　یہ کہدو کہ اے داغ مرگ بلخی

۱۹۶۲ء

اس کے علاوہ بلخی صاحب مرحوم کی موت سے متاثر ہوکر علامہ جمیل مظہری، نواب نقی جان قمر گیاوی اور سید محمد یوسف وکیل عظیم آبادی نے تاریخ وفات لکھے جو حسب ذیل ہیں:

دنیا ہے اک مرقع شادی و غم کا بے شک — گل ہو رہے ہیں خنداں شبنم گر ہے گریاں
تھا کل وطن میں جس سے برج علوم روشن — وہ آفتاب تاباں زیر زمیں ہے پنہاں
عیسیٰ نفس کے غم میں دم پر بنی ہوئی ہے — زندہ تو ہوں بظاہر لیکن ہوں مثل بے جاں
یا رب غم پدر میں نادم کو صبر دے تو — اس مہر کا یہ پرتو ہو اور بھی فروزاں
رحلت کی اے قمر ہے تاریخ عیسوی میں — ہے ہے فصیح بلخی فیاض کامل انساں

۱۹۶۲ء

قطعۂ تاریخ وفات از نتیجۂ فکر علامہ جمیل مظہری

آج ہے فردوس کا منظر مرے پیش نگاہ — بادہ خواران معانی جمع ہیں ساقی کے پاس
سیڑھیوں پر حوض کوثر کے ہیں سعدی و کبیر — زیر طوبیٰ الکتیؔ و ہومر ہیں فردوسی کے پاس
شاد و آتش ہیں عراقی و فغانی کے قریب — میکدے میں میر و غالب حافظ و عرفی کے پاس
اس طرف ارباب فکر اور اس طرف ارباب فکر — اہل دل رومی کے پاس اہل خرد رازی کے پاس
با ادب بیٹھا ہے ابن رشد ارسطو کے قریب — کانٹ اور ہیگل ہیں سرگرم سخن طوسی کے پاس
ہے سیاسی بحث میں چانکیہ نظام الملک سے — ہنس رہا ہے مارکس افلاطون یونانی کے پاس
چھنتی ہے گاڑھی لب کوثر میں خیام و ریاض — اور جگر نہر لبن پر کیٹس اور شیلی کے پاس
شہپر شاہیں لئے اقبال بھی ہیں زیر عرش — ہم سخن جبریل سے سدرہ کی ایک کھڑکی کے پاس
الغرض ہے خلد وہ بزم طرب جس میں جمیل — ہیں سبھی اپنے رفیق فکری و ذہنی کے پاس

با دل شاداب ہاتف ہم کو دیتا ہے خبر
کہہ فصیح الدین بلخی آج ہے شبلی کے پاس

۱۳۸۱ھ

قطعہ تاریخ وفات از نتیجہ فکر جناب سید محمد یوسف وکیل

صاحب علم و ہنر شد سوگوار و اشکبار — حادثہ افتاد چوں امروز فاجع و تبیح
گفت پدرے دریں حیات دنیوی را الفراق — آں طبیبے کہ مریض جہل و ظلمت را مسیح

آں سراپائے تلاش و جستجوئے گم شدہ — آں کہ آثارِ قدیمہ را نشاں دادہ صریح
آں سخن سنج و شناسائے نکاتِ شاعری — آں کہ گفتہ فاش و بیدا چہ سیاہ و چہ صبیح
ہاتفم گفتا چو کردم فکرِ تاریخِ وصال — وقت باید کہ مثیلِ تو دگر آید فصیح

۱۹۶۲ء

مکتبِ علم و حکم ویرانہ کردی یا فصیح

۱۳۸۱ھ

بلخی صاحب مرحوم کے مزار کے کتبہ کا قطعہ تاریخ وفات جناب سید محمد یوسف وکیل نے لکھا۔ جو اُن کے مزار کے سرہانے خوبصورت سنگ مرمر پر کندہ ہے۔

قطعہ تاریخ وفات حضرت فصیح الدین بلخی

ازبس کہ جہاں است بسے زشت و قبیح — جاں داد و بگریختہ زیاں مرد صبیح
ایں کتبہ بخواں کہ سال مرگ است ایں — آسودہ بایں تربت صاف است فصیح

۱۹۶۲ء

باب چہارم

صوبہ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء

فصیح الدین بلخی کے عہد تک

اُردو نثر کے آغاز کے سلسلے میں صوفیوں، مبلغوں اور عالموں نے جو کارنامے انجام دئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ان بزرگانِ دین کی تصنیفات کا واحد مقصد تبلیغ اسلام تھا، چنانچہ ان صوفیوں نے مقامی زبان میں رسالے لکھے۔ ظاہر ہے یہ زبان ابتدا میں ادبی اہمیت کی حامل نہ تھی لیکن ان صوفیائے کرام کا فیض تھا کہ ان کی مقامی بولی میں لکھے ہوئے رسالے اردو زبان و ادب کی تعمیر کے سلسلے میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاہ عماد الدین قلندر اب تک کی تحقیق کے مطابق ان کی تصنیف "رسالہ صراط مستقیم عرف سیدھا راستہ" بہار کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ اس ضمن میں قاضی عبدالودود کی یوں رائے ہے۔

[1] "کتاب "سیدھا راستہ" کا سال تصنیف ۱۰۸۱ھ بتایا گیا ہے۔ اگر واقعی گیارہویں صدی کا لکھا ہوا ہے تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صوبہ میں نثر و نظم اردو کا اس سے قدیم نمونہ اس وقت تک دستیاب نہ ہوا ہے"۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی تحقیقی کتاب "اردو نثر کا آغاز و ارتقا" میں اردو زبان کی پہلی نثری تصنیف "حنوتیہ" بتائی ہے۔ یہ مختصر رسالہ اخلاق و تصوف کے رموز و نکات پر مشتمل ہے۔

[2] "رسالے کی تصنیف کا جو قدیم ترین سنہ مقرر کیا جاتا ہے وہ ۸۰۲ھ کے بعد ہوگا"۔

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ۱۸۰۱ء تک مصنفہ ڈاکٹر اختر اورینوی ص ۳۵۱، ۳۵۸

[2] اردو نثر کا ارتقا۔ رفیعہ سلطانہ بحوالہ شاد کی نثر نگاری مرتبہ وہاب اشرفی ص ۱۷۸

حضرت ظہور الحق ظہور : شاہ عماد الدین قلندر کے بعد جناب ظہور الحق کی شخصیت قابلِ ذکر ہے، موصوف کے چار نثری رسالے خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی میں محفوظ ہیں، رسالہ نماز، فضائل رمضان، فیض عام اور کسب النبی۔

رخشاں ابدالی کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں رسالے یعنی رسالہ نماز اور فضائل رمضان ۱۲۲۰ھ کے قبل لکھے گئے۔ فیض عام کا سنہ تصنیف ۱۲۲۹ھ ہے اور رسالہ کسب النبی کا ۱۲۳۰ھ ہے۔ رسالہ نماز اور فضائل رمضان کے نفس مضمون ان کے نام سے ظاہر ہے، فیض عام بھی دینی امور سے متعلق ہے لیکن رسالہ کسب النبی کی غرض مسلمانوں کو صنعت و حرفت کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

حضرت محمد تقی بلخی فردوسی : حضرت بلخی حضرت ظہور الحق کے ہم عصر تھے ان کی کتاب احکام الٰہی کا قلمی نسخہ جناب اختر اورینوی کو پروفیسر ذکی الحق بی۔ان۔کالج پٹنہ سے ملا تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" میں ص ۳۵۷ تا ص ۳۶۱ میں ذکر کیا ہے، اس تصنیف کی کتابت ۱۲۵۶ھ میں شیخ خیرات علی نے کی۔ اختر صاحب اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔

[1] "احکام و عقائد، ایمانیات، شرح اعمال اور تفصیل شریعت کے متعلق عمدہ کتاب ہے۔"

حضرت سید شاہ عطا حسین منعمی گیاوی : موصوف کی نثری تصنیف دید مغرب بہ ہدایۃ المسافر کے متعلق رخشاں ابدالی یوں لکھتے ہیں :

[2] "اس کے مصنف حضرت سید شاہ عطا حسین منعمی ۱۲۳۱ھ تا ۱۳۱۱ھ مصنف کشف العارفین و کنز الانساب (فارسی) ہیں ہدایۃ المسافرین حضرت کا مفصل سفرنامہ حج کی تین ضخیم جلدیں ہیں۔ سیر الہند ہندوستان کے مشہور شہروں کے حالات پر مشتمل ہے۔"

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ۱۸۰۱ء تک مصنفہ ڈاکٹر اختر اورینوی ص ۳۵۱ تا ۳۵۸

[2] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء

(۲) ذائرِ عرب (۳) کیفیت مراجعت، کتاب کی تالیف سنہ ۱۲۶۰ھ سے شروع ہو کر سنہ ۱۲۶۴ھ کو اختتام کو پہنچی اس کی پہلی جلد سیر الہند کا کچھ حصہ خانقاہ منعمیہ رام ساگر گیا میں محفوظ ہے اور افسوس کہ بقیہ حصص آج مفقود ہے۔"

ڈاکٹر اختر اورینوی سیر الہند کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

سلہ "سیر الہند کی زبان مقفیٰ و مسجع رنگین و پر تصنع ہے۔"

سید محمد اسحاق عرف پیر دمڑیا: اختر صاحب نے اپنی تصنیف "بہار میں اردو زبان و ادب کے ارتقا" میں موصوف کے دو نثری رسالے کا ذکر کیا ہے ایک کا نام اصول احکام شرع اور دوسرے کا نام جذبات معینہ ہے۔ حضرت پیر دمڑیا فاطمی المرتضوی نسب تھے، شعر بھی کہتے تھے اور تخلص فقیر فرماتے تھے یہ محلہ بارہ دری (دائرہ) کے رہنے والے تھے۔ اختر صاحب کا بیان ہے:

سلہ "یہ رسالہ اجمیر شریف کا سفر نامہ ہے نثر کے بین بین ابیات و اشعار مصنف کے درج ہیں۔ کہیں کہیں پوری غزل بھی ہے، منظوم کی کثرت ہے .... مصنف کئی بار اجمیر شریف کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے مگر مقصد پورا نہ ہوا۔ آخرش روز دوشنبہ تاریخ ساتویں صفر ۱۲۷۱ھ مطابق چودھویں کارتک ۱۲۶۱ فصلی روانہ عظیم آباد ہوئے۔

حضرت پیر دمڑیا کا دوسرا رسالہ اصول احکام شرع ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے، قصہ مہندی منظوم کے ساتھ مجلد ہے، اختر صاحب کہتے ہیں:

"رسالہ کا سال تصنیف کہیں درج نہیں، نیز یہ کہ اس کی زبان صاف اور رواں ہے لیکن طرز مقفیٰ کے نمونے ملتے ہیں۔"

عالم علی عظیم آبادی: رخشاں ابدالی نے اپنے متذکرہ مضمون میں فارسی تصنیف "بوستان خیال"

سلہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا مصنفہ ڈاکٹر اختر اورینوی ص ۳۶۲

سلہ " " " " " ص ۳۷

مصنفہ میر محمد تقی کے ایک ملخص ترجمہ زبدۃ الخیال کا ذکر کیا ہے انہوں نے اس کے مترجم عالم علی عظیم آبادی کے حالات لکھے ہیں، عالم علی عظیم آبادی نے بوستان خیال کا ترجمہ ۱۲۵۷ھ میں کیا، فارسی کی اصل کتاب سولہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ملخص کتب خانہ خانقاہ قادریہ اسلام پور میں محفوظ ہے۔ اختر صاحب عالم عظیم آبادی پر مزید روشنی نہیں ڈالتے۔

لیکن قاضی سعید کا یہ خیال ہے کہ عالم عظیم آبادی بھاگلپور میں سررشتہ دار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں (۱) بوستان خیال (۲) دہ مجلس (۳) عقائد فقہ (۴) ہدایۃ العارفین، اختر صاحب نے ایک شخص مولوی عالم عظیم آبادی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی ایک کتاب دہ مجلس انہیں شاہ فخر عالم سجادہ نشین خلیفہ حضرت شاہ شہباز بھاگلپوری کے کتب خانہ سے حاصل ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"دہ مجلس تالیف مولوی محمد عالم صاحب سررشتہ دار کمشنری اضلاع بھاگلپور وغیرہ واسطے پڑھنے محرم کی مجلسوں میں ۱۲۶۵ھ قدسی رمضان المبارک میں مطابق ماہ اگست ۱۸۴۸ء کے چھپوایا .... دہ مجلس کی تصنیف ۱۲۶۱ھ میں ہوگئی تھی۔"

مولوی شجاع الدین: رخشاں ابدالی اور اختر صاحب مولوی شجاع الدین رضوی کی ایک تصنیف مطبوعہ ۱۲۵۷ھ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ رسالہ جواز تعزیہ داری میں ہے اور جس میں ملا کرامت علی جونپوری کے رسالے قوۃ الایمان اور مولوی عظمت عظیم آبادی کے خیالات کو پیش کیا ہے کتاب کے جو نسخے ان محققوں کی نظر سے گذرے ہیں ان میں اس کا نام درج نہ تھا، ۹۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب چھپرہ میں چھپی تھی۔ اختر صاحب کا یہ خیال ہے کہ مولوی شجاع الدین کا وطن بہار شریف ہی ہوگا یا چھپرہ۔ موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ مصنف نے اس سے قبل تین اور رسالے رد نصاریٰ لکھ کر شائع کئے تھے، شاہ فخر عالم کے کتب خانہ سے اختر صاحب کو ایک اور کتاب ملی جس کا نام مجلس چہلم ہے، موصوف لکھتے ہیں:

"مجالس چہلم کے مصنف کوئی اور بزرگ ہوں گے جن کا تخلص حیدری تھا۔"

لہ ملاحظہ ہو 'بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا' مصنفہ ڈاکٹر اختر اورینوی ص ۳۷۲ تا ص ۳۷۷

اختر صاحب حیدری کو بہاری تصور کرتے ہیں، دراصل یہ کتاب حیدر بخش حیدری کی تصنیف گل معرفت مطبوعہ ۱۲۲۷ھ کا کوئی ایڈیشن ہو۔ اس کا تعلق بہار سے نہیں ہے۔

گل معرفت کے بارے میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"گل معرفت تصنیف کے اعتبار سے حیدری کی کتابوں میں آخری کتاب ہے.....

ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف روضۃ الشہدا نہایت مشہور اور اپنے موضوع کی بے نظیر کتاب ہے..... گل معرفت میں بھی روضۃ الشہدا سے شہدائے کربلا کے واقعات لئے گئے ہیں۔"

مولانا محمد احسن گیلانی : مولانا مناظر احسن نے ایک مضمون رسالہ 'ندیم' بہار نمبر ۱۹۳۳ء میں یہ لکھا ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی نے بنارس میں ۱۲۶۶ھ میں ایک رسالہ حقائق و اسرار معارف و نکات کے موضوع پر لکھا تھا، موصوف کا یہ خیال تھا کہ یہی رسالہ بہار میں اردو نثر کی پہلی کتاب ہے، رسالہ سید عارف مصنفہ حضرت عماد الدین قلندر کا سال تصنیف ۱۰۸۱ھ ہے۔ اس لئے محمد احسن گیلانی کی کتاب بہار کی پہلی نثری تصنیف نہیں ہو سکتی۔

بہار کے اردو نثر کے ارتقا میں مولانا ولایت علی اور عنایت علی صادق پوری کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں، اختر صاحب نے ان کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ یہ رسالے زبردست فکر کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

لہ فصیح الدین بلخی مرحوم کی تحقیق کے مطابق مولوی شجاع الدین کا وصال ۱۲۳۶ھ میں ہوا لہٰذا انہوں نے یہ رسالہ اپنی وفات سے قبل لکھا تھا۔ بلخی صاحب مرحوم نے رسالہ صبح نو اپریل ۱۹۵۸ء میں مولوی شجاع الدین اور ان کے اہل خاندان کے مزارات کے کتبات کی نقلیں شائع کی ہیں۔ اس مضمون میں تین مزارات کے کتبات کی نقلیں درج ہیں جن میں مولوی شجاع الدین کے والد حضرت نعیم اللہ بہاری، ان کی بیگم نواب گیتی آرا بنت رفعت النساء بنت شاہ عالم اور مولوی شجاع الدین علی کی، ان کتبات سے تاریخ وفات کے علاوہ دیگر واقعات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ مولوی شجاع الدین علی اور ان کے اہل خاندان کے مقبرے چہار دیواری متصل مسجد شیخ پورہ میں موجود ہیں۔

(۱) ردشرک (۲) رسالہ دعوت (۳) رسالہ شجرہ با ثمرہ (۴) بتیان شرک (۵) بدعت

ردشرک، مولانا کی فارسی تصنیف ہے لیکن یہ کتاب مولوی الٰہی بخش کے اردو ترجمہ کے ساتھ چھپی ہے۔ سنہ طباعت درج نہیں ہے، رسالہ دعوت مولانا کا یہ رسالہ اُردو میں ہے' اختر صاحب نے اس کا تصنیف ۱۲۳۱ھ بتایا ہے' اس میں کل سولہ صفحات ہیں۔

رسالہ عمل با حدیث: سولہ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مولانا نے فارسی میں لکھا تھا لیکن یہ مولوی الٰہی بخش کے ترجمہ ساتھ شائع ہوا۔

رسالہ بدعت: ۲۰ صفحات کا یہ رسالہ کلکتہ میں چھپا۔ اختر صاحب نے اس کی ایک نقل مولوی عبدالغفار صادقپوری سے حاصل کی تھی۔ اس رسالہ میں اشغال مراقبہ' خواب' رویائے صالحین' الہام' وحی اور اقسام الغامات سے بہت ہی تسلی بخش بحث کی گئی ہے۔

مولانا عنایت علی صادقپوری: اختر صاحب نے مولوی عنایت علی کے ایک رسالہ بت شکن کا انکشاف کیا ہے' سنہ تحریر درج نہیں ہے۔

مولوی فیاض علی: مولانا فیاض علی کے رسالوں میں فیض الفیوض قابل ذکر ہے' اس میں سوال وجواب اجتہاد' نقابت' تعلید' سنت' استنباط' تفکر فی الدین سے متعلق ہیں۔

اختر صاحب نے مندرجہ بالا علما کے تذکرہ پر ۱۸۵۷ء تک کی بہار کی اردو نثر کا جائزہ ختم کیا ہے.... لیکن اس عہد کے اندر چند دوسری تصنیفات سے بھی ہم متعارف ہوئے ہیں۔

وسیلۃ النجات: ترجمہ موسوم بہ سبیل النجات' وسیلۃ النجات کے مصنف آغا محمد احمد اصفہانی ہیں لیکن اس کا اردو ترجمہ ذوالفقار علی رضوی نے کیا ہے' سال ترجمہ ۱۸۱۸ء ہے۔

رسالہ گودن[۱]: اس کے مصنف بندہ وزیر خاں ساکن ضلع عظیم آباد ہیں اس کی کتابت ۱۲۵۶ھ میں ہوئی ہے' رسالہ کا موضوع ردعیسائیت ہے۔

قصہ غم ربا[۲]: یہ بہار دانش کا ترجمہ ہے' مترجم عابد حسین عظیم آبادی ہیں' سال اختتام ترجمہ

۱، ۲، ۳ ملاحظہ ہو بہار میں اردو از قاضی محمد سعید مطبوعہ ندیم اور ان کی کتاب فہرست نمائش اردو بحوالہ شاد کی نثر نگار ص ۵۵ تا ص ۵۶

۱۲۴۲ھ ہے۔

خوان الوان : اس کتاب کے مصنف سید حمید الدین بہاری ہیں، سید صاحب نے فارسی کی مشہور کتاب خوان الوان جو کھانا پکانے کے قیمتی نسخوں سے متعلق ہے اس کا ترجمہ آسان ہندوستانی زبان میں کیا، پروفیسر جاوید نہال کا خیال ہے کہ خوان نعمت کا نام الوان لکھا گیا ہے۔ خوان نعمت کا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا تھا۔

گلشن ہند : اس کے مصنف باسط خاں ہیں۔ موصوف کا شمار فورٹ ولیم کالج کے گمنام منشیوں میں ہوتا ہے، باسط خاں شاہ عالم کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے چنانچہ اس پرآشوب زمانہ میں انہوں نے آنکھ کھولی۔ چنانچہ باسط خاں کے والد مراد خاں کو ہجرت کرنے والے قافلے کے ساتھ عظیم آباد آنا پڑا اور عظیم آباد میں بودوباش اختیار کی۔ گلشن ہند ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی حکایات ذیلی داستانیں اور گل صنوبر کی کہانی درج ہے، طرز تحریر صاف و سادہ ہے۔ مصنف کے دیباچہ سے اس دور کی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔

شہادت نامہ : اس کے مصنف شاہ امیرالحق ہیں۔ ۱۸۴۵ء کے آس پاس لکھی گئی ہے۔

میلاد الرسول : شاہ امیرالحق کی دوسری تصنیف ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ ہے۔

ترجمہ چہار درویش : چہار درویش کے اردو ترجمہ کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر سید حسن عسکری کے پاس محفوظ ہے اس کا سال کتابت ۱۸۴۰ء ہے۔ مترجم کا نام مذکور نہیں لیکن قرینہ ہے کہ اس کے مترجم کوئی بہاری ہیں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم کی تصنیف 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' ۱۸۵۷ء تک محیط ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مظفر اقبال نے اپنا ایک گرانقدر تحقیقی مقالہ 'بہار میں اردو نثر کا ارتقا' ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک لکھا۔ بلاشبہ موصوف کا یہ ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔

چنانچہ اس تحقیقی مقالے کی بدولت کئی غیر معروف اور گمنام نثار کی شخصیتیں منظر عام پر آگئی ہیں۔ موصوف نے جس دماغ سوزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے وہ حد درجہ قابل تحسین ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس تحقیقی مقالے میں مصنفوں کی سوانح پر کوئی روشنی نہ ڈالی گئی ہے، انہوں نے بہار میں اردو نثر میں لکھی جانے والی کتابوں کا صرف سرسری جائزہ لیا ہے نیز انہوں نے نثر کی ہر صنف میں لکھی جانے والی تصنیفوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے مثلاً تاریخ[1]، تذکرہ[2]، سوانح عمری[3]، آپ بیتی[4]، سفرنامہ[5]، سیرۃ النبی[6]، طب[7]، ڈراما[8]، ناول وغیرہ[9] یا ان اخبار ورسائل کا بھی جائزہ لیا ہے جنکا تعلق اس دور سے ہے، بہرحال ڈاکٹر مظفر اقبال کا نام صوبہ بہار کے اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

---

[1]، [2] تاریخ اور تذکرہ کا ذکر آئندہ ابواب میں مفصل کیا گیا ہے جہاں بلخی صاحب کی تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

[3] سوانح عمری: (۱) نجات قاسم مؤلفہ شاہ محمد قاسم داناپوری مطبوعہ ۱۸۵۷ء (۲) احسن الشہادتین فی رموز السبطین۔ مؤلفہ شاہ رضا حسن مطبوعہ ۱۸۸۳ء (۳) تذکرہ مؤلفہ حکیم عبدالجلیل قادری (۴) المسمیٰ بہ بزم نورانی محفل ثانی درحالات طفولیت محبوب علی مؤلفہ محمد وحید قادری مطبوعہ ۱۸۸۹ء (۵) مسمیٰ بہ خاتم نوری مؤلفہ شاہ اکبر داناپوری (۶) تذکرہ فصیح مؤلفہ شجاعت علی آروی مرتبہ محمد شہرت عظیم آبادی ۱۳۱۰ھ (۷) یادگار گوہری مؤلفہ محمد زبیر ڈیانوانی (۸) افضل اسیر مؤلفہ محمد جرم داناپوری (۹) میلاد علی نیر خدا مؤلفہ عبدالوحید قادری (۱۰) فضل رحمانی مؤلفہ سید تجمل حسین دسنوی (۱۱) سیرۃ الشرف مؤلفہ سید ضمیر الدین (۱۲) وصف پاک قطب اعظم المعروف تحفہ یازدہم مؤلفہ مطبوعہ ۱۹۰۴ء (۱۳) سیرۃ شیر شاہ سوری مؤلفہ عبدالغفور داناپوری (۱۴) الحیاۃ بعد المماۃ معروف بہ مولانا سید محمد نذیر حسین کی سوانح عمری مؤلفہ فضل حسین مظفرپوری (۱۵) سیرۃ اللقب سوانح مکمل مخدوم شعیب و تذکرۃ الاعرابی مؤلفہ وزیر علی شیخ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی (۱۶) فیض سبحانی مؤلفہ شیخ بہادر علی خاں عاشق مطبوعہ ۱۹۱۳ء (۱۷) ریاض شفق مؤلفہ محمد اسمٰعیل ذبیح مطبوعہ ۱۹۱۴ء (۱۸) (۱۹) وسیلہ شرف اور ذریعہ دولت (باقی اگلے صفحہ پر)

فصیح الدین بلخی مرحوم کا تعلق جس دور سے ہے اس دور کی بہار کی اردو نثر ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد بہار میں اُردو نثر ایک ادبی روش اختیار کر لیتی ہے اور بہار میں اردو نثر نگاروں کا ایک کارواں نظر آتا ہے جن کی تصنیف و تالیف سے اردو نثر کی توسیع و اشاعت میں ایک بڑا کام سرانجام دیا۔ چنانچہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، عبدالغفور نساخ، علامہ شوق نیموی، پروفیسر عبدالغفور شہباز، عبدالغنی استھانوی، اکبر داناپوری، صوفی منیری، سید علی محمد شاد عظیم آبادی، نواب نصیر حسین خیال، نواب امداد امام اثر، علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہ اس کے علاوہ کئی نثار ہمارے سامنے آئے جنھوں نے بہار کی اُردو نثر کی الگ الگ صنفوں میں ایسی بیش بہا خدمات انجام

(نوٹ مسلسل) مصنف صوفی منیری (۲۰) رسالہ غریب نواز مؤلفہ اکبر داناپوری (۲۱) حیات خسروی مؤلفہ پروفیسر عبدالغفور شہباز کی یہ کتاب نامکمل رہ گئی (۲۲) قدیریہ مؤلفہ امداد امام اثر (۲۳) حیات حضرت خضر مؤلفہ عبدالغفور عظیم آبادی۔ (۲۴) عروج تقلیبن الملوک الحسین مؤلفہ سید مہدی پھلواروی (۲۵) داستان حضرت سلیمان مؤلفہ لطف اللہ (۲۶) حیات حضرت خضر مؤلفہ شاہ سلیمان (۲۷) حالات اخوند مؤلفہ عبدالغفور (۲۸) تذکرہ خواجہ معین الدین مؤلفہ فانی گیاوی۔

سے آپ بیتی (۱) تذکرہ بہادر خانی مؤلفہ شیخ بہادر علی خاں مطبوعہ ۱۸۸۷ء (۲) یادگار وطن مصنفہ شوق نیموی مطبوعہ ۱۸۹۴ء (۳) الدر منثور فی تراجم اہل صادقپور، اس تصنیف کے تین اڈیشن شائع ہوئے پہلی بار مصنف کی زندگی میں ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی، دوئم موصوف کے انتقال کے بعد سوئم ۱۹۶۴ء (۴) خیابان بے خزاں الموسوم بہ اہم تاریخی شہر و سرمایہ مصنفہ سید محمد مرتضیٰ شبیر صاحب رضوی مطبوعہ ۱۹۱۳ء۔

ھہ سفرنامہ: (۱) دید مغرب مصنفہ عطا حسین گیاوی (۲) سیر دہلی مؤلفہ شاہ محمد اکبر داناپوری۔ مطبوعہ ۱۸۹۴ء (۳) معین الحجاج یعنی سفرنامہ جدید حجاز مؤلفہ حاجی وحید الدین خاں مطبوعہ ۱۹۰۲ء (۴) سیر بنگال مؤلفہ شوق نیموی مطبوعہ ۱۹۰۲ء (۵) سفرنامہ حج مؤلفہ عبدالغفور رمضان پوری مطبوعہ ۱۹۰۸ء (۶) سیر شملہ مع تاریخ شملہ مؤلفہ سید احمد باروی ثم دہلوی (۷) رسالہ سبیل نجات مؤلفہ سید خیرات احمد مطبوعہ ۱۸۹۰ء کربلا معلیٰ کا سفر موصوف نے کیا تھا انہوں نے پابندی سے اپنا روزنامچہ لکھا (باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی اگلے صفحہ پر)

دیں اور ایسے نثاروں کا تعلق بلخی صاحب مرحوم کے عہد سے ہے اور مثال کے طور پر جناب قاضی عبدالودود، پروفیسر معین الدین دردائی، عطا کاکوی، ولی کاکوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، حمید عظیم آبادی، مولوی سید حسن رضا ثاقب عظیم آبادی، جناب وصی احمد بلگرامی، مولوی سید عزیز الدین بلخی مرحوم، جناب اختر اورینوی مرحوم، حافظ شمس الدین شمس منیری، جناب رخشاں ابدالی، انجم مانپوری، قاضی محمد سعید، سہیل عظیم آبادی، مولوی سید عبدالرؤف ندوی مرحوم، عبدالمالک آروی، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر سید حسن عسکری، ڈاکٹر سید صدرالدین فضا مرحوم، پروفیسر مسلم عظیم آبادی مرحوم، قاضی محمد سعید مرحوم، پروفیسر شاہ مقبول احمد اور مولوی سید احمد اللہ ندوی وغیرہ کا تعلق فصیح الدین بلخی مرحوم کے عہد سے ہے، ان بزرگوں نے بہار میں اردو نثر کی ترویج و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، ذیل میں ہم ان نثاروں کی تخلیقات کا مختصر طور پر جائزہ لے رہے ہیں۔

صفیر بلگرامی :- ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے اپنی تصنیف جلوہ خضر تلخیص و تنقید میں صفیر بلگرامی کی نثری تصنیف کی تعداد لگ بھگ چودہ بتائی ہے۔

(نوٹ مسلسل) ۲ے سیرۃ النبی : انوار ناصری مؤلفہ حکیم ناصر علی مطبوعہ ۱۸۶۴ء (۲) ناصر الحنین فی اخلاق سید المرسلین مؤلفہ ناصر علی غیاث پوری مطبوعہ ۱۸۷۲ء (۳) ناصر الاحبیب فی اسماء الحبیب مؤلفہ ناصر علی غیاث پوری مطبوعہ ۱۸۷۲ء (۴) مولود شریف شاہ اکرام مؤلفہ شاہ محمد اکرام مطبوعہ ۱۸۷۷ء (۵) فیض القلوب مؤلفہ محمد خیاض الدین پھلواروی مطبوعہ ۱۸۷۷ء (۶) میلاد شریف جدید مؤلفہ محمد اسماعیل صاحب مطبوعہ ۱۸۸۷ء (۷) افضل السیر ملقب بہشت گوہر جلد اول مؤلفہ عبدالرحیم داناپوری مطبوعہ ۱۸۹۴ء یہ کتاب ۸ جلدوں پر مشتمل ہے (۸) درظہور مؤلفہ محمد وزیر الدین، درظہور اسم تاریخی ہے ۱۳۲۵ھ (۹) خاتم النبیین مؤلفہ محمد اشرف علی قادری مطبوعہ ۱۹۰۴ء (۱۰) ذکر میلاد مؤلفہ غلام محمد عباس مطبوعہ ۱۹۰۶ء (۱۱) حدیقہ آخرت مؤلفہ شفق عماد پوری مطبوعہ ۱۹۱۰ء (۱۲) مولود شریف مؤلفہ سید محمد عمر کریم مطبوعہ ۱۹۱۳ء، وسیلۃ النجات] (۱۳) میلاد النبی مؤلفہ حافظ عبدالحسن (۱۴) مختصر سیرۃ نبوی مؤلفہ حکیم سید عبدالرؤف داناپوری (۱۵) میلاد النبی مصنفہ حافظ عبدالحق مطبوعہ ۱۹۱۴ء۔

(۱) محشرستان خیال (۲) جوہر مقالات (ناول) ایک جلد (۳) رشحات صفیر (۴) جلوہ خضر ۲ جلد (۵) ضمیمہ محشرستان خیال (۶) خلاصہ فیض صفیر (۷) طبقۂ محبت وثیقہ (۸) ضمیمہ اظہار الاسرار (۹) تاریخ بلگرام (۱۰) انشائے سبدگل (۱۱) تصدیق الایمان (۱۲) مرغوب القلوب (۱۳) پرستان خیال ترجمہ بوستان خیال (۱۴) قطعات ترقی۔

عبدالغفور خاں نساخ[۱] :- نساخ کی نثری تصانیف یہ ہیں۔

سخن شعرا تذکرہ، انتخاب نقص (تنقید) خود نوشتہ سوانح (مخطوط) نصاب زبان اردو۔

علامہ شوق نیموی[۲] : شوق نیموی نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے بلکہ ایک عظیم نثار بھی تھے۔ شوق کی کئی ایسی تصانیف ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہے، ان کی ادبی تصنیف یوں ہے۔

(۱) ازاحت الاغلاط صحت الفاظ کے باب میں (یہ کتاب فارسی میں ہے)

(۲) اصلاح اردو انشاپردازی اور شعر گوئی کے باب میں۔

(۳) ایفائے رسالہ اصلاح کی تائید میں (۴) سرمہ تحقیق سابق الذکر رسالوں کی تائید میں (۵) یادگار وطن اپنے وطن اور اہل وطن کے تذکرے مباحث علمیہ پر مشتمل (۶) سیر بنگال۔

اکبر داناپوری[۳] : اکبر داناپوری مرحوم نے نثر میں کئی کتابیں لکھیں، ان کتابوں کی فہرست ۲۰ ہے۔

(۱) اشرف التواریخ ۳ جلد مکمل (۲) خدا کی قدرت (۳) جبل حدیث (۴) رسالہ الماس (۵) دل (۶) ارادہ (۷) ادراک (۸) مولد غریب (۹) سرمہ بینائی (۱۰) مولد فاطمی (۱۱) چراغ کعبہ۔

صوفی منیری[۴] : حضرت صوفی منیری کی نثری تصانیف یہ ہیں (۱) راحت روح (۲) وسیلہ شرف ذریعہ دولت (۳) خطار است (۴) العروۃ الوثقیٰ

---

[۱] نساخ سے وحشت تک مصنفہ سید انیس الرحمن ص ۳۵ تا ص ۴۲

[۲] مقالہ شوق نیموی مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ اشارہ دسمبر ۱۹۵۹ء

[۳] مسلم شعرائے بہار جلد اول مصنفہ حکیم احمد اللہ ندوی ص ۸۴

[۴] حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے مصنفہ ڈاکٹر طیب ابدالی ص ۶۵ تا ص ۶۷

ڈاکٹر طیب ابدالی نے صوفی منیری کے نثری کارناموں پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ راحت روح موصوف کی ایک تمثیلی داستان ہے جس میں مذہب اور تصوف کے رموز و نکات کے پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت میں حضرت صوفی منیری نے بزرگان دین کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

شاد عظیم آبادی[1] :- شاد عظیم آبادی ایک عظیم شاعر کے علاوہ ایک نثار بھی تھے پھر بھی ایک نثار کی حیثیت سے شاد زیادہ شہرت کے مستحق نہیں۔ انہوں نے نثری صنفوں میں ناول، سوانح، تاریخ، تذکرہ اور لسانیات جیسے موضوع پر تصانیف لکھی ہیں، ان کی نثری تصانیف یہ ہیں :-

(۱) ناول صورۃ الخیال سہ جلد (صورۃ الخیال، ہیئتہ المقال، حلیتہ الکمال) بدھوا، افیونی، صورت حال۔ سوانح اول حیات فریاد اور دوسری کمال عمر یا شاد کی کہانی شاد کی زبانی (یہ سوانح اپنے شاگرد پروفیسر مسلم عظیم آبادی کے نام لکھی ہے) فکر بلیغ حصہ دوم، نوائے وطن، فکر بلیغ (سہ جلد) فارسی تعلیم، اردو تعلیم، مکتوبات شاد مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔

تاریخ :- مراۃ الابصار اور نقش پائیدار (سہ جلد) مختصر یہ کہ شاد عظیم آبادی کثیر التصانیف تھے۔

نواب امداد امام اثر[2] :- جناب امداد امام اثر ایک شاعر کے علاوہ ایک عظیم نثار بھی تھے چنانچہ اثر کی تصنیف کاشف الحقائق اردو تنقید میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے بقول مولوی احمد اللہ مؤلف تذکرہ مسلم شعرائے بہار مراۃ الحکما کی تعریف سر سید نے بھی کی تھی، اثر نے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی کتابیں لکھیں۔ ان کی شعری اور نثری تصانیف کی فہرست یوں ہے :

(۱) فوائد دارین (۲) بہار سخن (۳) مراۃ الحکما (۴) کتاب الاشتہار (۵) کتاب الزراعت (۶) رسالہ طاعون (۷) مصباح الظلم (۸) مناظر المصائب (۹) معیار الحق (۱۰) فسانہ ہمت (۱۱) رسالہ فیل (۱۲) سوانح عمری حضرت مخدوم الملک بہاری بزبان انگریزی (۱۳) سوانح عمر ملکہ معظمہ وکٹوریا بزبان اردو (۱۴) دیوان اثر فارسی (۱۵) ترجمہ انشا رلارڈ بیکن درزبان فارسی (۱۶) دیوان اثر رسالہ جر ثقیل درزبان فارسی

---

[1] شاد کی نثر نگاری مصنفہ ڈاکٹر وہاب اشرفی

[2] تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول مؤلفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی ص ۶۰

(۱۷) رسالہ فوائیات درزبان فارسی (۱۸) رسالہ علم حرکت بزبان فارسی (۱۹) رسالہ علم المرایا و المناظر درزبان فارسی (۲۰) کاشف الحقائق۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کا تعلق جس دور سے ہے اس دور میں بہار میں اُردو نثر ایک نئی روش اختیار کرتی ہے اور اس دور کے نثار نے ادب کی نثری صنف میں چار چاند لگائے، مثال کے طور پر افسانہ نگاری کو لیجئے، اس ضمن میں ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم اور سہیل عظیم آبادی مرحوم جہاں تک کہ ناقدوں کا سوال ہے پروفیسر کلیم الدین احمد کا نام لینا کافی ہے۔ ذیل میں ہم مختصر طور پر ان نثاروں کی نگارشات کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

علامہ سلیمان ندوی: علامہ سلیمان ندوی مرحوم اردو ادب کے مایۂ ناز نثاروں میں تھے، موصوف علامہ شبلی نعمانی کے عزیز ترین تلامذہ میں سے تھے چنانچہ سلیمان ندوی نے اُردو کے نثری ادب میں کئی کارآمد تصنیفیں لکھیں۔ ان کی تصانیف یہ ہیں۔ ارض القرآن دو جلدیں، سیرۃ عائشہ، سیرۃ النبیؐ ۵ ضخیم جلدیں، حیات امام مالک، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہازرانی، خیام اور نقوش سلیمانی وغیرہ قابل ذکر ہیں، سلیمان ندوی ایک عظیم محقق اور ناقد تھے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی:۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ایک عظیم عالم دین تھے۔ مذہب اور تصوف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ موصوف عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں صدر شعبۂ دینیات تھے، موصوف عربی زبان میں کافی مہارت رکھتے تھے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے چند رسالے بھی لکھے، بعض عربی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے مضامین بھی کثرت سے لکھے ہیں چنانچہ بعض اہل علم حضرات نے ان کو یکجا کر کے ان کو کتابی شکل میں شائع کرا دیا ہے، مولانا مناظر احسن کی تصانیف کی فہرست یہ ہے:

(۱) کائنات روحانی (۲) النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم (۳) الدین القیم (۴) الخلفاء (۵) اسلامی معاشیات (۶) امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی (۷) تدوین حدیث (۸) تدوین فقہ۔

مولانا مناظر احسن گیلانی ایک عظیم محقق تھے۔

عزیز الدین بلخی مرحوم:۔ عزیز الدین بلخی مرحوم صوبہ بہار کے مشہور و معروف محقق، تذکرہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موصوف کی تصانیف تاریخ شعرائے بہار کے علاوہ افسانہ کی پرواز قابل ذکر ہے

انسان کی پرواز فن غبارہ بازی اور جہاز رانی کے موضوع پر اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔

حافظ شمس الدین شمس منیری: شمس منیری کا نثری کارنامہ بہت زیادہ وقیع نہیں تاہم موصوف کے مضامین صوبہ بہار کے مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ رسالہ معاصر پٹنہ میں شمس منیری کے مضامین راقم کی نظر سے گذرے ہیں ماسوا اس کے شمس منیری نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے متعلق ایک کتاب لکھی۔

وصی احمد بلگرامی: وصی بلگرامی کی بعض تخلیقات صوبہ بہار کے رسالوں میں شائع ہوئیں۔ وصی بلگرامی انشاپردازی میں کمال رکھتے ہیں اور انہوں نے نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کے گہرے رنگ کو قبول کیا ہے موصوف کا مضمون س ش ص رسالہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا، یہ مضمون آج بھی بہار کی ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ماسوا اس کے وصی صاحب کے چند ادبی مقالات مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

ثاقب عظیم آبادی: ثاقب عظیم آبادی صوبہ بہار کے شاعروں میں ایک غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں، شاعری میں موصوف منشی باقر عظیم آبادی کے شاگرد تھے، ثاقب کا واحد نثری کارنامہ شاہ رکن الدین عشق کی شاعری سے متعلق ان کی کتاب یادگار عشق ہے، یہ تصنیف ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔

انجم مانپوری: انجم صاحب صوبہ بہار کے واحد مزاحیہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی عظمت کا لوہا سارے ہندوستان میں منوایا، موصوف کی نثری تصانیف میں طنزیات مانپوری ۲ جلد خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مولانا تمنا عمادی: مولانا تمنا عمادی کا شمار صوبہ بہار کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے، موصوف عربی فارسی اور اردو ادب پر گہری نظر رکھتے تھے چنانچہ جناب اقبال عظیم نے اپنی کتاب مشرقی بنگال میں اردو میں مولانا تمنا عمادی کی عربی، فارسی اور اردو نثر و نظم کی تصنیفات میں ۲۱ مطبوعہ اور ۲۲ غیر مطبوعہ بتائی ہیں۔ بلاشبہ مولانا تمنا عمادی ایک عظیم عالم دین تھے۔ بحیثیت نثار موصوف نے کوئی وقیع کارنامہ انجام نہیں دیا۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا تمنا عمادی سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) تشریف لے گئے جہاں آپ کا وصال ہوا، مولانا کی نثری کتابیں یہ ہیں۔

(۱) ایفائے سخن یعنی شوق سندیلوی کی مشہور کتاب اصلاح سخن کے ایک حصہ پر تنقید، ادبی دنیا

میں اس کتاب نے تہلکہ مچا دیا (۲) الفرقان (تاریخ جمع القرآن) (۳) اعجاز القرآن ۵ جلدوں میں (۴) شرح دیوان امراء القیس (۵) مجموعہ مکتوبات علمی و ادبی مجموعہ مضامین نثر جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ باقی کتابیں بیشتر صرف و نحو، قرآن و حدیث، تفسیر و تاریخ اور معانی و بیان سے متعلق ہیں۔

سہیل عظیم آبادی :۔ سہیل عظیم آبادی صوبہ بہار کے اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں پریم چند کے گہرے رنگ کو قبول کیا، سہیل صاحب کی تصانیف میں الاؤ، چار چہرے، بے جڑ کے پودے (ناولٹ) خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

رخشاں ابدالی :۔ رخشاں ابدالی بہار کے اردو کے نثری ادب میں ایک اچھا خاصا مقام رکھتے ہیں، موصوف کے مقالے ہندو پاک کے مختلف جرائد میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں، خصوصی طور پر صوبہ بہار کے رسائل رسالہ ندیم، جو مختلف اداروں میں تقریباً ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۹ء تک گیا اور آخر میں پٹنہ سے شائع ہوئے۔ فطرت راجگیر، گنجینہ پٹنہ، معارف اعظم گڑھ، یادگار لاہور، اردو قومی زبان کراچی، مخزن الحمر لاہور جیسے رسائل میں آپ کے مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن موصوف کے دو مقالے اردو نثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء اور غالب کی اصلاحیں مخزن جولائی ۱۹۵۰ء میں شائع ہو کر مقبول و معروف ہوئے، جناب مولوی احمد اللہ ندوی اپنی تصنیف مسلم شعرائے بہار جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ ایک تصنیف صوفی منیری کی شخصیت پر لکھی ہے۔

حمید عظیم آبادی :۔ حمید عظیم آبادی دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں آپ نے شاعری کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ موصوف کے مقالات رسالہ ندیم میں کافی شائع ہو چکے ہیں۔ راسخ عظیم آبادی کی شاعری سے متعلق ایک کتاب لکھی اس کے علاوہ آپ کا ایک کتابچہ رسالہ انشاد شاد مؤلفہ فصیح الدین بلخی کے جواب میں لکھا، اس رسالہ میں طنزیہ جملے مزید استعمال کئے گئے ہیں، بہر حال حمید صاحب بہار کی اردو نثر نگاری میں کوئی خاص مقام حاصل نہ کر سکے، حمید عظیم آبادی اپنے اساتذی محترم جناب شاد عظیم آبادی کا دیوان میخانۂ الہام کے عنوان سے مرتب کیا، میخانۂ الہام کا مقدمہ علامہ سید سلیمان ندوی نے مرتب کیا۔

ولی کاکوی :۔ ولی کاکوی نے نثر میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی بلکہ یوں کہئے کہ ضمناً انہوں نے

نثر نگاری کی طرف توجہ کی ہے۔ موصوف کے مقالات ہند و پاک کے مختلف رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، چنانچہ ورکی صاحب کا ایک مضمون رسالہ نقوش لاہور شخصیات نمبر میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔

قاضی محمد سعید :- قاضی محمد سعید کے چند مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ یہ مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاص تحقیقی ہیں چنانچہ قاضی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں اردو کے مخطوطات کی نمائش کا اہتمام اپنی سرکردگی میں کیا تھا بعدہٗ ان نمائش کی ایک فہرست بھی مرتب کرا کر شائع کی، افسوس ہے کہ قاضی صاحب نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔

مولوی سید عبدالرؤف ندوی :- رؤف صاحب کی چند گرانقدر تحقیقی تاریخی مضامین بہار کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے، ان رسالوں میں معارف اعظم گڑھ اور رسالہ معاصر پٹنہ کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ رؤف صاحب مرحوم ایک محقق تھے افسوس ہے کہ وہ شہرت حاصل نہ کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔

کلیم الدین احمد : کلیم الدین احمد حالی کے بعد اردو کے عظیم ناقد ہیں جنہوں نے اردو تنقید کو واضح شکل دی۔ کلیم صاحب نے تحقیق کی طرف بھی توجہ کی ہے آپ کی کتابیں یہ ہیں (۱) اردو شاعری پر ایک نظر ۲ جلد (۲) عملی تنقید (۳) اردو تنقید پر ایک نظر (۴) سخن ہائے گفتنی - تحقیقی تصانیف میں دو تذکرے (تذکرہ شورش اور تذکرہ عشقی) کو مرتب کیا لیکن اس میں صرف حرف س تک کے شعرا کے حالات ہیں، کلیات شاد ۳ جلد، کلیات جوشش، مقالات قاضی عبدالودود ۱ جلد ان سب تصانیف کو آپ نے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی :- اختر اورینوی ملک کے مشہور و معروف افسانہ نگار و ناقد ہیں، اختر صاحب نے اردو نثر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے بنیادی طور پر اختر صاحب نے بحیثیت افسانہ نگار اور ناقد کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ان کی تصانیف یہ ہیں (۱) حسرت تعمیر (ناول) شہنشاہ حبشہ (ڈراما) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک (تحقیق) سپنوں کے دیش میں، کلیاں اور کانٹے (افسانوں کے مجموعے) سراج و منہاج، تحقیق و تنقید، کسوٹی اور قدر و نظر (تنقیدی مضامین کے مجموعے)

قاضی عبدالودود : قاضی عبدالودود ملک کے مشہور و معروف محقق ہیں۔ قاضی صاحب کے لگ بھگ ڈھائی سو مضامین ہند و پاک کے مختلف جرائد میں شائع ہوئے، قاضی صاحب نے باضابطہ

کوئی کتاب نہیں لکھی۔ قاضی صاحب کی تصانیف یہ ہیں: تذکرہ ابن طوفان مرتبہ دیوان جوشش، اشتر و سوزن اور عیارستان، اس کے علاوہ قاضی صاحب غالب بحیثیت محقق، آزاد بحیثیت محقق اور عبدالحق بحیثیت محقق مستقل ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، قاضی صاحب کے مقالوں کو جناب کلیم الدین احمد نے کتابی شکل میں مرتب کر کے مقالات قاضی عبدالودود بہار اُردو اکادمی کی سعی سے شائع کیا ہے۔

مسلم عظیم آبادی: جناب مولوی احمد اللہ ندوی نے اپنے تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد چہارم میں جناب مسلم عظیم آبادی کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ یہ تفصیلی حالات ان کی خود نوشتہ تحریر سے ماخوذ ہے۔ بہر حال مسلم عظیم آبادی نے شاعری سے زیادہ ادبیات نثر کی طرف بھی توجہ کی ہے، موصوف نے اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی کتابیں لکھی ہیں ان کی تصانیف کی فہرست یہ ہے۔

(۱) مشیر النحو عربی نحو سہل اُردو میں مع مترادف اصطلاحات انگریزی گرامر (۲) سلیقہ تحریر مبتدیوں کے لئے (۳) مبادیات لسانیات فارسی انگریزی میں (۴) فارسی علوم اور اسلام پارسی قوم اور علوم کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک، (۵) ذکر حبیب سیرۃ النبوی بالتزام روایات صحیحہ مع مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد مجالس سیرت کے (۶) دعوتِ فکر مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ (۷) شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی ترتیب و تکمیل (۸) معتقدات عجم یہ کتاب اسلام پر عجمی عقائد کے اثرات کی تاریخ ہے، برسوں کی کاوش کے بعد یہ کتاب مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں طبع ہو کر تیار ہوئی تو مؤلف کے دل میں کچھ خیال پیدا ہوا کیونکہ اس کتاب کے سارے مواد اہل سنت مورخین سے ماخوذ تھے یا مغربی متاخرین کی تحقیقات سے بعدہٗ مؤلف نے اسماعیل فاضل ڈاکٹر زاہد علی ڈی فل کسن پروفیسر عربی پرنسپل نظام کالج حیدرآباد دکن کی دو ضخیم تالیف تاریخ فاطمی عصر سے استفادہ کر کے اپنی کتاب مکمل کی لیکن حکومت پاکستان نے اس کتاب کے شائع ہونے پر پابندی عائد کردی، مسلم عظیم آبادی نے ڈاکٹر قیام الدین کی کتاب Wahabi movement in India کا اردو میں بھی ترجمہ کیا اور یہ کتاب پاکستان میں شائع ہو گئی ہے۔

پروفیسر سید حسن عسکری: حسن عسکری صاحب ملک کے مشہور و معروف مورخ ہیں، موصوف کے تاریخی و تحقیقی مقالات اکثر رسالوں میں شائع ہوتے رہے، حضرت آیت اللہ جوہری کی مثنوی مثنوی گوہر جوہری آپ ہی کی بدولت منظر عام پر آئی، عسکری صاحب کے مضامین کو مرتب کر کے جناب ڈاکٹر سید محمد حسنین صدر

شعبۂ اُردو مگدھ یونیورسٹی بہار اُردو اکادمی کی سعی سے شایع کر رہے ہیں۔

عطا کاکوی : عطا کاکوی کا شمار صوبہ بہار کے ایک مشہور و معروف محقق اور ناقد میں ہوتا ہے۔ شاعری کے علاوہ آپ نے نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ تنقیدی مضامین کے دو مجموعے تنقیدی مطالعہ اور تقابلی مطالعہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ بیدل عظیم آبادی پر ایک کتاب "حیرت زار" چھپ چکی ہے، دو مشہور تذکرے "سفینۂ ہندی" اور "سفینۂ خوشگو" کو آپ نے ایڈٹ کیا ہے۔

مولوی احمد اللہ ندوی : احمد اللہ ندوی کی حیثیت صوبہ بہار کے تذکرہ نگار اور محقق کی ہے۔ چنانچہ موصوف کا ایک اہم اور وقیع تذکرہ "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" ۶ جلد کراچی پاکستان سے شائع ہو چکا ہے، بلاشبہ مولوی احمد اللہ ندوی نے یہ تذکرہ کافی محنت کے بعد لکھا ہے۔

معین الدین دردائی : معین الدین دردائی صوبہ بہار کے ایک مایۂ ناز محقق تھے۔ ان کی کتابوں میں بہار اور اردو شاعری، سلسلہ فردوسیہ قابل ذکر ہے، ماسوا اس کے دردائی صاحب کے کافی تعداد میں تحقیقی مقالات صوبہ بہار کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔

مذکورہ بالا سطور میں فصیح الدین بلخی مرحوم کے عہد سے تعلق رکھنے والے بہاری نثار کی نگارشات کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اس سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ بہار میں اُردو نثر اپنی ہر ایک صنف میں ایک واضح شکل اختیار کر لیتی ہے۔

باب پنجم

فصیح الدین بلخی بہ حیثیت مورّخ

فصیح الدین بلخی مرحوم کی تاریخی کتابیں دو ہیں، ایک تاریخ مگدھ اور دوسری Wahabi movement in Bihar تحریک وہابیہ اور بہار، ذیل میں ہم دونوں تصنیفات کا جائزہ لے رہے ہیں جس کے سبب فصیح الدین بلخی مرحوم ادبی دنیا میں ایک مورّخ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

تاریخ مگدھ یعنی صوبہ بہار کی مکمل تاریخ سنہ ۶۴۲ ق م سے ۱۹۴۳ء (۱۳۶۲ھ) تک کے تمام تاریخی واقعات درج ہیں، یہ کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

باب اوّل ابتدائی حالات اور سنہ ۶۴۲ ق م سے نند خاندان کی حکومت سنہ ۳۱۹ ق م تک۔

باب دوم موریہ خاندان کی حکومت سنہ ۳۲۴ ق م سے ۱۸۶ ق م تک۔

باب سوم سونگا خاندان کے زمانہ سے اندھرا کی حکومت کے بعد سنہ ۳۰۰ تک۔

باب چہارم گپتا خاندان کی حکومت سنہ ۲۷۱ء تا سنہ ۳۱۹ء

باب پنجم بت شکن برہمن ساسانیکا کے حملے کے بعد سے سنہ ۷۳۰ء تک کے مختلف واقعات۔

باب ششم پال خاندان کی حکومت سنہ ۷۳۰ء تا ۱۱۹۷ء۔

باب ہفتم افتتاح بہار میں اسلامی حکومت کا آغاز۔

باب ہشتم بہار و بنگال میں خاندان خلجی کی حکومت۔

باب نہم افتتاح بہار و بنگال میں طوائف الملوکی اور آزاد حکومت کا آغاز۔

باب دہم صوبہ بہار میں سلاطین شرقیہ کی حکومت

"تاریخ مگدھ" فصیح الدین بلخی مرحوم کا اپنے ملک و قوم اور خصوصی طور پر اپنے وطن والوں کو دیا ہوا ایک بیش بہا سرمایہ ہے اس کتاب میں صوبہ بہار کے مکمل تاریخی واقعات و حالات مستند تاریخی کتابوں سے اخذ کر کے مسلسل اور مکمل طور پر ماخذوں اور حوالوں کے ساتھ تفصیل وار درج ہیں یعنی ۲۷ انگریزی تاریخوں اور ۲۶ اردو فارسی تاریخوں کے ماخذ اور حوالات مستند طور پر درج کئے گئے ہیں ۔ یہ کتاب سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی ء ۲۰۸ سے تعلق رکھتی ہے، انجمن مذکور نے ۱۹۴۲ء میں دہلی سے شائع کرایا اور اس کی اشاعت کا سہرا خصوصی طور پر آنجہانی سر تیج بہادر سپرو کو ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے بلخی صاحب مرحوم سے گہرے تعلقات تھے جس کی نشاندہی سہیل عظیم آبادی کے مضمون "بلخی صاحب" سے ہوتی ہے۔ سہیل عظیم آبادی یوں رقمطراز ہیں:

"شاید ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو دہلی نے ان کی کتاب تاریخ مگدھ شائع کی۔[۱]

---

[۱] ملاحظہ ہو سہیل عظیم آبادی کا مضمون "بلخی صاحب" مخطوطہ۔

بابائے اردو مرحوم کی خدمت میں اکثر باریابی کا موقع ملتا ہے، بابائے اردو نے بار بار اس کتاب کی تعریف کی۔ یہ کتاب "۱۰ × ۵ " کی تقطیع ہے، پوری کتاب میں مقدمہ سے لے کر اختتام تک چار سو انہتر (۴۶۹) صفحات ہیں، ۵ اصفحات پر فہرست مضامین ہے چار صفحات پر ان کتابوں کے حوالے درج ہیں جن سے یہ تاریخ مرتب کی گئی ہے۔"

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ پوری کتاب ۲۰ ابواب پر مشتمل ہے، ان ۲۰ ابواب کے علاوہ سات صفحات پر کتاب کا مقدمہ ہے جو بلخی صاحب مرحوم ہی کا سپرد قلم کیا ہوا ہے، یہ مقدمہ اس اعتبار سے بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں صاحب کتاب نے صرف کتاب ہی سے متعلق مواد کی نشاندہی کی ہے۔ بلکہ صوبہ بہار کی تاریخی اہمیت پر بھی دلیلوں اور حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، مقدمہ کا حرف آغاز بھی اس جملے سے شروع ہوتا ہے:

> لہ "کسی مقام کی عظمت اس کی تاریخی قدامت یا اس کی مذہبی یا سیاسی اہمیت کے سبب ہوتی ہے اور اس اعتبار سے مگدھ صوبہ بہار کی سرزمین جس پر گیر برج (قلعہ راجگیر) پاٹلی پتر، پٹنہ وعظیم آباد کی بنیاد قائم ہوئی، ہندوستان کی تاریخ میں نہایت ہی عظیم الشان مقام ہے۔"

اس کے بعد عہد قدیم سے دور حاضر تک ہندوستان گیر اہمیت رکھنے والے مذہبی اسماجی اور سیاسی واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے مرحوم نے اس صوبہ کی تاریخی اہمیتوں کو ثابت کیا ہے کہ

> لکہ "مذہبی حیثیت سے دنیا کے مشہور مذاہب (بودھ دھرم اور جین دھرم) کا آغاز اور ان کی نشو و نما اس سرزمین بہار میں ہوئی اس لئے کروڑوں نفوس اس کو مقدس و متبرک مانتے ہیں۔"

تاریخی اور سیاسی طور پر ہندوستان میں منظم حکومت ۳۲۰ قبل مسیح کے قریب راجہ چندر گپت موریہ

لہ، لکہ مقدمہ تاریخ مگدھ مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم

نے قائم کی۔

اس طرح بلخی صاحب مرحوم نے یہ ثابت کیا ہے کہ صوبہ بہار کو نہ صرف تاریخی اعتبار سے ہندوستان گیر بلکہ عالمگیر اہمیت بھی حاصل ہے، اس صوبہ کی تاریخی حیثیت کو منوانے کے لئے مقدمہ میں یہ بھی ثابت کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

لہ "مردم خیزی میں اس سرزمین کو ایک امتیازی رتبہ حاصل ہے جس طرح ۳۲۰ قدم کے قریب چندر گپت موریہ نے ایک معمولی شخص کی حیثیت سے ترقی کرکے مگدھ سے سرحد ایران تک اپنی سلطنت قائم کی اسی طرح سولھویں صدی کے وسط میں یہاں کا ایک باشندہ فرید خاں ملقب بہ شیر شاہ معمولی جاگیردار کی حیثیت سے ترقی کرکے سارے ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔"

مختصر یہ کہ اس کتاب کا یہ مقدمہ بذات خود صوبہ بہار کی مختصر ترین مگر جامع تاریخ ہے، مقدمہ کے آخری حصے میں مرحوم نے اپنے ان ذخیروں کا ذکر کیا ہے جن میں صوبہ بہار کے جغرافیائی حالات و آثار قدیمہ اور عمارات کی تصنیف اور سیکڑوں کتبے انہوں نے بڑی محنت اور جستجو سے حاصل کئے ہیں ان کو وہ کتابی شکل دینا چاہتے تھے۔ جو ان کی غیر مطبوعہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، تاریخ مگدھ بارہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔

لہ "الحمد للہ اس کتاب میں ۶۴۲ ق۔م سے ۱۹۴۳ء مطابق ۱۳۶۲ھ تک مگدھ، پاٹلی پتر، بہار و عظیم آباد، پٹنہ کے سلسلے وار تاریخی حالات اختتام کو پہنچے اور راقم کی بارہ برس کی محنت ٹھکانے لگی۔"

مقدمہ کا اختتام اور کتاب کا اختتام بھی حافظ شیرازی کے مشہور شعر پر ہوتا ہے ؎

احوال ما ز حوصلہ نامہ بیش بود
لختے ز حال خویش بہ سیما نوشتہ ام

لہ، لہ مقدمہ تاریخ مگدھ مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم

اور کتاب کا اختتام بھی اس شعر پر ہوتا ہے ؎

شیریں تر از حکایت ما نیست قصہ
تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم

ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبۂ اردو ٹی۔ این بی کالج بھاگلپور اپنے گرانقدر مقالہ بعنوان فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات میں تاریخ مگدھ سے متعلق اپنی یوں رائے پیش کرتے ہیں۔

لہ "تاریخ مگدھ صوبہ بہار کی پہلی مستند تاریخ ہے جس میں دلائل سے انگریز مورخوں کی بے شمار غلطیوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی بہت سے اپنے اہم واقعات پیش کئے گئے ہیں جو اب تک مورخین کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے"۔

نیز یہ لکھتے ہیں:

لہ اس کتاب کے معیار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صوبہ بہار کے سابق گورنر آر۔ آر۔ دیاکر کی تالیف Bihar through the ages کا ایک اہم ماخذ یہ کتاب بھی ہے۔

سید عبدالرؤف ندوی مرحوم اپنے گرانقدر تحقیقی مقالہ "فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت" میں یوں رقمطراز ہیں۔

لہ "بلاشبہ بہار کی تاریخ اور بزرگوں نے بھی لکھنے کی کوشش کی ہے اور لکھی بھی ہے مگر جس طرف نگاہ تحقیق و تعدیل سے انہوں نے لکھا ہے مورخین داد دیتے ہیں اور فن کے صحیح معیار پر بھی اترتی ہے، جس دور اور عہد کے واقعات درج کتاب ہیں مستند ہیں، حوالات درج ہیں۔ مبالغہ سے پرہیز اور اعتدال سے کام لیا گیا ہے"۔

فصیح الدین بلخی مرحوم سے قبل خصوصی طور پر خان بہادر سید علی محمد شاد نے بھی تاریخ نویسی کی طرف توجہ کی تھی لیکن موصوف تاریخ نویسی کے فن سے ناآشنا تھے۔ ان کی تاریخی کتابیں تاریخ صوبہ بہار اور نقش پائیدار (سہ جلد) خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

لہ، لہ مقالہ فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی اپنے گراں قدر تحقیقی مقالہ "شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری" میں شاد کی تاریخ نویسی کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"شاد کی تاریخ بحیثیت زیادہ اہم نہیں اس لئے کہ تاریخ نویسی جو جوہر چاہتی ہے وہ ان کی ذات میں نہ تھا۔"

خود شاد عظیم آبادی تاریخ صوبہ بہار کے دیباچہ میں اپنی تاریخ نویسی پر فخر نہیں کرتے بلکہ اس کو ایک مشکل فن سمجھتے ہیں۔

تاریخ مگدھ شاد کی تاریخ "صوبہ بہار" کی تمام غلطیوں کا پردہ فاش کرتی ہے جہاں شاد نے سنی سنائی باتیں اپنی تاریخ میں درج کی ہیں۔ دیباچہ صوبہ بہار میں شاد عظیم آبادی نے تاریخ کے مواد سے متعلق اپنی واقفیت پیش کی ہے، نیز شاد نے حیات فریاد کے دیباچہ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

[1] "راقم نے ۱۸۷۶ء میں جو تاریخ بہار لکھی وہ حضرت فریاد کے زبانی لکچروں پر مبنی ہے، شاد نے بہار کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے:

یوں تو حالیہ بہار مگدھ دیش کے نام سے موسوم تھا لیکن اس سرزمین میں جہاں اس وقت قصبہ بہار ہے برہمنوں نے ایک دارالعلوم قائم کیا تھا چونکہ سنسکرت میں دارالعلوم کو وہار کہتے ہیں اسی سبب اس کا نام بہار مشہور ہو گیا۔"

فصیح الدین بلخی تاریخ مگدھ میں بہار کی وجہ تسمیہ یوں لکھتے ہیں۔

"سنہ [illegible]ء کے قریب راجہ گوپال نے وہار بنوایا اور راجاؤں نے (جس جگہ موجودہ قصبہ بہار ہے) وہارے کی تعمیر میں اضافہ کیا انہی وہاروں کے سبب قصبے کا نام بہارہ (بہار) ہو گیا اور دارالحکومت ہونے کے سبب تمام مگدھ پر اس نام کا اطلاق ہو گیا۔ (تاریخ مگدھ ص ۹۷)

آر۔ آر۔ دیواکر کی کتاب بہار تھرو دی ایجز Bihar through the ages ص ۵۱ پر ہے

---

[1] حیات فریاد بحوالہ شاد کی نثر نگاری ص ۳۲۶

"The territory of Bihar covered State of Bihar today did not bear its present name. In the ancient period the name of Bihar was give by the Muslim invaders.

اودنت پوری کے نواح میں جہاں حالیہ بہار شریف ہے وہاں وہاروں کی کثرت دیکھ کر
مسلمان آوروں نے اس کا نام بہار رکھ دیا۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے بہار کی جو وجہ تسمیہ بتائی ہے اس کے ماخذ میں دی ارلی ہسٹری ص۳۱۳
تا ص۳۲۶ کا حوالہ دیا ہے۔

مختصر یہ کہ فصیح الدین بلخی مرحوم نے جتنے تاریخی واقعات اپنی تصنیف میں لکھے ہیں ان کے
ماخذ اور حوالات اول تا آخر درج کئے ہیں، ایسی مثالیں ہم پوری کتاب میں پاتے ہیں، اس کے برعکس
شاد عظیم آبادی نے اپنی تاریخ میں صرف سنی سنائی باتوں پر عمل کیا ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنے تحقیقی مقالے میں جہاں شاد کی تاریخ نویسی کا جائزہ لیا ہے
وہاں تاریخ مگدھ کے حوالے سے شاد کی تمام غلطیوں کا کچا چٹھا پیش کیا ہے، نیز تاریخ بہار اور تاریخ مگدھ
کا موازنہ بھی کیا ہے چنانچہ کتاب کے خاتمہ میں مورخ نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ تاریخ مگدھ سے
قبل ہمارے صوبہ کی کوئی مکمل تاریخ نہیں تھی۔ بلخی صاحب لکھتے ہیں:

"لیکن گذشتہ واقعات کے متعلق ایسی کوئی تاریخی کتاب موجود نہ تھی جس میں ہمارے
صوبہ کی مکمل تاریخی حالات مستند تاریخوں کے حوالے سے مرتب کئے گئے ہوں ایک
مورخ کو خصوصی طور پر اعتدال پسند اور مبالغہ سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ
ایک مورخ کو تاریخ نویسی کے ضمن میں غیر جانبدار رہنا چاہئے یعنی حقائق کو منظر عام
پر لانا مورخ کا مقصود ہوتا ہے، واقعات میں تضاد کی کیفیت نہیں آنی چاہئے نیز یہ
کہ کسی تاریخی حالات کو قلمبند کرتے وقت کسی کا طرفدار نہیں ہونا چاہئے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کی تاریخ نویسی کا جہاں تک تعلق ہے ایسی تمام خوبیاں ہم پاتے ہیں، تاریخ مگدھ ہو یا وہابی مومنٹ (Wahabi movement) موصوف کی دونوں تاریخوں ایسی خصوصیتیں پاتے ہیں، فی الحال تاریخ مگدھ سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

بت شکن راجہ ساسانیکا جس نے بودھ مذہب کے ماننے والوں پر ایسے ظلم ڈھائے جو فعل دراصل انسانیت کے منافی ہے ساتھ ہی ساتھ ان کی مقدس عبادت گاہوں کو بھی نیست و نابود کر دیا بلخی صاحب مرحوم ان واقعات کے سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں:

[1] "ساسانیکا بودھ دھرم کا سخت مخالف تھا، اس نے اس مذہب کے ماننے والوں کو سخت ایذائیں پہنچائیں، مگدھ بودھ دھرم والوں کی مقدس جگہ تھی یہاں حملہ کر کے اس نے تمام بودھسٹ مورتیوں اور عمارتوں کو توڑ کر خاک میں ملا دیا اور اس مذہب کی ایسی بیخ کنی کی کہ بودھ گیا کے مقدس درخت کو جس کے سایہ میں گوتم کو حقانیت اور روشن ضمیری حاصل ہوئی تھی جڑ سے کٹوا کر جلا دیا۔"

اس مختصر سی عبارت میں بلخی صاحب مرحوم نے خصوصی طور پر راجہ ساسانیکا کے اس سیاہ کارنامہ پر اپنے سخت ردعمل کا اظہار کیا ہے اور یہ جملہ "اس مذہب کی ایسی بیخ کنی کی" پر معنی اہمیت کا حامل ہے حالانکہ راجہ ساسانیکا ایک برہمن تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بودھ دھرم سے ذاتی طور پر بغض رکھتا تھا۔

بلخی صاحب مرحوم دنیا کے ہر مذہب کا تہہ دل سے احترام کرتے تھے۔ خصوصی طور پر اس کی واضح مثال ہندو دھرم کی مقدس دیوی سیتا جی کے ضمن میں جو ان کے خیالات ہیں کیونکہ انہوں نے بودھ دھرم پر ہونے والے مظالم کی سخت مخالفت کی ہے اور بودھ دھرم کا احترام کیا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لفظ بیخ کنی کو استعمال کیا ہے، اکثر انگریز مورخوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جہاں کسی مذہب کا ذکر آیا وہاں انہوں نے تعصب کا سہارا لیا، اس ضمن میں مذہب اسلام کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، اکثر متعصب انگریز مورخوں نے مذہب اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] تاریخ مگدھ ص ۶۷

تاریخ علیگڑھ ۱۹۴۷ء میں لکھی گئی، ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، میں سوانح حیات کے سلسلہ میں عرض کر چکا ہوں کہ بلخی صاحب مرحوم کے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین بلخی عمر بھر نیشلسٹ (Nationalist) رہے اور بلخی صاحب بھی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے گاندھی جی کے عدم تعاون تحریک (Non co-opration movement) کے سلسلہ میں جونپور کی مجسٹریٹی سے استعفاد دے دیا اور کھادی کے لباس میں ملبوس ہوئے لیکن بلخی صاحب مرحوم کی دوربیں نگاہ بھی، انہوں نے ۱۹۴۲ء میں ہونے والے تشدد آمیز فسادات کے سلسلے میں کانگریسیوں کی تعریف نہیں کی کیونکہ کانگریسیوں نے وحشیانہ حرکتیں کیں، بلخی صاحب مرحوم ۱۹۴۲ء کی تحریک میں لکھتے ہیں:

لہ "بعض مقام پر ان ظالم باغیوں نے ایسی وحشیانہ حرکتیں کیں جن سے ہر ایک نیک نفس انسان کا دل دہل جاتا ہے، انہوں نے سیتامڑھی (ضلع مظفرپور) کے سب ڈویژنل افیسر اور پولس انسپکٹر کو مع دو چپراسیوں کو سرِ راہ گھیر کر محض اس جرم پر مار ڈالا کہ انہوں نے کانگریسی بننے سے انکار کیا، پٹنہ کے قریب ہی ریل کے مسافروں میں ہوائی جہاز کے دو افسروں کو جو ملک کینڈا (امریکہ) کے رہنے والے تھے وحشیانہ طور پر مار ڈالا۔"

اس مختصر سی عبارت کو پڑھنے کے بعد اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کانگریسیوں کے اس فعل سے سخت نالاں نظر آتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلخی صاحب مرحوم انگریزوں کی مداحی کر رہے ہیں بلکہ انہوں نے اپنا غیر جانبدارانہ رویّہ اختیار کیا کیونکہ ایک مورخ کی طرز تحریر سے جانبداری ظاہر نہیں ہونی چاہئے۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کو ہم تاریخ نویسی کے معاملہ میں غیر جانبدار پاتے ہیں اس کی ایک اور مثال کو دیکھئے، بلخی صاحب مرحوم نیتاجی سبھاش چندر بوس کی اس پالیسی سے سخت برہم نظر آتے ہیں جو انہوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے خفیہ طور پر نازی جرمنوں اور جاپانیوں سے ساز باز کیا تھا، بلخی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

لہ تاریخ علیگڑھ صفحہ ۱۵۴ تا ۱۵۵

؎ "غیر مسلم فرقوں میں کچھ اشخاص ایسے بھی ہیں جو جاپان کی حکومت کو مددگار بنا کر انگریزی حکومت کا استحصال کرنا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ناخدا شناس اور ناخدا ترس جاپانیوں سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی اور اہل چین چھ برس سے ان کی شرارتوں کا تلخ تجربہ اٹھا رہے ہیں۔ عوام الناس کو اس کا بھی یقین ہے کہ بابو سبھاش چندر بوس کلکتہ سے خفیہ فرار ہو کر جرمنوں اور جاپانیوں کی پناہ میں ہیں۔"

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نیتاجی سبھاش چندر بوس کی اس سیاسی غلطی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور اس جملہ پر ان کا مزید زور ہے "ناخدا شناس اور ناخدا ترس جاپانیوں سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔"

تاریخ صرف کسی صوبہ یا ملک یا کسی مخصوص قوم کی تاریخ نہیں ہو سکتی، تاریخ بدلتے ہوئے حالات کی ہوتی ہے لہٰذا بلخی صاحب مرحوم انصاف پسند مورخ نے سبھاش چندر بوس کے اس کارنامہ کو نہیں سراہا کیونکہ جاپانیوں اور جرمنوں سے بھلائی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی کیونکہ اہل چین جاپانیوں کے ظلم کا مزہ چکھ چکے ہیں اور یہ بلخی صاحب مرحوم کو عظیم مورخ ہونے کی ایک عظیم دلیل ہے۔

تاریخ مگدھ اپنے موضوع کے اعتبار سے خالص مگدھ کی تاریخ ہے، عام طور پر مورخ اپنے بیان کو تقویت پہنچانے کے لئے دوسرے مورخوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ فصیح الدین بلخی مرحوم نے تاریخ مگدھ میں دوسرے تاریخ دانوں کے علاوہ فارسی کی منظوم تاریخوں کا بھی حوالہ دیا ہے، تاریخ میں ادبیت، شعریت پیدا کر کے اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے' منیر کب فتح ہوا اور یہاں سب سے پہلے مسلمان کے قدم کب آئے' انہوں نے مختلف تاریخی حوالوں کے علاوہ اس کے ثبوت میں فارسی کے دو اشعار بھی پیش کئے ہیں' بلخی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

؎ "منیر کے مخدوم زادوں کے سفینوں سے پایا جاتا ہے کہ ۵۷۶ھ ۱۱۸۰ء میں

؎ تاریخ مگدھ ص۵۷۴

؎ " " ص۹۶ تا ۹۷

حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار نے راجہ منیر کو شکست دے کر منیر پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے ان میں پچیس ۲۵ آدمیوں کے نام سفینوں میں مذکور ہیں اور فتح کی تاریخ حسب ذیل ہے:

یافت چوں بر راجہ منیر ظفر — داد امام از دیں جہانے را نوی
ہست منقول از بزرگان سلف — سال آں دین محمد شد قوی

۵۷۶ھ

تاریخ مگدھ میں ایک سُرخی سلطان غیاث الدین حاکم بنگالہ اور حافظ شیرازی کی ملتی ہے اور ریاض السلاطین صفحہ ۱۰۵ کے حوالہ سے نیز تاریخ فرشتہ باب دوم صفحہ ۲۲۲ کے حوالہ سے حضرت حافظ شیرازی سے متعلق باتیں کہی گئی ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

"ایک بار غیاث الدین اعظم شاہ مشرقی بنگالہ کی طرف گیا ہوا تھا۔ اتفاقاً اس سفر میں کوئی مرض ایسا لاحق ہوا کہ اس کو زیست سے یاس ہو گئی۔ اس وقت اس کی تین بیویاں ساتھ تھیں جن کے لقب سرو محل، گل محل اور لالہ محل تھے۔ اس نے ان کو وصیت کی کہ میرے مرنے پر تم نعش کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینا لیکن غیاث الدین اعظم شاہ نے مرض سے شفا پائی تو اس کی اور بیویوں نے ازراہ طعن ان کو غسالہ کہنا شروع کیا، انہوں نے موقع پا کر اعظم شاہ سے شکایت کی، اس وقت عالم انبساط میں اعظم شاہ کی زبان پر برجستہ یہ مصرعہ آیا "ساقی حدیث سرو گل و لالہ می رود" لیکن اس کے برابر کا دوسرا مصرعہ ذہن میں نہ آیا اور دربار کے شعرا بھی حسب دل خواہ مصرعہ نہ لگا سکے، اعظم شاہ نے یہ مصرعہ طرح ایک قاصد کی معرفت کچھ تحائف کے ساتھ حضرت شمس الدین حافظ شیرازی کے پاس روانہ کیا اور حضرت حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی۔ حضرت حافظ بھی بنگال آنے کے شائق تھے، کبر سنی اور صعوبت سفر کا اندیشہ مانع ہوا، تاہم ایک غزل روانہ کی جس کے تین اشعار بیان سے خاص تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔ پوری غزل دیوان میں موجود ہے۔

ساقی حدیث سرو گل و لالہ می رود — ایں بحث از ثلاثۂ غسالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ از شوق مجلس سلطاں غیاث الدین   خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

تاریخ اگرچہ اپنے موضوع کے اعتبار سے خالص خشک ہوتی ہے لیکن فصیح الدین بلخی مرحوم کی تاریخ نویسی میں ادبی چاشنیاں بھی موجود ہیں جو فاضل مورخ کے گہرے ادبی ذوق کی نشاندہی کرتی ہیں، اس ضمن میں کتاب کی ابتدا میں مقدمہ کا اختتام اور کتاب کے آخر میں بھی اشعار موجود ہیں۔ ڈاکٹر شعیب راہی اپنے مقالہ "فصیح الدین بلخی اور ان کا اسلوب" میں فصیح الدین بلخی مرحوم کی تاریخ نویسی کے ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

[1] "وہ تاریخ نویسی کو ادب و شاعری کی بلند منزلوں تک لے جانے کے قائل تھے، فصیح الدین بلخی مرحوم نے تاریخ مگدھ لکھتے وقت ادبی واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ مثال کے لئے غیاث الدین تغلق اور حضرت نظام الدین اولیا کے متعلق "ہنوز دہلی دور است" کے واقعہ کو بھی طبقات اکبری جلد اول کے حوالہ سے درج کیا ہے۔"

بلخی صاحب یوں رقمطراز ہیں:

[2] طبقات اکبری میں مذکور ہے کہ تغلق شاہ جب ترہت آیا تو بعض وجوہ سے ناخوش ہو کر اس نے حضرت نظام الدین اولیاء کو کہلا بھیجا کہ میرے آنے سے پہلے دہلی سے نکل جائیں، شیخ نے اس کا اندیشہ کچھ نہ کیا یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ تغلق شاہ روانہ ہو کر دہلی کے قریب پہنچا چاہتا ہے، شیخ نے کہا "ہنوز دہلی دور است" اس کے بعد ہی تغلق شاہ دہلی سے ایک منزل پر اچانک ایک چھت کے گرنے سے ہلاک ہوا۔ بالآخر "ہنوز دہلی دور است" فارسی، اردو میں محاورہ ہو گیا، چنانچہ میر تقی میر کا شعر ہے

شکوہ آبلہ ابھی سے میر   ہے پیارے ہنوز دلی دور

---

[1] فصیح الدین بلخی کا اسلوب مقالہ ڈاکٹر شعیب راہی، شائع شدہ رسالہ زبان و ادب پٹنہ اکتوبر ۱۹۷۷ء

[2] تاریخ مگدھ۔

تاریخ اودھ موٗلفہ نجم الغنی بلاشبہ اودھ کی ایک مستند تاریخ ہے لیکن جس پیرائے اور جس انداز سے تاریخ مگدھ لکھی گئی ہے وہ بات نجم الغنی کی تاریخ میں نہیں پاتے، بلاشبہ اس کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان اور انداز بیان پر آپ غور فرمائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک طرف صوبہ کی اہم تاریخ ہے تو دوسری طرف اس تاریخ کا لکھنے والا صرف ایک باشعور اور ذی علم مورخ ہی نہیں بلکہ ایک صاحب ذوق ادیب بھی ہے۔ جس کی انشا پردازی نے تاریخ نگاری کے بھاری بھرکم پن کو ادبی لب و لہجہ میں تبدیل کر دیا ہے۔

ڈاکٹر مظفر اقبال اپنے مقالے فصیح الدین بلخی مرحوم کی "چار تصنیفات" میں یوں لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی زبان بہت ہی صاف و سادہ اور سلیس ہے، انداز بیان مورخانہ اور ناقدانہ ہے۔"

قلعہ پٹنہ کے متعلق بلخی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:

"[1] تاریخ داؤدی میں مذکور ہے کہ شیر شاہ نے بنگالہ سے واپس آکر پٹنہ میں گنگا کے کنارے قلعہ تعمیر کرانے کا ارادہ کیا، معماروں اور خشت کاروں نے پانچ لاکھ روپے اس کے خرچ کا تخمینہ کیا، شیر شاہ نے بعض معتمدوں کی نگرانی میں کام شروع کرایا اور کچھ عرصہ میں مستحکم قلعہ تیار ہو گیا۔"

کرنل ایڈل نے لکھا ہے کہ غالباً یہ قلعہ پاٹلی پترا کی اینٹوں سے تیار ہوا ہے اور اس کا یہ سبب بتایا ہے کہ تاریخ شیر شاہی کے مطابق یہ قلعہ دو میل لمبا تھا اور اتنے بڑے قلعہ کے لئے پانچ لاکھ روپے صرف مزدوری کے کام میں ہو سکتے ہیں (بحوالہ ڈسکوری آف دی اکزیکٹ سائٹ آف پاٹلی پترا)

راقم کے خیال میں یہ قیاس نہیں اس لئے کہ پاٹلی پترا کے کھنڈروں میں جو اینٹیں پائی جاتی ہیں وہ اس قلعہ کی اینٹوں سے بالکل مختلف ہیں اور پاٹلی پترا کے خوشنما تراشے ہوئے پتھروں کا بھی کوئی وجود اس قلعہ کے کسی حصہ میں نہیں پایا گیا، برخلاف اس قلعہ کا وہ پشتہ جو گنگا کے دھارے سے ٹکراتا ہے

---

[1] تاریخ مگدھ

جس کو بشپ ہیبر نے غلطی سے پہاڑی ٹیلہ سمجھا تھا اس کی تعمیر ہو بہو اسی طور کی ہے جس طرح راجگیر میں گنگا نامی نالے کے قریب یا ترین فصیل ہے غالباً یہ حصہ راجہ اجات شترو کے بنائے ہوئے قلعہ کی یادگار رہ گیا ہے جس کی کیفیت اس راجہ کے حالات میں بھی مذکور ہو چکی ہے، چینی جاتری یوانگ چوانگ کی تحریر سے بھی پایا جاتا ہے کہ ۶۳۸ء کے قریب گنگا کے کنارے جو شہر آباد تھا وہ فصیلوں سے محیط تھا۔ اس سے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ شیر شاہ نے کوئی نیا قلعہ نہیں بنوایا بلکہ پرانے قلعہ کو درست کرایا اور اس کے لئے اس زمانہ میں پانچ لاکھ کی رقم کافی ہوگی۔

مختصر یہ کہ تاریخ مگدھ ایک مستند تاریخ ہے یہی وجہ ہے کہ جب انجمن ترقی اردو کے سامنے یہ کتاب پیش کی گئی تو بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کی اشاعت کا ذمہ لے لیا۔ سید عبدالرؤف ندوی اپنے مقالہ فصیح الدین کی عظیم شخصیت میں یوں رقمطراز ہیں:

لہ "انجمن ترقی اردو کے سامنے جب یہ کتاب پیش کی گئی تو مولانا عبدالحق مرحوم جیسے نقاد اور قدرداں ہستی نے اس کی طباعت و اشاعت کا ذمہ لے لیا۔"

"Wahabi movement in Bihar تحریک وہابیہ اور بہار"

فصیح الدین بلخی مرحوم کی دوسری تاریخی تصنیفات کے ضمن میں Wahabi moument in Bihar کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، یہ مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی ایک منوز کڑی ہے یہ تصنیف انگریزی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ ایک مورخ کی حیثیت سے بلخی صاحب مرحوم کا یہ دوسرا کارنامہ ہے۔

یہ تصنیف سردست ۸ × ۱۳ کے سائز پر ٹائپ کی ہوئی ہے جس میں کم از کم ۳۲ سطریں اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ سطریں ہیں، پوری کتاب اول تا آخر ۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۶۰ (ساٹھ) صفحات

لہ مقالہ فصیح الدین کی عظیم شخصیت مصنفہ عبدالرؤف اورنگ آبادی مخطوط

لہ سہ یہ کتاب کلاسیکل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

میں صوبہ بہار میں تحریک وہابیہ کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ ان کتابوں کی فہرست مرتب نہیں کی جاسکی جن کے حوالے سے یہ تاریخ لکھی گئی ہے لیکن اوّل تا آخر فوٹ نوٹس دیئے ہوئے ہیں۔

جیساکہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے، پوری کتاب ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبۂ اردو ٹی۔ان۔بی۔کالج بھاگلپور نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے لیکن فاضل مترجم نے اردو کے مشہور شاعر مومن دہلوی، سلطان دہلوی، بہادر شاہ ظفر اور امیر تحریک وہابیہ کے ذکر کو باضابطہ ایک باب قرار دیا ہے۔ اس طرح ترجمہ میں ۲۳ ابواب کی جگہ ۲۴ ابواب ہوجاتے ہیں لیکن اس سے اصل کتاب کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۲۴ ابواب کی تفصیل یوں پیش کی جاتی ہے:

(۱) حضرت سید احمد شہید کا مسلک

(۲) شہر عظیم آباد کو مرکز قرار پانا

(۳) علمائے عظیم آباد کی خصوصیت

(۴) علمائے عظیم آباد کا سید احمد شہید کے ساتھ ہونا

(۵) اصول ہجرت

(۶) سرحدی جنگ

(۷) بالاکوٹ کا سانحہ

(۸) غزنی میں مولوی نصیر الدین کی شکست

(۹) حضرت ولایت علی اور عنایت علی غازی بحیثیت سربراہ۔

(۱۰) ہری پور میں وہابیوں کا اعتراف شکست

(۱۱) ۱۸۵۰ء تحریک کا احیاء اور قلعہ دہلی کے اندر تبلیغ

(۱۲) سلطان دہلی اردو کے مشہور شاعر مومن دہلوی کی وساطت سے تحریک وہابیہ کے امیر کو مدعو کرتے ہیں۔

(۱۳) عدم تعاون و خاموش مزاحمت اور متوازی حکومت

(۱۴) حضرت عنایت علی غازی کا برطانوی حکومت سے نبرد آزما ہونا۔

(۱۵) ۱۸۵۷ء میں دہلی کے وہابی رہنماؤں کی گرفتاری۔

(۱۶) سرحد پر برطانوی لشکر کی یورش

(۱۷) مولوی عبداللہ کا منصب امارت حاصل کرنا۔

(۱۸) انبالہ کی عدالتی تحقیقات

(۱۹) پٹنہ کی عدالتی تحقیقات

(۲۰) جائدادوں کی ضبطی اور قبور کی بربادی و بے حرمتی

(۲۱) نتائج مابعد (عواقب)

(۲۲) ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۰ء میں امیر خاں حشمت داد خاں کی گرفتاری اور سزا

(۲۳) بے ضابطہ کاروائی

(۲۴) ۱۸۸۴ء میں باقیماندہ لوگوں کی رہائی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے اس کی فہرست جو فوٹ نوٹس میں ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل کتابیں ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) سیرت اسمٰعیل شہید

(۲) سیرت سید احمد شہید

(۳) خطوط سید احمد شہید

(۴) تذکرہ صادقہ مصنفہ مولوی عبدالرحیم صادقپوری (امیر کالاپانی)

(۵) انڈین مسلم از ہنٹر صـ ۵۲ (Indian Muslim by Huntar)

(۶) کلکتہ ریویو صـ ۳۸۱ تا صـ ۳۹۲ (Culcutta Review)

(۷) مضمون ڈاکٹر کے۔کے دتا شائع شدہ بہار جرنل حصہ اول

ماسوا اس کے محلہ صادق پور کے گھروں اور قبروں کے نقشے وغیرہ اس کتاب کے خصوصی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم نے کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں پٹنہ سکریٹریٹ اور پٹنہ کلکٹریٹ کے ریکارڈ روم

کی چھان بین بھی کی تھی ان کے بھی حوالے دیئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبۂ اردو ٹی۔ان۔بی۔کالج بھاگلپور اپنے گرانقدر مقالے فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات میں کتاب کے ماخذ کے سلسلے میں اپنی یوں رائے پیش کرتے ہیں۔

"اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں تمام مستند ماخذ سے مدد لی گئی ہے۔اس سلسلہ میں مرحوم نے تمام اصل دستاویزوں کی چھان بین بھی کی اور ان کی مدد سے ہندوستان کی جنگ آزادی کے اس گم شدہ باب کو نہایت ہی دل آویز پیرایہ میں بیان کیا۔"

ہندوستان کی جنگ آزادی میں حضرت سید احمد بریلوی کی جماعت نے ایک نمایاں کام انجام دیا اس جماعت نے باضابطہ طور پر انگریزوں سے جنگ لڑی اور اس جماعت کے حامیوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے نیز سرحد میں ایک متوازی حکومت قائم کر لی تھی جس خلوص اور جوش سے یہ جماعت اپنے ملک سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے کوشاں تھی اور آج سے بہت قبل انگریزوں کی حکومت کا ہندوستان سے صفایا ہو جاتا لیکن اپنوں کی غداری اور انگریزوں کی عیاری و مکاری سے یہ جماعت پسپا ہو گئی۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اس تحریک کا جائزہ لیا جانے لگا تو لوگوں نے ان کے کارناموں کو نظر انداز کر دیا۔ تعصبات کی دنیا میں ان بزرگوں کے کارناموں کو صفحۂ تاریخ سے محو کیا جا رہا ہے، سید احمد بریلوی اور مجاہدین صادقپور نے جو کارنامے انجام دیئے ان کا آج کہیں نام و نشان نہیں اس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سلسلے میں بہار کے علمبرداروں میں صرف بابو کنور سنگھ کا نام لیا جاتا ہے، اس طرح مولوی عبدالرحیم صادقپوری (اسیر کالاپانی) کا نام کسی تاریخ میں موجود نہیں۔

اس موقع پر ملک کے کچھ باشعور اور انصاف پسند مورخوں نے اس جماعت کے کارناموں کو عوام سے روشناس کرانے کی کوشش، اس ضمن میں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا ابوالحسن ندوی کی کوشش قابل تحسین ہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے یہ تصنیف لکھ کر ان بزرگوں کے کارناموں کو جنھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں منظر عام پر لانے کی کوشش کی، جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم نے اپنے گرانقدر مقالہ "فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت" میں تحریک وہابیہ بہار

(Wahabi movement in Bihar) کے بارے میں اپنا یوں خیال ظاہر کیا ہے۔

"یہ تذکرہ ان کی سیاست اور سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے۔ تذکرہ مذکور کو انگریزی میں مرتب کر کے صوبائی اور مرکزی حکومت دونوں کے سامنے پیش کر دیا۔ مولانا آزاد مرحوم چاہتے تھے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے طبع ہو کر شائع ہو لیکن ان کی مجلس کے ارکان نے انہیں اجازت نہیں دی۔"

ڈاکٹر مظفر اقبال اپنے گرانقدر مقالہ "فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات" میں تحریک وہابیہ اور بہار کی قدر و قیمت کے بارے میں اپنا یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"اس غیر مطبوعہ کتاب سے کئی اہل علم استفادہ کر چکے ہیں، حال ہی میں اس موضوع پر قیام الدین صاحب نے ایک گرانقدر مقالہ (Thesis) پیش کر کے پٹنہ یونیورسیٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ اس مقالہ کی ترتیب میں اس کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، اس طرح صوبہ بہار کے مشہور و معروف مورخ اور فی الحال مگدھ یونیورسیٹی کے وائس چانسلر کالی کنکر دت صاحب کی کتاب Freedom movement in Bihar کی تدوین میں بھی بلخی صاحب مرحوم کی اس کتاب سے مدد لی گئی ہے۔

بلخی صاحب مرحوم نے اس کتاب کے آغاز میں یوں تحریر فرمایا ہے:

"The term Wahabi which means disciple of Abdul Wahab of Najad (Arabia) was applied to them by the British for the purpose of political propaganda. The Wahab of Najad had defied Turkish authorities in Arabia and resisted British influence in North Africa. The British subsequently took revenge in 1898 by destroying the grave

of Mahdi the last great leader of the sect in Sudan."

ہندوستان کی آزادی کا کوئی بھی تذکرہ بغیر وہابیوں کی تحریک کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، یہ اصطلاح انگریزوں نے عبدالوہاب نجدی کے پیروؤں کے لئے پروپگنڈہ کی غرض سے استعمال کیا تھا، نجد کے وہابیوں نے عرب کے ترکی حکمرانوں سے مقابلہ کیا، شمالی افریقہ میں برطانوی اثر و اقتدار سے ٹکر بھی لی تھی، برطانیوں نے آخر کار اس فرقے کے آخری امام مہدی کی قبر کھودی۔

بلخی صاحب مرحوم نے اپنی کتاب "تحریک وہابیہ اور بہار" میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے سلسلے میں کانگریسی رہنماؤں نے بطور تین سیاسی حربہ عدم تعاون، خاموش مزاحمت اور متوازی حکومت استعمال کیا تھا در اصل اس کی داغ بیل وہابی رہنماؤں نے ڈالی تھی، بلخی صاحب نے لکھا ہے۔

[1] "It is highly interesting to note that the use of the three great weapons namely non-co-operation, passive resistance and establishing parralel government which the Congress leaders adopted to fight against the bureaucracy was originally advocated and preached by the Wahabis."

راقم اوپر عرض کر چکا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم ایک غیر جانبدار اور انصاف پسند مورخ تھے اس کی مثالیں راقم نے تاریخ مگدھ کے حوالے سے دی ہیں، 'تحریک وہابیہ اور بہار' میں بھی

---

[1] تحریک وہابیہ اور بہار

ایسی ہی مثالیں ملتی ہیں۔

برطانوی حکومت نے ۱۸۶۴ء میں وہابی رہنماؤں پر مقدمہ چلایا اور بہتوں کو سزائے موت کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ جس جج نے پھانسی کا حکم دیا تھا اس کا نام سر ہربرٹ ایڈورڈس (Sir Herbert Edwards) تھا۔ فیصلے کے مطابق حضرت جعفر تھانیسری، مولوی یحییٰ علی، مولوی الٰہی بخش، مولوی احمد اللہ وغیرہ کو سزائے موت دینی تھی چنانچہ جج نے ان ملزموں سے متعلق اپنے فیصلے کے تمام کاغذات نیچے بڑھا دیئے لیکن بعد میں یہ فیصلہ اس لئے تبدیل کر دیا گیا کہ ملزموں کے شہید ہونے کے سبب ان کی شخصیت زندہ جاوید ہو جاتی لہٰذا پھانسی کی سزا کے بجائے انہیں کالا پانی بھیج دیا گیا۔ عدالت عالیہ کے اس فیصلے اور نیچے کی عدالت کی تبدیلی پر بلغی صاحب کس انداز سے تنقید کرتے ہیں، ہنٹر ص ۶۸ میں لکھتا ہے کہ برطانوی حکام نے نہایت ہی عقلمندانہ قدم اٹھایا کہ انہیں شہادت کے درجہ سے اس طرح محروم کیا لیکن یہ برطانوی امور اور کارکردگی پر نہایت ہی افسوسناک دھبہ ہے کہ انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر عدالت عالیہ کے فیصلہ کو بھی قربان کر دیا۔

۵ "Hunter (page 68) observes that "the British authorities took the wise revenge of denying even to the most reasonable of them the glory of matyrdom". But is a sad reflection on the British administration of Justice that the Judgement of even their highest tribunal was not free from subtle political consideration."

انبالہ کی عدالت عالیہ نے پٹنہ کے وہابی رہنما مولوی احمد اللہ کو پھانسی کی سزا دی تھی لیکن

---

۵ تحریک وہابیہ اور بہار

پٹنہ کی عدالت نے اس فیصلہ کو ترمیم کر ڈالا ساتھ ہی ساتھ مقدمہ کا بھی مذاق اڑایا، بلخی صاحب مرحوم برطانوی قانون شکنی کی کس طرح تنقید کرتے ہیں

پٹنہ کے آخری عظیم وہابی رہنما کو انبالہ کی عدالت نے چند شہادت کی بنا پر سزا دی لیکن پٹنہ کے جج نے آخری قانون شکنی کی جبکہ انبالہ کی عدالت عالیہ نے اپنے آخری فیصلہ میں پھانسی کا فیصلہ صادر کیا لیکن پٹنہ کی عدالت کو اس امر کا مجاز نہیں تھا کہ اپنے فیصلہ کو ترمیم کر کے انہیں کالا پانی بھیجے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

"Thus Ahmadullah the last great Wahabi leader of Patna was convicted in the Ambala trail. The judge of Patr. sentencea him to the last penalty of law with forfeiture of all his properties. But like the final decision in the Ambala trail the sentence of death passed on Ahmadullah was altered by the High Court."[1]

بلخی صاحب مرحوم نے "تحریک وہابیہ اور بہار" میں ایک باب "جائداد کی ضبطی اور قبور کی بے حرمتی" رکھا ہے لیکن اس باب کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اپنی علم و حکمت اور تہذیب و تمدن پر بڑا ناز تھا لیکن اپنے اقتدار کے نشے میں انسان سوز مظالم ڈھائے تھے جس کو پڑھ کر انسانیت پکار اٹھتی ہے اور ایسے واقعات کی خصوصی طور پر تاریخ کے صفحات پر سیاہ حروف کی لکیر رہ جاتی ہے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے۔

---

[1] تحریک وہابیہ اور بہار

[1] بلاشبہ یہ اعتراض شدہ حقیقت ہے کہ اہل برطانیہ نے کچھ ایسے کارنامے انجام دیئے جو انسانیت کے منافی ہیں یعنی جائداد کی ضبطی اور قبور کی بے حرمتی کا سیاہ کارنامہ جو برطانیوں نے انجام دیا۔ بلخی صاحب نے لکھا ہے:

"[2] But the most objectionable and we may say in human part played by the British authorities in connection with the confiscation of properties was the deliberate destruction of the graves of the Wahabis ancestors."

مولوی عبدالرحیم صادقپوری اسیر کالا پانی نے اپنی تصنیف 'تذکرہ صادقہ' میں اس کی تفصیل پیش کی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے تذکرہ صادقہ کے حوالے سے یوں لکھا ہے:

"[3] Abdur Rahim in the memories (Page 144.) describes the site of Sadiquepur's house as he saw after his return from the Andaman as follows.

" In the morning I went to Sadiquepur. There I saw that our houses had been demolished and turn into levelled ground and bazar and municipal buildings had been erected over them." Then I wanted

---

[1] تا [3] ملاحظہ ہو 'تحریک وہابیہ اور بہار' مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم

to visit the Cemetry where our ancestors had been buried for 14 generations. Particularly I wanted to visit my parents graves to say "Fatiha" (Requiem) and pray for their salvation. But all efforts to locate them were in vain. After through search and taxing my memory it appeared that the municipal buildings had been erected over the graves.

اس طویل اقتباس کو پڑھ کر انگریزوں کے بدترین کارناموں کی طرف ذہن رجوع ہوتا ہے خصوصی طور پر انگریزوں کو اپنے تدبر، علم و حکمت اور تہذیب پر بڑا ناز تھا لیکن اقتدار کی ہوس اور نشے میں انہوں نے انسانیت کے منافی کام انجام دیئے۔ اگر انہیں دنیا کی بدترین قوم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ان وہابیوں کی نہ صرف جائدادوں کی ضبطی کی بلکہ ان کے آباد اجداد کی قبروں کی بھی بے حرمتی کی جو چودہ پشتوں سے اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوتے آرہے تھے۔

ڈاکٹر مظفر اقبال نے اپنے گرانقدر مقالہ میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ اس غیر مطبوعہ تصنیف سے کئی حضرات استفادہ کرچکے ہیں، بہار کے مشہور و معروف مورخ ڈاکٹر کے۔ کے۔ دتا نے بھی اپنی مشہور و معروف کتاب "تحریک بہار اور آزادی" (Freedom movement in Bihar) کی ترتیب میں اس کتاب "تحریک وہابیہ اور بہار" (Wahabi movement in Bihar) سے کافی مستفیض ہوئے ہیں۔ چنانچہ کے۔ کے دتا صاحب اپنی کتاب کے دیباچہ میں یوں لکھتے ہیں:

"[1] I am indebted to Sri F. Balkhi for the

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ "تحریک آزادی اور بہار" (Freedom movement in Bihar) مصنفہ ڈاکٹر کے کے دتا ص ۳

trouble he has taken in supplying me with information of certain sources."

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تحریک وہابیہ اور بہار" باب اول بعنوان تحریک وہابیہ (حضرت سید احمد بریلوی کا مسلک) The Wahabi creed کا آغاز یوں کیا ہے۔

The movement was originally started by Syed Ahmad of Rai Barailly with the object of introducing certain social and religious reforms among the Musalmans of India. But in the political circumtances of the time it developed and transformed itself into a religio-political creed which aimed at the destruction of the British power in India.

ڈاکٹر کے کے دتّا اپنی تصنیف "تحریک آزادی اور بہار" کے باب سوئم میں تحریک وہابیہ اور بہار کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں:

The movement was originally started by Syed Ahmad of Rai Barailly with the object of introducing Certain Social and relegious reforms of Muslims of India.. But in the political circumtances of the time it developed and assumed a relegious political character at the destruction of the British power in India.

میں نے سطور بالا میں یہ عرض کیا ہے کہ انبالہ کی عدالت عالیہ نے پٹنہ کے وہابی رہنما مولوی احمد اللہ کو پھانسی کی سزا دی تھی لیکن پٹنہ کی عدالت نے اس فیصلہ کو ترمیم کر ڈالا۔ چنانچہ بلجی صاحب مرحوم نے اس فیصلہ کی تبدیلی پر سخت نکتہ چینی کی ہے، بلجی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

Thus Ahmadullah the last great Wahabi leader of Patna was convicted in the Ambala trail. The judge of Patna sentenced him to the last penaltg of law with forfeitures of all his properties. But like the final decision in the Ambala trail, the sentence of death passed on Ahmadullah was altered by the High court.

چنانچہ ڈاکٹر کے۔ کے دتا نے بلجی صاحب مرحوم کی اس انگریزی عبارت کی ہوبہو نقل اپنی تصنیف "تحریک آزادی اور بہار" (Freedom movement in Bihar) میں پیش کی ہے۔ دتا صاحب یوں لکھتے ہیں۔

[a]"Thus Ahmadullah the last great Wahabi leader of Patna was convicted mainly on the evidence of the convict in the Ambala trail. The judge of Patna sentenced him to the last penalty of law with forfeitures of all his properties. But like the final decision in the

---

[a] Freedom movement in Bihar Vol I Pages 79-80 & 73-99

Ambala trail the sentence of death passed on Ahmadullah was altered by the High court."

ڈاکٹر کے۔ کے دتا نے اپنی تصنیف "تحریک آزادی اور بہار" حصہ اول کے تیسرے باب میں جہاں انہوں نے تحریک وہابیہ اور بہار کا جائزہ لیا ہے وہاں انہوں نے اس باب میں سرخیاں پیش کی ہیں۔

(۱) حضرت سید احمد بریلوی کا مسلک
(۲) صوبہ بہار و بنگال میں تحریک وہابیہ کی ترویج و ترقی
(۳) مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی بحیثیت سربراہ
(۴) ۱۸۵۰ء میں تحریک کا احیاء اور قلعہ دہلی کے اندر تبلیغ
(۵) ۱۸۵۷ء میں وہابی رہنماؤں کی گرفتاری
(۶) سرحد پر برطانوی لشکر کی یورش
(۷) مولوی عبداللہ کا منصب امارت حاصل کرنا
(۸) انبالہ کی عدالتی تحقیقات
(۹) پٹنہ کی عدالتی تحقیقات
(۱۰) جائدادوں کی ضبطی اور قبروں کی بے حرمتی و بربادی
(۱۱) امیر خاں اور حشمت داد خاں کی گرفتاری اور سزا
(۱۲) ۱۸۸۴ء میں باقی ماندہ لوگوں کی رہائی۔

مذکورہ مثالوں سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر کے۔ کے دتا نے اپنی تصنیف کی ترتیب میں بلخی صاحب مرحوم کی اس غیر مطبوعہ تصنیف سے کس قدر استفادہ کیا ہے نیز جا بجا انہوں نے بلخی صاحب کی عبارت کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مظفر اقبال نے اپنے مقالہ "فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات" میں یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر قیام الدین صاحب نے بھی اس غیر مطبوعہ تصنیف سے استفادہ کیا ہے چنانچہ قیام الدین صاحب نے

اپنی تصنیف "ہندوستان میں تحریک وہابیہ" کے دیباچہ میں یوں لکھا ہے:

"The late Fasihuddin Balkhi Saheb of the persian manuscript section of the Patna University Library was also a valuable source of help."

ڈاکٹر قیام الدین احمد کی تصنیف "تحریک وہابیہ اور ہندوستان" دس ابواب پر مشتمل ہے، ان ابواب کی سرخیاں یہ ہیں:

(۱) تحریک وہابیہ کے اصول اور اغراض و مقاصد

(۲) حضرت سید احمد بریلوی کے حالات زندگی اور مسلک

(۳) جنگ بالاکوٹ اور تحریک فرازی

(۴) مولوی ولایت علی اور عنایت علی بحیثیت سربراہ

(۵) تحریک وہابیہ کی خفیہ تنظیم

(۶) سرحدی تحریک ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۳ء

(۷) وہابی رہنماؤں کی حکمت عملی اور ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء کا غدر

(۸) وہابی رہنماؤں پر ۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۵ء کے دوران مقدمہ اور عدالتی تحقیقات

(۹) تحریک وہابیہ کے مختلف ادوار

(۱۰) بعدۂ تحریک وہابیہ کے نتائج

انبالہ تحقیقات کے ضمن میں ڈاکٹر قیام الدین احمد اپنی تصنیف "تحریک وہابیہ اور ہندوستان" میں یوں لکھتے ہیں۔

The preliminary, committment enquiry lasting over a week was held in the court of Tighi by the Deputy Commissioner of Ambala.

The session trail opened in the court of Herbert Edwards the session judge Ambala in April 1884. The session judge was assisted by four assessers, two Hindus and two Muslims. In all eleven persons faced the charge of waging war against the Queen. The prisioners were charged under section 121 of Indian penal code for waging was against the Queen."

راقم نے سطور بالا میں یہ عرض کیا ہے کہ حکومت برطانیہ نے ان وہابی رہنماؤں کی جائداد کی ضبطی کی اور قبور کی بے حرمتی بھی، محلہ صادقپور میں جو آج موجودہ پٹنہ میونسپل کارپوریشن آفس ہے دراصل ان وہابی رہنماؤں کا آبائی مکان اور خاندانی قبرستان تھا، چنانچہ ڈاکٹر قیام الدین نے بھی اپنی کتاب "تحریک وہابیہ اور ہندوستان" میں اس پہلو کی نشاندہی کی ہے، قیام الدین احمد صاحب لکھتے ہیں:

Lieutenant Governor also directed the Commission under section 7 of Regulation XIX of 1810 to report how the immovable properties were to be dealt with at the same time he recomended the Government of India that the land and house properties situated within the City be made over to the municipal corporation for the use of City. In reply to this recommendation the Government of India directed that the premises at Sadiquepur where the conspiracy

was carried on be made over to the munic-pality with a view to their being raised to the ground and on open market be built on the site to devote a portion for sale."

ڈاکٹر قیام صاحب نے بلخی صاحب مرحوم کی اس غیر مطبوعہ تصنیف کی اشاعت سے قبل حد درجہ استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر قیام الدین صاحب نے اپنی کتاب میں ان وہابی رہنماؤں کی ضبط شدہ جائداد کا جو سابق نقشہ پیش کیا ہے وہ دراصل بلخی صاحب مرحوم کی تصنیف سے اخذ کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کی اس تصنیف سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے سلسلے میں وہابی رہنماؤں نے کیا کیا قربانیاں پیش کیں۔

باب ششم

فصیح الدین بلخی بحیثیت محقق

فصیح الدین بلخی مرحوم نے ادبی دنیا میں بحیثیت ایک محقق کیا کارنامے انجام دیئے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ موصوف بحیثیت محقق ایک نئی روش پر گامزن ہوئے ساتھ ہی ساتھ ان کی تحقیق کا انداز دیگر محققین سے جداگانہ تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی فطرت میں تحقیق کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ذیل میں ان کے تحقیقی کارناموں سے بحث کی جاتی ہے۔

ایک محقق کا سب سے اہم یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ تحقیقی امور کے ضمن میں دیگر محققوں کی رہبری اور رہنمائی کرے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم تحقیق کے سلسلہ میں ہمیشہ دوسرے محققوں کے تحقیقی کاموں میں رہنمائی کرتے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم نے اپنے گرانقدر مقالہ بعنوان "فصیح الدین بلخی کے متعلق میرے تاثرات میں اس امر کی نشاندہی کی ہے" انہوں نے لکھا ہے۔

"حضرت بلخی مورخ، محقق اور جامع الحقائق تھے، وہ صرف میر تحقیق نہ تھے بلکہ شیخ دستگیر بھی تھے، نہ جانے کتنوں نے ان سے فیض پایا۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا کے سلسلہ میں حضرت بلخی سے مجھے بھی ارادت رہی ہے، حضرت بلخی نے ہمیشہ بڑی کشادہ دلی سے میری مدد کی ہے، ہم نے حضرت بلخی کی کتاب "تاریخ مگدھ" کے علاوہ ان سے براہ راست بھی استفادہ کیا ہے۔ حضرت آیت اللہ جوہری پھلواروی کی مثنوی "مثنوی گوہری" جوہری کا کا نسخہ پروفیسر حسن عسکری کی تلاش و جستجو کا حاصل ہے تو جوہری کی تصویر حضرت بلخی کے انکشاف کی دلیل ہے۔"

چنانچہ اختر صاحب نے اپنی تصنیف "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" میں بلخی صاحب مرحوم کو

بطور تحفہ پیش کیا ہے اس میں بھی موصوف نے اپنے دست خاص سے یہ جملہ لکھا ہے۔

"اعتراف معاونت کے طور پر ہدیۂ پُر خلوص منجانب اختر اُورینوی"

پروفیسر سید علی حیدر نیر اپنے مقالہ "فصیح الدین بلخی کی شخصیت اور علمیت" میں اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنا یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں میر سوز پر اپنے تحقیقی مقالہ کی ترتیب کے سلسلہ میں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں گیا، وہاں پہلی بار فصیح الدین بلخی مرحوم سے ملاقات ہوئی وہ اندنوں شعبۂ مخطوطات کے انچارج تھے، آپ بے حد شفقت و محبت سے پیش آئے۔ میر سوز کے کلام کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ جو اس شعبہ کی ملک ہے۔۔۔۔۔ علاوہ بریں ایک قدیم انتخاب کلام شعرائے اردو سے بھی مطلع فرمایا جس میں میر سوز کے کلام کا انتخاب تھا اور مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی ہدایت کی۔"

بلخی صاحب مرحوم نے بہار کے تمام نوجوان محققین کی کڑی رہنمائی کرتے تھے چنانچہ جن نوجوان محققین نے تحقیقی مقالہ پر قلم کئے وہ بھی حضرت بلخی مرحوم کی ذات سے مستفیض ہوئے، ڈاکٹر مظفر اقبال نے اس امر کی مزید وضاحت کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"بلخی صاحب نے صوبہ بہار کے تمام نوجوان محققین کی رہنمائی کی ہے اور ایک طرح سے اس فن میں انہیں تربیت دینے۔ اس لحاظ سے بلاشبہ ان کی بڑی اہمیت ہے۔ صوبہ بہار میں اس وقت کئی بلند پایہ محقق موجود ہیں جو ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں لیکن حق یہ ہے کہ بلخی صاحب جس شفقت اور لگن سے نوجوانوں کی رہنمائی کرتے تھے وہ ان کی ذات پر ختم ہو گئی۔"

ڈاکٹر خواجہ افضل امام اپنے مقالہ بعنوان "بلخی صاحب مرحوم اور پٹنہ یونیورسٹی" میں رقم طراز ہیں کہ بلخی صاحب نے اپنی پٹنہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ہر ریسرچ اسکالر کی رہنمائی کی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ جتنے لوگوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے بھی ریسرچ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں خواہ وہ اردو فارسی یا تاریخ کے ہوں وہ تمام ریسرچ اسکالر بلخی صاحب مرحوم کے مرہون منت ہیں۔ موصوف یوں لکھتے ہیں:

"جتنے لوگوں نے پٹنہ یونیورسیٹی سے اردو، فارسی یا تاریخ میں ریسرچ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں وہ بلاشبہ بلخی صاحب مرحوم کے مرہون منت ہیں۔ خوش نصیب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا مقالہ ان کی زندگی میں تیار کرالیا، جو بچ گئے وہ ابتک یوسف بے کارواں بنے پھر رہے ہیں، مرحوم کا تعلق جتنا اردو فارسی و عربی سے تھا اس سے کسی طرح کم تاریخ سے نہ تھا...... تاریخ کے طلبہ بھی ان سے فیضیاب ہوتے تھے، ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ڈاکٹر قیام الدین احمد، برہمدیو پرشاد امبشٹ اور لکھمی کانت چودھری کر سکتے ہیں"

مندرجہ بالا شہادت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم کے جہاں تک محقق ہونے کا سوال ہے ان میں یہ خوبیاں موجود تھیں کہ وہ تحقیقی امور کے ضمن میں ہمیشہ فراخدلی سے دیگر محققین کی حوصلہ افزائی نیز رہنمائی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم کا تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک" ڈاکٹر سید صدرالدین کا مقالہ "شاہ آیت اللہ جوہری اور ان کی مثنوی" ڈاکٹر سید محمد حسنین کا مقالہ "مرزا محمد علی فدوی" ڈاکٹر مطیع الرحمن کا مقالہ "راسخ کے دو شاگرد محسن اور فرحت" وغیرہ۔ مثالیں کہاں تک دی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبہ اردو ٹی۔ ان۔ بی کالج بھاگلپور اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں کہ صوبہ بہار میں جو تحقیق کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ان میں بلخی صاحب کی ذات مقدم ہے، یہاں تک کہ بعض تحقیقی مقالوں کی ترتیب و تدوین میں بلخی صاحب مرحوم کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"[1] اس طرف چند برسوں میں صوبہ بہار میں تحقیق کا جو غیر معمولی ذوق و شوق لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ان میں بلخی صاحب کا بھی ہاتھ ہے تحقیق کرنے والے اپنی الجھنیں دیکھ کر بلخی صاحب کے پاس حاضر ہوتے اور وہ بڑی آسانی سے ان کی مشکلوں کو حل کردیتے۔ بعض حضرات کے مقالے کی ترتیب و تدوین کا کام بلخی صاحب نے انجام دیا ہے لیکن افسوس ہے یہ حضرات مرحوم کی بے لوث خدمت کا اعتراف تک نہیں کرتے۔"

---

[1] "فصیح الدین بلخی مرحوم، چند یادیں" مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

فصیح الدین بلخی مرحوم کے تحقیقی کارناموں میں ان کی تصنیفات اور ان کے مضامین خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں نیز ان کی غیر مطبوعہ تصنیفات بھی خصوصی طور پر اہمیت کی حامل ہیں، ان کی مطبوعہ تصنیفات میں تذکرہ نسوانِ ہند اور تذکرہ ہندو شعرائے بہار ہیں۔ ان دونوں تصنیفات کی حیثیت ایک تذکرہ کی ہے۔ ایک تذکرہ نگار اس وقت تک اپنے فن میں کامیاب نہ ہوگا جب تک کہ وہ پختہ شعور نہ رکھے۔ تحقیق کے سلسلہ میں وہ سنی یا سنائی باتوں پر عمل نہ کرے۔ تحقیقی امور میں اگر کسی محقق سے کوئی لغزش سرزد ہو تو اس کی تصحیح کرلے۔ ایک محقق کے لئے اشد ضروری ہے کہ اگر کوئی نیا انکشاف ہو تو اس کو دلائل کے ساتھ قلمبند کرے۔ اگر کوئی محقق سے تحقیق کے سلسلہ میں کوئی غلط بیانی ہو تو اس کی ادبی حیثیت پر حملہ نہ کرے بلکہ اس کی ادبی اہمیت کا احترام کرے۔

مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کے تحقیقی کارناموں کا سطور ذیل میں جائزہ لیتے ہیں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم تحقیق کے سلسلہ میں کوئی بھی انکشاف کو ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے یہاں تک کہ تصنیف کی ترتیب و تدوین کے بعد بھی یعنی مطبع (Press) میں جانے کے بعد بھی کسی تحقیقی واقفیت کو بلخی صاحب مرحوم اپنی تصنیف کے مقدمہ میں درج کردیتے تھے اس کی مثال دکن کی مشہور شاعرہ چندا ماہ لقا سے پیش کی جاتی ہے، چندا کے دیوان کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

[1]" دیوان کی کوئی نقل راقم کو دستیاب نہ ہوئی۔"

چنانچہ جب بلخی صاحب مرحوم کی نظر سے چندا کا دیوان گذرا تو انہوں نے اس کا ذکر کتاب کے مقدمہ میں کیا۔ بلخی صاحب نے لکھا ہے۔

[2]" راقم نے صفحہ ۲۰ میں دوسرے تذکروں کے حوالے سے لکھ دیا ہے کہ چندا ماہ لقا کا دیوان لندن میں ہے اور صفحہ ۲۳ میں لکھ دیا ہے کہ دیوان کی کوئی نقل راقم کو دستیاب نہ ہوئی لیکن ابھی ایک ہفتہ ہوا اس کے دیوان کا ایک نسخہ ۲۳۸م ۱۲۳۶ھ کا لکھا ہوا کتب خانہ آصفیہ

---

[1]، [2] "تذکرہ نسوان ہند" مصنفہ فصیح الدین بلخی ص ۲۳

حیدر آباد میں راقم کی نظر سے گذرا۔"

تذکرہ نسوان ہند کے متعلق پروفیسر منظفر اقبال کا یہ خیال ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد بلخی صاحب مرحوم ایک نکتہ رس اور ژرف نگاہ محقق کی حیثیت سے مشہور ہوئے، موصوف لکھتے ہیں:

"تذکرہ نسوان ہند کی اشاعت نے انہیں ایک نکتہ رس اور ژرف نگاہ محقق کی حیثیت سے کافی شہرت عطا کی۔"

بلخی صاحب مرحوم اپنی تصنیف تذکرہ نسوان ہند میں جہاں بھی کسی خاتون کے کارناموں کو پیش کیا ہے وہاں انہوں نے تحقیقی امور کو مدنظر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر شہنشاہ بابر کی بیوی اور ہمایوں کی والدہ ماہم بیگم کے تذکرہ سے اس کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس بیگم نے دہلی کے پرانے قلعہ کے پاس ایک مدرسہ اور مسجد سنہ ۹۶۹ھ میں تعمیر کرائی تھی چنانچہ صاحب تصنیف نے اپنی تحقیق کو تقویت پہنچانے کے لئے مسجد کے کتبہ کی نقل بھی پیش کی ہے۔ اس کتبہ پر اشعار کندہ ہیں۔ اشعار یہ ہیں ؎

بدوراں جلال الدین محمد	کہ باشد اکبر شاہان عادل
چو ماہم بیگم عصمت پناہی	بنا کرد ایں بنا بہرا فاضل
ولے شد ساعیٔ ایں بقعۂ خیر	شہاب الدین احمد خان باذل
زہے خیریت این بقعۂ خیر	کہ شد تاریخ او خیر المنازل
	۹۶۹ھ

لفظ خیر المنازل مصرعہ کا مادۂ تاریخ ہے۔

دہلی کی مشہور خاتون فخر النسا بیگم جو نواب شجاعت علی خاں کی حرم خاص تھی اس خاتون نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی یادگار میں ایک مسجد کشمیری دروازہ دہلی کے قریب تعمیر کرائی تھی جو اس کے نام سے فخر المساجد کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ فاضل محقق نے اپنی تصنیف میں اس مسجد کے کتبہ کی بھی نقل پیش کی ہے۔

خاں دیں پرور شجاعت خاں بجنت یافت جا
با رضائے حق تعالیٰ از طفیلِ مرتضیٰ

صدِ خاتوناں کنیزِ فاطمہؓ خسرو جہاں
یادگارش ساخت ایں مسجد بفضلِ مصطفےٰؐ

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ نسواں ہند" میں کسی خاتون کے سنہ وفات کے ضمن میں اس قطعۂ تاریخ کو بھی پیش کیا ہے تاکہ ان کی تحقیق کو مزید تقویت پہنچ سکے۔

صوبہ بہار کی مشہور مخیر خاتون بی بی صغریٰ جن کے فیوض و برکات میں مشہور تھیں نیز انھوں نے اپنی کافی جائداد اہل حاجت کے لئے وقف کر دی تھی اس خاتون نے ۱۹۰۹ء میں وصال کیا چنانچہ بلخی صاحب نے ان کی تاریخ وفات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قطعہ تاریخ کا بھی سہارا لیا ہے تاکہ ان کی تحقیق صحیح اور درست ثابت ہو۔ قطعۂ تاریخ یہ ہے ؎

رفت صغریٰ بباغ خلد از دہر — محسنہ بعد مریم و زہرا
از سرِ پائے حزن ہاتف گفت — سالِ رحلت قیامت صغریٰ

۱۹۰۹ء

بیگم عابدہ جو نواب یوسف علی خاں والئ ریاست رام پور کی دختر اور نواب زین العابدین خاں بہادر فوجدار راج سوامی ریاست جے پور کی محل خاص تھیں۔ یہ خاتون فن شاعری میں مہارت رکھتی تھیں چنانچہ اس بیگم کی وفات کی تاریخ کے سلسلہ میں فاضل محقق نے قطعۂ تاریخ کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے یہ قطعہ تاریخ میر محمد جویا نے اس بیگم کے ایک مصرعہ سے نکالی تھی۔ تاریخ وفات یہ ہے۔

یہ کرامت اس کی ہے جویا کہ خود فرما دیا — تا قیامت رحمتِ خلاق باری قبر کو
کشتہ ہیں اے لاغری ہم رنگ گندم گوں کے جو — ہے سکون گندم کی بس کافی ہماری قبر کو

۱۲۸۶ھ

فصیح الدین بلخی مرحوم کسی تحقیق طلب معاملہ میں مزید طوالت میں جانے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے بلکہ ٹھوس دلائل کے ساتھ اس نکتہ کو چند سطروں میں ادا کر دیتے رہے چنانچہ اس کی مثال تذکرہ نسواں ہند" سے بھی دی جا سکتی ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب (عالمگیر) کی دختر زیب النساء مخفی اپنی شاعری میں یکتائے زمانہ

تھی۔ تصوف سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور اس کی طبیعت میں مذہبی رجحان بھی تھا، زیب النسا صاحب دیوان شاعرہ بھی تھی لیکن ایک تذکرہ نگار مولف اختر تاباں نے اپنے تذکرہ میں یہ لکھ دیا کہ یہ صاحب دیوان نہ تھی، چنانچہ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ دیوان مخفی کے نام سے جو دیوان مشہور ہے وہ کسی اور شاعر یا شاعرہ کا کلام ہے۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے اس غور طلب تحقیقی مسئلہ کو زیب النسا مخفی کا یہ شعر کتنی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بلخی صاحب نے لکھا ہے۔

"زیب النسا کے مذہبی خیالات اور اس دیوان کے اشعار کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ یہ دیوان اس کی تصنیف ہے اور ذیل کے شعر سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے، شعر یہ ہے ؎

دختر شاہم ولیکن او بفقر آوردہ ام زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النسا است"

بہر کیف اب تک کوئی نہ بتا سکا کہ اگر یہ دیوان اس کا نہیں تو کس کا کلام ہے۔ آگے چل کر بلخی صاحب مرحوم نے اس شہادت کو مزید یوں پیش کیا ہے۔

"لوگوں نے بہت سے لطیفے اور ہزلیات اس کی طرف منسوب کئے ہیں لیکن اس کے کلام کی پاکیزگی کو دیکھ کر یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ تمام لطیفے اور ہزلیات لوگوں کی من گڑھت ہیں۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ نسواں ہند" میں بعض ادبی مسائل کے ضمن میں غیر تحقیقی امور کا بالکل پردہ چاک کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر نور جہاں بیگم جو شہنشاہ جہانگیر کی بیگم تھی شاعری میں مہارت رکھتی تھی اور اس کا تخلص مخفی تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اردو اشعار بھی اس شاعرہ کی طرف منسوب کر دیے ہیں۔ چنانچہ فاضل محقق ان غلطیوں کو کس طرح بے نقاب کرتا ہے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

"بعض لوگوں نے کچھ اردو اشعار بھی اس بیگم کی طرف منسوب کر دیئے ہیں . . . . . . اشعار کی زبان خود بتاتی ہے کہ ایسی سلیس زبان جہانگیر کے وقت میں نہیں بولی جاتی تھی۔ جن لوگوں کو اردو زبان کی ارتقائی تاریخ سے واقفیت ہے وہ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اشعار نور جہاں بیگم کے نہیں ہو سکتے"۔

ملاحظہ ہو ؎ کل تم جو یہ کہتے تھے شمشیر ہے اور میں ہوں
یہ طشت ہے اور سر ہے تقصیر ہے اور میں ہوں

ظاہر ہے مرے حال کو سر سبز نہ جانو
پوشیدہ جگر رکھتی ہوں مانند حنا کے
چمن میں ہے یہ ہستی ہے . جو . بوٹی
نگہ کے بوجھ سے جاتی ہے ٹوٹی

عام طور پر کوئی محقق اپنی تصنیف میں تحقیق کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ماخذوں کا حوالہ دیتا ہے اور اس پر اکتفا کرتا ہے لیکن فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تحقیق میں ایک نئی روش اختیار کی ہے جو ان کے علاوہ کسی دیگر محقق میں ہم ایسی باتیں بہت ہی کم پاتے ہیں۔ انہوں نے کسی واقعہ کی چھان بین کے بعد اپنی ذاتی رائے پیش کی ہے، اس کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ بلقیس بیگم جو تصویر تخلص اختیار کرتی تھی یہ شاعرہ عشقی عظیم آبادی کی زوجہ تھی۔ چنانچہ مولوی عباس مؤلف "مشاہیر نسواں"، نے اختر تاباں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب ایک دن اپنے طفل شیر خوار بچہ کو گود میں لیے تھی کہ عشقی نے دیکھ کر یہ مصرع کہا ؎

دیدم بدوش آں ہمہ طفلے پری نژادے

تصویر نے اس وقت دوسرا مصرع کہا ؎

چوں مصرعہ کہ باشد پیوند مستزادے

چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے اس تحقیقی پہلو کو چھان بین کرنے کے بعد اپنی رائے لکھی ہے:

"حال میں راقم نے عندالتذکرہ مشہور و معروف ادیب و محقق قاضی عبدالودود بیرسٹر سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ عشقی نے اپنے تذکرہ میں کسی شاعرہ کا ذکر نہیں کیا ہے اور ان دونوں مصرعوں سے جو مطلع مرتب ہوتا ہے وہ عشقی کے کلام میں موجود ہے بہر کیف تذکرہ عشقی میں شاعرات کا ذکر نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، گلستان سخن میں مرزا صابر دہلوی نے اپنی بیوی کا جو مخفی تخلص کرتی تھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ نسوان ہند" کی ترتیب میں لگ بھگ پینتیس[۳۵] مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا حوالہ دیا ہے چنانچہ کافی عرق ریزی کے بعد یہ کتاب ترتیب پائی۔

بلخی صاحب مرحوم کی دوسری تصنیف "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ہے۔ یہ ایک خالص تذکرہ ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس تذکرہ میں صاحب تصنیف نے کس حد تک تحقیق کا سہارا لیا ہے بظاہر ہے کہ یہ تصنیف کافی محنت کے بعد لکھی گئی ہے چنانچہ اس تصنیف کی ابتدا سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

نند لال، گویا صوبہ بہار کے متقدمین فارسی شعرا میں تھے۔ یہ سکھوں کے مقدس آخری گرو گرد گوبند سنگھ کے رفیقوں میں سے تھے اس قرب کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے نانک شاہی اختیار کر لیا تھا لیکن ان کا کلام نایاب تھا لیکن بلخی صاحب نے اول ان کے کلام کو منظر عام پر لایا، بلخی صاحب نے گویا کے متعلق یوں لکھا ہے۔

"نند لال گویا کے کچھ حالات پنجابی زبان میں کتابی صورت میں طبع ہوئے تھے۔ غالباً امرتسر میں دستیاب ہو سکتے ہیں، گویا کا دیوان نایاب تھا لیکن حسن اتفاق سے ایک دوست نے مجھے لا کر دیا۔ اس کے آخر میں کاتب نے گویا کے کچھ حالات بھی لکھے ہیں۔ اس کے بعد بلخی صاحب مرحوم نے گویا کے قلمی دیوان کی نقل پیش کی ہے اور ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا ہے ؎

کسے بحال غریبانِ نارسا نرسد | رسیدہ ایم بجائے کہ پارسا نرسد
طبیب عشق چنیں گفتہ است دم گویا | بحال درد غریباں بجز خدا نرسد

بدان مردمک دیدہ دلربا دیدم | بہر طرف کہ نظر کردم آشنا دیدم
بگرد کعبہ و بتخانہ ہر دو گردیدم | وگرنیافتم آنجا ہمیں ترا دیدم
بہر سوئے کہ نظر کردم از رہِ تحقیق | میان خانۂ دل خانۂ خدا دیدم
مراز روز ازل آمد ایں ندا گویا | کہ انتہائے جہاں را در ابتدا دیدم

از دوست غیر دوست تمنا نمی کنیم | با درد سر خوشیم دوا دا نمی کنیم
بیمار نرگسم کہ نرگس غلام اوست | با چشم دا بروئے کسے وا نمی کنیم

ہر جا کہ دیدہ ایم جمال تو دیدہ ایم ما جز جمال دوست تماشا نمی کنیم
گویا خموش باش کہ سودائے عشق یار تا این سر است از سر خود وا نمی کنیم

بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" میں کسی بھی شاعر کے حالات قلمبند کرنے کے سلسلہ میں کافی چھان بین کی ہے۔ عام طور پر کوئی محقق اپنی تحریر میں حوالوں کو ہمیشہ مدنظر رکھتا ہے تاکہ اس کی تحقیق کو تقویت پہنچ سکے۔ اگر کسی محقق نے مزید چھان بین نہ کی تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے فن میں لغزش ہو سکتی ہے لیکن جہاں تک بلخی صاحب مرحوم کی تحقیق کا سوال ہے انہوں نے کسی بھی تحقیقی مسئلے کی مزید چھان بین کی ہے اس کے بعد اپنی رائے پیش کی ہے اس کی اجاگر چند الفت کی شاعری سے تعلق ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے الفت کی شاعری کے متعلق لکھا ہے:

"الفت تخلص اور اجاگر چند نام عظیم آباد کے متقدمین ہندو شعرا میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ انشا پردازی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، آغا حسین عاشق مؤلف تذکرہ نشتر عشق ہندا بنی خوشگو مؤلفہ سفینۂ خوشگوار ڈاکٹر عبد اللہ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ اور مولوی عزیز الدین بلخی مؤلف تاریخ شعرائے بہار نے ان کا ذکر کیا ہے اور پروفیسر سید حسن عسکری صاحب نے رسالہ معاصر ۳؎ بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں الفت پر ایک مقالہ شائع کیا ہے جس کو انہوں نے انشاء غریب کا نادر نسخہ دریافت کرنے کے بعد لکھا ہے۔ اس مقالہ کی بدولت الفت کی ایک اردو غزل منظر عام پر آگئی...... عسکری صاحب نے ریختہ میں الفت کے پندرہ اشعار نقل کئے ہیں۔"

چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے عسکری صاحب کے مقالہ کا حوالہ دیکر صرف اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ذاتی طور پر قلمی دیوان الفت کا معائنہ کیا ہے نیز فاضل مضمون نگار (عسکری صاحب) سے مل کر مزید چھان بین کی ہے۔ بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے:

"انشائے غریب کا واحد نسخہ جس میں دیوان الفت بھی شامل ہے، کے پی جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ملک ہے، راقم نے دیکھا تو حیرت ہوئی کہ اس میں ریختہ کے پندرہ اشعار اور مخرالدولہ کے نام الفت کے خط کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ میں نے عسکری صاحب سے

اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے وہ اشعار اور خط اب اس نسخہ میں موجود نہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ نسخہ فروخت ہونے کے لئے آیا تھا یہ دونوں چیزیں موجود تھیں میں نے نقل کرلی تھی بعد میں یا تو فروخت کرنے والے نے وہ اوراق نکال لئے یا جلسازی کے وقت وہ اوراق خستہ حال اور بیکار سمجھ کر ضائع کر دیئے گئے۔"

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم کس قدر تحقیق کے ضمن میں چھان بین کرتے تھے اس کے بعد انہیں جو نتیجہ برآمد ہوتا تھا اس کو تحریر میں لاتے تھے، آگے چل کر بلخی صاحب مرحوم نے دیوان الفت کے متعلق یوں لکھا ہے۔

"دیوان الفت ۱۲۸ صفحوں پر خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے بہت غزلیں کاتب نے ناتمام چھوڑ دی ہیں اور اکثر اوراق آتش زدہ ہیں اول صفحہ پر یہ عبارت ہے۔

"دیوان منشی اجاگر چند الفت سکینہٹ باشی تخلص بہ الفت ایں لالہ مہابلی سورگ باشی جد مادری تخلص مدظلہ العالی۔"

اس کے بعد فاضل محقق نے الفت کے فارسی اور ریختہ کے نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے:

نمونۂ کلام: الفت نے جو غزل شیخ علی حزیں کے پاس اصلاح کے لئے بھیجی تھی اس کو بطور نمونۂ کلام پیش کرنا مناسب ہوتا ہے اس میں حزیں کی شاگردی کا بھی اعتراف ہے۔

من از درد جدائی خاطر اندوہگیں دارم — کہ دشمن در بغل ہمچوں دل خود در کمیں دارم
تسلسل تا ابد تا رسر سنگم را شود لازم — نفر از بسکہ بر زنجیر زلف عنبریں دارم
بجائے نالہ آم در سینہ سرو ناز می روید — ز بس در دل خیال قامت آں نازنیں دارم
بخاک افتادہ چوں من زعالم بر نمی خیزد — بسان نقش پا در کوئے او سر بر زمیں دارم
دلم از بستگی با نقد تہمت در گرہ دارد — نہ ہمچو کاکل او عقدہ در خاطر زکیں دارم
بہ ہفت اقلیم گردد نام کفر عشق او روشن — کہ اسم آں صنم نام خدا نقش نگیں دارم
بدام آوردنش صیاد من آساں نمی باشد — دل دیوانہ اکی چشم وحشت آفریں دارم
مبادا سیل اشک دیدہ از سر بگزرد یارب — ز راہ کوچہ آں شوخ گردے بر جبیں دارم

بفوجِ غمزہ غارتگرِ نگارے گشتہ مہمانم | چہ سازم نذر او یارب نہ دل دارم نہ دیں دارم
زسوزِ گریۂ ہجران ز خسارش چہ می پرسی | صد آتش پارۂ لختِ جگر در آستیں دارم
تر از دنکتہ ہائے آبدار از خامۂ الفتؔ | کہ ہر ساعت نظر بر فیضِ استادِ حزیںؔ دارم

نمونۂ کلام ریختہ

ریختہ میں الفتؔ کی ایک غزل ہی دستیاب ہوئی ہے جس کو عسکری صاحب نے اپنے مقالہ میں درج کیا تھا وہی اس جگہ نقل کی جاتی ہے۔

خلوت نشینِ غم کو تماشا سیں کام کیا | مخمورِ جامِ عشق کو صہبا سیں کام کیا
دیوانۂ محبتِ بے اختیار کون | تکلیف جان محبت دانا سیں کام کیا
مستِ مئے الست کہ ہے تشنۂ دگر | جامِ شراب کہنہ و مینا سیں کام کیا
آباد باد ملکِ قناعت و مردمی | ویرانۂ خرابیٔ دنیا سیں کام کیا
جس کو ہے زورِ ہمتِ بازوئے مردمی | ارثِ پدر و خانۂ بابا سیں کام کیا
آنا کہ ہست قفلِ خموشی بہ بابِ لب | چون و چرائے ... گویا سیں کام کیا
صاحب سخن سوں صحبتِ جاہل ... | سلک ... و گوہرِ یکتا سیں کام کیا
پروردۂ آفتابِ محبت کو روزِ حشر | باغِ نعیم و سایۂ طوبیٰ سیں کام کیا
جس کو ہے داغِ سینۂ و آتش تمام دل | سیرِ گل و تفرجِ لالہ سیں کام کیا
لینا متاعِ دل کا کفِ اختیار سوں | سودائے عشق و بے سر و پا سیں کام کیا
جس کو تپِ جدائی ہی کا مرض دل میں ہے | نازِ طبیب و تابِ مداوا سیں کام کیا
ترکِ وجود درسِ محبت کا ابتدا | بے مسئلہ محبتِ ملا سیں کام کیا
جائے کہ بوریائے نشیناں قدم نہند | فرشِ سمور و بسترِ دیبا سیں کام کیا
حاکم سوادِ انس ... شاہ ملکِ دل | ملکِ شہ سکندر و دارا سیں کام کیا
یارب غریب ملکِ معانی کو رہ نما | شکلِ مہیب و صورتِ زیبا سیں کام کیا

انشائے غریب اور دیوانِ الفتؔ میں دو ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جن کو بظاہر الفتؔ سے تعلق نہیں،

انشائے غریب کے صفحہ اول پر مرزا جلال الدین محمد کی لکھی ہوئی ایک رسید مبلغ پچیس روپیہ کی ایک انگریز حاکم کے نام سے ہے جس میں ۳۱ جنوری ۱۸۲۰ء تاریخ بھی درج ہے اور دیوان کے ایک صفحہ پر سمجھو دت رفعتی شاگرد الفتی کا کہا ہوا ایک قطعہ تاریخ ہے۔

راجہ رام نرائن موزوں کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

"مہاراجہ رام نرائن نائب ناظم صوبہ بہار فارسی کے صاحب دیوان اور خوشگو شاعر تھے شیخ علی حزیں متوفی ۱۱۸۰ھ کے شاگردوں میں تھے۔ موزوں کا مطبوعہ دیوان ۴۴ صفحوں پر محیط ہے، راقم کی نظر سے گذرا ہے اس کے علاوہ ان کے خطوں کا ایک مجموعہ موسوم بہ دستور الانشاء بھی ان کے وارث رائے متھرا پرشاد کے پاس ہے جس میں سیکڑوں مکتوبات ہیں جو اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں یہ بھی راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ سفینہ خوشگو میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ان کی سیاسی زندگی اور عہد حکومت کا صوبہ بہار کے تمام تاریخوں میں بھی ان کا ذکر ہے۔

مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کی شخصیت کے بارے میں بلخی صاحب مرحوم نے اپنی یوں تحقیقی روشنی ڈالی ہے:

"کلیان سنگھ اپنے باپ کی طرح شعرا اور ادیبوں کے قدرداں ہونے کے علاوہ بذات خود تواریخ، شاعری اور ادب میں کافی دستگاہ رکھتے تھے، مثنوی زیبا، حبیب اسیر، مدح ائمہ اطہار اور اس کے علاوہ خلاصۃ التواریخ اور واردات قاسمی یادگار چھوڑیں، یہ سب کتابیں فارسی میں ہیں، تاریخی کتب انہوں نے مسٹر ابراہیم والیڈ کی فرمائش سے لکھی تھیں، ان کتابوں کو انہوں نے ۱۲۲۷ھ میں تمام کیا، اس وقت ان کی بصارت بھی جاتی رہی تھی..... خلاصۃ التواریخ کا انگریزی ترجمہ نواب سرفراز حسین خاں مرحوم نے کیا تھا۔

مذکورہ بالا مثالوں سے اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نے مزید چھان بین کے بعد اپنی تصنیف "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ترتیب دی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کے تحقیقی کارناموں میں ان کی غیر مطبوعہ تصنیف آثار قدیمہ کی ایک اہمیت ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنی تصنیف "تاریخ مگدھ" کے مقدمہ میں کیا ہے۔ اس تصنیف میں اہم عمارات،

مساجد اور قبور کے کتبات کی نقلیں ملتی ہیں، یہ کتبات انہوں نے بہت جانفشانی اور چھان بین کے بعد حاصل کیا تھا اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ وہ تحقیق میں فیلڈ ورک (Field Work) کو بہت ہی مقدم سمجھتے تھے، اپنے تحقیقی کارناموں کے سلسلے میں جس مقام کا انہوں نے سفر کیا وہاں کی نادر عمارات، مساجد اور قبور کے کتبات کی نقلوں کو حاصل کر لیتے تھے، اس ضمن میں جناب عبدالرؤف اورنگ آبادی مرحوم نے اپنے مقالہ "فصیح الدین بلخی مرحوم کی عظیم شخصیت" میں یوں لکھا ہے۔

"مرحوم کا اہم اور نمایاں کارنامہ اثری انکشافات اور تحقیقات ہے، صوبہ کے بیشتر تاریخی مقامات کے آثار قدیمہ کے کتبات انہوں نے نقل کئے اور بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے انہوں نے نقل کئے ہیں اور ان کی تاریخی حیثیت دریافت کر کے ان پر نوٹ بھی لکھا ہے۔"

جناب بدر الدین احمد بدر عظیم آبادی اپنے مقالہ "مولوی فصیح الدین بلخی" میں اس امر کی مزید نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بلخی صاحب مرحوم نے بڑی کد و کاوش کے بعد لگ بھگ نو سو کتبات کی نقلیں حاصل کی تھیں چنانچہ موصوف نے اپنے مقالہ میں ان کتبات کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے" بدر الدین بدر عظیم آبادی یوں لکھتے ہیں۔

"اگر صنادید بہار جو بلخی صاحب مرحوم نے بڑی کاوش سے لکھی تھی اور جس میں نو سو کتبوں کا فوٹو چھپ کر منظر عام پر آ جائے تو ان کا مقام اور بھی اونچا ہو جائے گا، ضرورت ہے کہ ایک تاریخ داں اور ایک محقق کی حیثیت سے ان کا صحیح مقام لوگوں کو بتلا دیا جائے یہ اس وقت مکمل ہوگا جب متعدد آثار قدیمہ سے متعلق ان کے تحقیقی کارنامے لوگوں کے سامنے لائے جائیں۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم نے صوبہ بہار کے آثار قدیمہ کے کتبات سخت تلاش و جستجو کے بعد حاصل کئے ان میں زیادہ تر قصبہ منیر، عظیم آباد اور اس کے مضافات کے علاوہ انہوں نے قصبہ اورنگ آباد اور سہسرام کے آثار قدیمہ کے کتبات حاصل کئے، راقم کو چھان بین کے بعد بلخی صاحب مرحوم کی ایک خود نوشتہ بیاض دستیاب ہوئی جس میں انہوں نے قصبہ بہار شریف، ضلع مونگیر، شہر بھاگلپور اور ضلع سارن کے مقبرے اور مساجد نیز تاریخی عمارتوں کے کتبات درج ہیں، چنانچہ بلخی صاحب کے عمدہ تحقیقات اور انکشافات کے

ضمن میں جناب سید عبدالروف ندوی اورنگ آبادی مرحوم نے اپنے گرانقدر مقالہ "فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت" میں یوں لکھا ہے۔

"عصری تحقیقات کے معلومات پر عبور حاصل کرنے کے لئے ان کو عربی، فارسی، انگریزی، پالی زبان بھی ..... ہوئی تھی۔ مضافات اورنگ آباد میں مدن پوتھانہ کے پہاڑ کی ایک شاخ اوبھگانان ہے جس پر پودہ کا مندر، تالاب اور حوض وغیرہ بھی ہے مندر کے اندر پالی زبان میں ایک کتبہ پتھر پر کندہ ہے۔ جس میں ریاست دیو کے کچھ تاریخی معلومات ہیں، انہوں نے اس کا معائنہ کیا تو فوراً اس کا چربہ لے لیا اور کسی ماہر زبان پالی مدد سے اس کے معلومات حاصل کر کے ریاست دیو کے ایک مقدمہ دائر کئے گئے ہائی کورٹ پٹنہ اور پریوی کانسل میں اس کو پیش کرایا جس کے سبب انہوں نے موافقت میں ڈگری حاصل کی تھی۔"

چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے آثار قدیمہ کے کتبات کی نقلیں کافی کدوکاوش کے بعد حاصل کی تھیں، سطور ذیل میں ان آثار قدیمہ کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ ایک محقق کی حیثیت بلخی صاحب مرحوم کا صحیح مقام متعین ہو۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف آثار قدیمہ میں اول قصبہ منیر سے تعلق رکھنے والے کتبات کی نقلوں کو پیش کیا ہے۔ جابجا ان کتبات پر تاریخی حوالے اور تاریخی روشنی بھی ڈالی ہے، قصبہ منیر کی ایک قدیم ۷۹۸ھ کی مسجد کا کتبہ یہ ہے ؎

بحمد اللہ در عہد محبب	شہہ محمود سلطانِ مہذب
بہیں مسجد کہ بد بانیِ اول	خلیل الحق ز اقطابِ مقرب
چو حماد خطیر ایوان بپیراست	عمارت کرد باز از سر مرتب
ز ہجرت ہفت صد ہشت و نود بود	بہ عصمت دار بنیادش تو اے رب

یہ کتبہ قدیم ہونے کے علاوہ تاریخی حیثیت سے بھی ایک اہمیت رکھتا ہے وہ یہ کہ شہہ محمود سے سلطان محمود کا عہد مراد ہے جس نے ۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں کو جونپور صوبہ بہار کی حکومت دی تھی اس کی اولاد سلاطین شرقیہ کہلائی اور ایک صدی تک صوبہ بہار پر حکومت کرتی رہی، مسجد کے بانی

اول خلیل الحق سے غالباً مخدوم یحیٰی کے بیٹے اور مخدوم شرف الدین کے بھائی مراد ہیں، حضرت مخدوم دولت منیری کا وصال ۱۰۱۷ھ میں ہوا ان کی وفات اور مقبرے کی تعمیر کے کتبوں کی نقلیں آثار قدیمہ میں یوں ملتی ہیں۔ شاہ دولت کی وفات کا کتبہ ۱۰۱۷ھ

قطب اقطاب زماں قدوۂ دیں	آں کہ از مہر و مہ انور بودہ
شاہ دولت کہ سوئے عالم قدس	چوں زگیتی بہ سفر در بودہ
سال ہجرش خرد عاصی یافت	وارث حال پیمبر بودہ

۱۰۱۷ھ

مقبرہ کی تعمیر کا کتبہ ۱۰۲۵ھ

از بہر نثار ایں بنائے آباد	از درج دلم دو دُر تاریخ فتاد
اول بشمر روضۂ احباب و دوم	مانند بہشت جاوداں ایمن باد

۱۰۲۵ھ

قصبہ منیر کی ایک مسجد کی نقل بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف میں یوں پیش کی ہے۔

"اس مسجد کے اصل بانی ملا عبدالشکور تھے ۱۰۳۰ھ میں ابراہیم خاں نے اس کو از سر نو درست کرایا" یہ مسجد مخدوم دولت کے مقبرہ سے اتر جانب چند گز کے فاصلے پر ہے اس کے اتر خانقاہ واقع ہے مسجد کی ساخت میں کوئی غیر معمولی بات نہیں معلوم ہوتی اس کا صحن راستہ سے دس بارہ فٹ کی بلندی پر واقع ہے، بیچ کے در کے اوپر سنگ موسیٰ لوح میں یہ کتبہ ہے ؎

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شکر ایزد گو کہ از چون و چرا بر دہ ست نام	کز سپاس او شود فرخندہ دل شیریں کلام
مولوی عبدالشکور از واصلان حق بگو	پیشوائے راہ دیں، بودہ طریقت را امام
کرد مسجد را بنائے نیک از صدق و یقیں	از برائے سجدۂ طاعت خدائے پاک نام
مسجد آں مولوی افتادہ بود در گشتہ حالے	کرد ابراہیم خان از سر بنایش انتظام

در زمانِ شاہ عالمگیر غازی دیں پناہ	عادل و کشور کشا فرمانروائے روم و شام
علوی نسلِ قریش آں جان جاناں بن کبیر	شد بنا از مولوی او در جہاں فرخندہ نام
چوں مرتب شد زدل پرسیدم از تاریخ او	گفت از تاریخ او شد مسجد بیت الحرام

۱۱۰۳ھ

اس کے بعد اس غیر مطبوعہ تصنیف میں لال سے درگاہ شاہ ارزاں تک کی عمارات، مساجد اور قبور کے کتبوں کی نقل پیش کی ہے

باقر گنج کی مسجد ۱۲۵۷ھ

یہ مسجد معمولی قسم کی ہے۔ بیچ محراب کے اوپر یہ کتبہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسجد اُسس علی تقویٰ من اول یوم احق ان تقوم فیہ

بہر رضائے خدا ساختہ خیر النساء	مسجد عالی بنا چوں حرم محترم
خامۂ زاہد چو کرد سال بنایش طلب	ہاتفش آواز داد ثانیہ بیت الحرام

۱۲۵۷ھ

شاہ ارزاں کے مزار کا کتبہ ۱۰۲۸ھ

رفت قطب زماں بہ آسانی	بہ ریاض بہشت نورانی
سال فوتش زفیض ملہم غیب	گفت دل شاہ جنت ارزانی

۱۰۲۸ھ

اس کے بعد نمونہ یہ ہے پچھم دروازہ تک نچلی سڑک (انگلش روڈ) کے اطراف کا حال اس کتاب میں درج ہے:

"ڈنکے کی اہلی کی مسجد کا کتبہ ۱۱۹۶ھ

از کرم کریم گوید جبرئیل

۱۱۹۶ھ

بر رمضان روز جمعہ چوں گلاب	بنا کرد محراب رب الخلیق
چنیں ملہم غیب تاریخ گفت	بود مسجد ہمچو بیت العتیق

۱۱۹۶ھ

نوذر کٹرے سے خواجہ کلاں گھاٹ تک

سعید جہاں شاہزادہ محمد کریم کی قبر کا کتبہ

دریغا کرد رحلت شاہزادہ	گرامی زادہ از سلطان میسور
ہماں سلطان ٹیپو خلد مسکن	ز نسل اوست ٹالیگنج معمور
محمد با کریم و شاہ ہم کن	برائے نام آں مرحوم و مغفور
بعمر چہل و دو زینجا نگہ رفت	پے سیر ارم از مرگ مقبور
دو شنبہ سویم ذیقعدہ رفتہ	بسوئے جنت الفردوس مبرور
مشرف بود از حج و زیارت	بہ دنیا ہم میسّر عزّ موفور
ارادت داشت با شاہ جہانگیر	کہ اجمیری و چشتی ہست مشہور
پے تعلیم بیعت ساخت از جاں	بدست خواجہ امجد شاہ مشہور
بہ پٹنہ بارگاہِ عشق منزل	گرفت از چشم عالم گشت مستور
پے سال وصالش گفت شمشاد	سعیدِ خلد منزل لامع النور

۱۳۳۳ھ

پچھم دروازہ سے پورب دروازہ تک عمارتوں کا حال

گرہٹہ کی چھوٹی مسجد کا کتبہ

غلام محمد حکیم بزرگ	چوں فرمود تعمیر ایں سجدہ گاہ
شدہ از سر بانگ تاریخ داد	بخوبی بنا کرد مسجد براہ

۱۲۱۴ھ

محمدی جان کی مسجد کا کتبہ ۱۳۰۵ھ

اَفضلُ الذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ابوبکرؓ — عمرؓ

صالحہ بی بی محمدی جان چوں بیت خدا
باخلوص نیت وصدق ویقیں آراستہ ایں
چوں نباشد ایں عبادت گاہ خاصانِ الٰہ
مظہر نور خدا وجنت الماواست ایں
زاہتمام شیخ قاسم با علیؔ دیندار
ہمشبیہ مسجد دہلی فلک پیراست ایں
سال تعمیرش جو شہرت خواست از فکر بلند
شد رقم قصر بدیع مسجد اقصیٰ است ایں

عثمانؓ — علیؓ

زہے ذات جنت ہے معمار — گشتہ ایں خانہ خدا تیار

۱۳۰۵ھ

خواجہ عنبر کی مسجد کا کتبہ ۱۱۰۰ھ

در زمانِ بادشاہ دیں پناہ
شاہ عالم گیر غازی ذوالکرم
خواجہ عنبر ناظر شالیستہ خاں
مسجد نو ساخت چوں بیت الحرم
مظہر الحق سال تاریخ نباش
معدنِ فیض الٰہی زد رقم

۱۱۰۰ھ

حسن علی کا دار العدل ۱۱۴۲ھ

بندہ نواب فخر الدولہ ممدوح زماں
آنکہ در نامش حسن را با علی باشد قراں
ساخت دار العدل جائیکو بنا بر حب داد
در ہزار یکصد و حل دو شمر تاریخ آں

فصیح الدین بلخی کو تاریخ کتبات کو محفوظ رہنے کا برابر خیال رہتا تھا اگر انہیں کسی نادر اور تاریخی کتبات کے تلف ہونے کا گمان ہوتا تو اس کی حفاظت کے لئے حکومت کے منتظمین سے درخواست کرتے چنانچہ حسن علی کے دار العدل کا کتبہ انہیں پٹنہ سیٹی کے ایک تھانہ میں نظر آیا جو تھانہ کے احاطہ میں یوں ہی پڑا تھا، بلخی صاحب نے اس کی فوراً نقل حاصل کر کے حکومت بہار کے انسپکٹر جنرل آف پولس سے یہ درخواست کی کہ اس تاریخی کتبہ کو یا تو تھانہ کی عمارت میں لگا دیا جائے یا اس کو پٹنہ میوزیم میں رکھنے کے لئے بھیجدیا جائے، اس کی تفصیل بلخی صاحب نے اپنی کتاب آثار قدیمہ میں یوں لکھا ہے:

"یہ کتبہ سابق میں کسی مزدور نے لوح مزار سمجھ کر تھانہ کے صحن میں ایک قبر پر لگا دیا تھا کچھ مدت کے بعد اس قبر سے علٰحدہ ہو گیا تو کانسٹبلوں نے پورب جانب سائبان میں ڈال دیا اور راقم نے اس کو وہیں دیکھا تھا اور بذریعۂ خط انسپکٹر جنرل آف پولس سے درخواست کی کہ اس تاریخی کتبہ کو تھانہ کی عمارت میں لگا دیا جائے یا اس کو پٹنہ میوزیم میں رکھنے کے لئے بھیج دینا چاہئے۔ انسپکٹر جنرل نے راقم کی درخواست پر اس کتبہ کو بھی اول الذکر کتبہ کے پاس ہی تھانہ کی دیوار میں لگا دیا اور بذریعہ چٹھی مورخہ ۱۸ جون ۱۹۳۲ء راقم کو بھی مطلع کر دیا جس کے لئے راقم صاحب ممدوح کا بیحد ممنون ہوا۔"

ظریف الملک اشرف علی خاں فغاں کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۶ھ

هو الرب الرحیم

کوکہ خاں آں بہار باغ سخن	سوئے خلد بریں ز دنیا رفت
کرد مغموں چو فکر تاریخش	گفت ہاتف سرور دلہا رفت

۱۱۸۶ھ

نواب ہیبت جنگ کے مقبرے کے حالات بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

"پٹنہ سیٹی ریلوے اسٹیشن سے کوئی دو سو گز دکھن اور کسی قدر پچھم ایک بڑا احاطہ تقریباً
سو گز لانبا اور اس سے کچھ ہی کم چوڑا ہے۔ احاطہ کی شمالی دیوار میں ایک خوشنما مغلیہ طرز تعمیر کا
پھاٹک بنا ہوا ہے جس کے اوپر ایک بڑا گنبد اور دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں یہ
پھاٹک زمین سے ایک گز کی بلندی پر ہے۔ اندر سے دونوں جانب سیڑھیاں ہیں جن پر
چڑھ کر ایک چھوٹے کمرے میں پہنچ جاتے ہیں جن کے دونوں جانب جھروکے نما کھڑکیاں ہیں
جو غالباً نگرانی یا تیر و تفنگ چلانے کے خیال سے بنائی گئی تھیں، پھاٹک کے سامنے دکھن
میدان میں تیس فٹ مربع سنگین چبوترہ بنا ہوا ہے جو چار فٹ بلند ہے اس چبوترے کے
اوپر دس فٹ کا ایک اور چبوترہ ہے جس کے چاروں طرف نہایت نفیس، جالیدار ترشے ہوئے
پتھروں کا احاطہ ہے ہر لوح میں نئی وضع کی جالی ترشی ہوئی ہے جو پانچ فٹ اونچی اور گز بھر
چوڑی ہے، چاروں کونوں پر سات سات فٹ لانبے سیاہ پتھر کے ترشے ہوئے کلس دار
پائے ہیں، اسی احاطہ کے اندر سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کی بنی ہوئی قبر ہے جس کے
سرہانے ایک سنگین طاقچہ بنا ہوا ہے، یہی قبر نواب زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ
صوبہ دار بہار و عظیم آباد پٹنہ کی ہے جن کا مفصل حال کتاب ہٰذا کے حصہ اول میں مذکور ہو چکا
ہے، قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے ۱۷۵۰ء میں نواب سراج الدولہ کو نثار مہدی خاں چند رفقا کے ساتھ
ہے، قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ اس چبوترے سے دکھن اور پچھم اور بھی قبریں ہیں لیکن کتبہ کسی پر نہیں ہے۔
۱۷۵۰ء میں نواب سراج الدولہ کو نثار مہدی خاں چند رفقا کے ساتھ اسی جگہ سے گھوڑے پر سوار کر کے
قلعہ عظیم آباد پر قبضہ کرنے کو لے گئے تھے۔ قبر سے پچھم ایک خوشنما مسجد ہے جو پچاس فٹ لانبی اور بیس
فٹ چوڑی اس کے تین گنبد ہیں جو پچیس فٹ بلند ہیں اوپر سنگ موسیٰ کے کلس بیچ چڑھے ہوئے ہیں اور ان کے
علاوہ سنگ موسیٰ کی برجیاں بھی ہیں، صحن مسجد میں بیس فٹ لانبا اور پندرہ فٹ چوڑا ایک حوض بھی بنا ہوا ہے
پتھر میں جوف چھوڑ دیا ہے اور اس کے نیچے سنگ موسیٰ کی ایک بڑی لوح اس طور پر لگائی ہے
کہ حوض کا پانی اس لوح پر قدرتی جھرنے کی طرح بہتا رہے، اس لوح کو بھی نہایت صنعت

سے تراشا ہے تمام عمارت بے مرمت رہنے کی وجہ سے نہایت خراب حالت میں ہے۔

محمد حسن ولد غلام حسین (مؤلف سیر المتاخرین) کی قبر کا کتبہ ۱۱۹۸ھ

هو الله باقی والکل فانی

سید نوجواں بنام حسن | از جہاں رفت دامنش بردم
سیدالیش دل محبانش | خاصہ از بہر مادر و اب و عم
پئے سال عزائے او بگذاشت | بر زماں پدر غم صنم

۱۱۹۸ھ

بندہ از بندہ ہائے خدا محمد حسن ولد غلام حسین بن ہدایت علی خاں طباطبائی عفی اللہ عنہم در عنفوان جوانی عین بہار زندگانی کہ از مدت عمرش نوزدہ سال و دو ماہ و بست روز گذشتہ بود روز جمعہ شب بست و یکم ذی الحج چوں گل نو شگفتہ و پژمردہ در دل خود ارزد بابرد، اما بکمال صبر و شکیبائی کہ در شدائد بیماری ہرگز حرف شکایت بغیر از حمد خدا بر زبانش نرفت و بر دل والدین گذشت آنچہ گذشت، چنیں مصیبت کسے مباد و ایزد تعالیٰ رحمت کنار۔

رباعی

ناخوردہ بر از عمر جوانی رفتی | با صبر و شکیب و شادمانی رفتی
در بیت حزن پدر و ہجراں یعقوب | درماندہ و تواے یوسف ثانی رفتی

اس کے بعد اس کتاب آثار قدیمہ کا خاتمہ جھٹولی کی مسجد کے کتبہ پر ہوتا ہے۔ یہ مسجد ۱۳۱۰ھ کی بنی ہوئی ہے۔

جھٹولی کی مسجد ۱۳۱۰ھ

ہمت بر اہل مسکن ہوئی | دوسروں کو بھی ہوا اس کا خیال
بدھ کا دن تھا عین روز بقر عید | بعد تیرہ سو کے نو ہجری تھا سال
اہتمام شیخ اسد اللہ سے | پڑ گئی اس کی بنا بے قیل و قال

سن لکھو منشی شفاعت نے کہا مسجد اطہر بنی جب خوش جمال

میں نے یہ مصرعہ لکھا عبدالغفور

ہے یہ بیت اللہ اقصٰی کی مثال

۱۳۱۰ھ

بلخی صاحب مرحوم نے صوبہ بہار کے دیگر شہروں، قصبوں، مساجد اور قبور کے کتبات کافی جانفشانی کے بعد حاصل کئے تھے۔ ان میں قصبہ اورنگ آباد، داؤ دنگر اور سہسرام کا نام قابل ذکر ہے جہاں بیں کے بعد بلخی صاحب مرحوم کی ایک بیاض دستیاب ہوئی جس میں قصبہ اورنگ آباد، داؤدنگر اور سہسرام کے کتبات چند کاغذات پر مشتمل ہیں۔

(قصبہ اورنگ آباد کا حال)

عبدالواحد خاں تراہی کی مسجد کا کتبہ ۱۱۳۰ھ

یارب ایں خانۂ قوی بنیاد باد از آفت زماں خالی

سالش از ہاتف خرد جستم گفت رشد خوب مسجد عالی

۱۱۳۰ھ

قصبہ سہسرام کا حال

بلخی صاحب مرحوم نے سہسرام کے آثار قدیمہ کے کتبات کو کافی جانفشانی کے بعد حاصل کیا ہے، ان آثار قدیمہ میں عالمگیری مسجد، تاراچند دیوی کا مندر، حسن سور کا مقبرہ، حسن سور کے مقبرہ کی مسجد، شیر شاہ کا مقبرہ، عیدگاہ کے کتبے، سر مست خاں کا روضہ، علاول خاں کا روضہ اور صفدر جنگ کا قلعہ وغیرہ قابل ذکر ہے۔

(عیدگاہ کے کتبے)

اترجانب والا کتبہ

خان والا گہر مجاہد خاں ساخت مسجد بعہد شاہ جہاں

گشت تاریخ ایں سرائے سرور ہو بیت المقدس المعمور

۱۰۴۵ھ

درمیانی کتبہ

در ایام شاہ جہان عیدگاہ — مجاہد بنا ساختہ بر طریق
چو تاریخ وے خواستم از خرد — ندا داد ہاتف کہ بیت العتیق

۱۰۴۳ھ

دکھن جانب والا کتبہ

نادر العصر عیدگاہ شدہ — عیدگاہ ابد کرد مجاہد خاں

۱۰۴۴ھ — ۱۰۴۵ھ

چندن پہاڑی کے قریب مسجد ۱۰۲۲ھ

یہ مسجد جہانگیر کے عہد ۱۰۲۲ھ میں علی اکبر نے بنائی ۱۳۰۷ھ میں بعض مختاروں نے اس کی مرمت کرائی۔

مسجد کے کتبہ کی نقل

بدور شاہ نورالدین جہانگیر — زماں خاں سرور صفدر القاب
علی اکبر چہ مسجد بنا کرد — کہ تا لب تشنگاں گردند سیراب
چو تاریخش طلب کردم خرد گفت — ز بہر طاعت رزاق وہاب

امام باڑہ کا کتبہ ۱۱۹۱ھ نزد محلہ شیخ پورہ

بدور شاہ عالم شہر رمضاں — بنا شد مسجدے از فیض رحماں
برائے روشنی حضرت امامین — مکانے ساختہ دائم علی خاں
ہزار و صد نود یک بد ز ہجرت — کہ شد آراستہ ایں جائے رضواں

۱۱۹۱ھ

جاتی کے بازار میں ایک مسجد کا کتبہ

خانۂ حق چو ساخت تیغ علی — خواست تاریخ ایں ز ہاتف غیب
از برائے ثواب در کونین — مسجد خاص درگہ حسنین

۱۲۰۵ھ

جانی کے بازار میں امام باڑہ

چوں شیخ علی روضۂ اطہار ازبس | خوش کرد بنا بہر زیارت ہر کس
تاریخ بنا ہاتف غیبی فرمود | ایں بارگہہ خاص امام بیکس

۱۲۰۰ھ

مذکورہ بالا سطور میں میں نے اوپر یہ عرض کیا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نے قصبہ بہار شریف کے کتبات کافی تلاش و جستجو کے بعد حاصل کیا تھا' افسوس ہے کہ موصوف کے تحقیقی انکشافات اب تک منظر عام پر نہ آسکے' ہوسکتا ہے کہ بہت سے نادر کتبات موجودہ دور میں موجود نہ ہوں لیکن بلخی صاحب مرحوم کی قلمی بیاض میں آج تک محفوظ ہیں۔

قصبہ بہار شریف

عزالدین طغرل کا کتبہ ۶۴۰ھ

صوبہ بہار میں قدیم ترین اسلامی کتبات جو اب تک نظر سے گذرے ہیں ہیں' مخدوم شرف الدین احمد بہاری کے مزار کے اتر جانب جو احاطہ ہے اس کو حلقۂ دوم کہتے ہیں اور درمیانی دیوار میں جو در بنا ہوا ہے اس کو صندل دروازہ کہتے ہیں' اس حلقۂ دوم کے اندر جانب حضرت جمال اولیاء کا مزار اور حجرہ ہے اس کے پاس یہ کتبہ موجود تھا لیکن درگاہ کے مجاوروں نے احمقوں سے پیسہ کمانے کے لئے اس کتبہ کا نام کڑاہ رکھا اور تیل ڈال کر بھوت جلانے کا فریب ایجاد کیا ہے' اس کتبہ میں تین سطروں میں یہ عبارت کندہ ہے۔

سطر ۱ بناھٰذہ العمارۃ فی ایام المجلس العالی خان الاعظم خاقان

(اس جگہ لوح کا کنارہ ٹوٹ گیا ہے)

سطر ۲ عزالحق والدین عیار الاسلام والمسلمین معین الملوک والسلاطین ابی الفتح طغرل

سطر ۳ السلطان خلد اللہ ملکہٗ العبد مبارک الخازن یقبل اللہ منہ فی محرم اربعین وستمایہ

طغرل خاں ۶۲۹ھ سے ۶۴۲ھ تک بہار و بنگالے کا حکمراں تھا۔

سلیمان کرارانی کا کتبہ ۹۷۷ھ

در شرف جہاں قطب اقطاب | بہ ہند است قبلۂ حاجاتِ ارباب
برین در ہر کہ آید نیک یابد | ز حق حاجت کہ خواہد نیک یابد
ادیب خلوتش سید امین است | ازاں او خازن و بنیاد دین است
بعہد شاہ عادل مظہر نور | کہ ظلم و کفر گشت از ہیبتش دور
کجا اعلام عالی را برافراخت | شریعت مصطفےٰ معمور می ساخت
سلیمان جہاں ثانی سلیماں | جمال او کمال عدل و احساں
ز ہفتد ہفت ہفتاد دیں زماں بد | نبشت ایں درج حساں ابن داؤد

۹۷۷ھ

پہاڑ پورہ کی مسجد[1] کا کتبہ ۸۵۹ھ

بارک اللہ در زماں ناصر دنیا و دیں | شاہ محمود ابن ابراہیم شاہ راستیں
صفدر گیہاں پناہ مملکت صدر کرم | یافتہ توفیق خیر از فضل رب العالمیں
مسجد جامع بنا کرد انچناں کاندر جہاں | طاق و بنیاد آمدش تا ماہ و ماہی ہمنشیں
منبر و محرابش از فرط علوئے مرتبہ | یافت آں رونق کہ تحسین میکند روح الامیں
ایں ندا از عالم بالا ہمی آید فرود | ھٰذہٖ جنّٰتِ عدنٍ فادخلوھا خٰلدین
چارشنبہ بست و ہفتم از مہ ایام صیام | ہشصد و پنجاہ و نہ بود ست تاریخ سنین
در بنائے خیر او احمد ہمی خواہد بجاں | روح پاک شیخ شرف الحق والدین المعین

شاہ محمود ابن ابراہیم سے سلطان ابراہیم شرقی کا بیٹا اور جانشیں مراد ہے جس کی زمان حکومت ۸۴۰ھ سے ۸۶۲ھ تک تھی۔

---

[1] اس جگہ مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی خلیفہ و سجادہ نشیں حضرت مخدوم بہاری، ان کی اولاد اور سجادہ نشینوں کے مزارات ہیں۔

چھوٹی درگاہ کا کتبہ

حضرت مخدوم شرف الدین احمد کے مزار سے کوئی نصف میل پورب دکھن ایک احاطہ کے اندر مخدوم بدرالدین بدر عالم زاہدی کا مزار کھلے ہوئے صحن میں واقع ہے۔ اس جگہ کو لوگ چھوٹی درگاہ کہتے ہیں۔ اس احاطہ کے اندر ایک جانب فیروز تغلق کے عہد کا کتبہ ہے۔ اس نادر کتبہ کو مجاوروں نے احمقوں سے پیسہ حاصل کرنے کے لئے بھوت جلانے کا کڑاہ بنالیا ہے۔

فیروز شاہ کے عہد کا کتبہ ۷۸۱ھ

مجدد گشت ایں میموں عمارت	بعہد بادشاہ عدل پرور
شہنشاہ جہاں فیروز شہ آں	کز و آباد شد محراب و منبر
بسعیٔ التماس بندۂ خاص	بذیل خطہ اندر دور داور
ملک سیرت ملک کافی کفالت	نہیم نامور حد ہفت کشور
گذشتہ ہفصد از تاریخ ہجرت	فزودہ بود یک برہشت دیگر
ہمیشہ بادشہ بر تخت دولت	چو نام خویش فیروز و مظفر

درگاہ حضرت مخدوم احمد چرم پوش

اس درگاہ کے اندر تین نادر کتبات ہیں جن کی نقل تمنی صاحب مرحوم کی قلمی بیاض میں ملتی ہے۔ حضرت مخدوم احمد چرم پوش کے مزار کے پائیں حضرت شمس الدین بلخی کا مزار ہے جو حضرت مخدوم کے دوست، مرید اور خلیفہ تھے اور حضرت مولانا مظفر بلخی کے والد تھے۔ صوبہ بہار میں بلخی خاندان کے لوگ آپ ہی کی اولاد سے ہیں۔ مخدوم احمد چرم پوش کے مزار کے سرہانے ایک لوح پر کتبہ ہے جس کو مجاوروں نے کڑاہ بنا ڈالا ہے۔

۸۵۹ھ کا کتبہ

قال النبی علیہ السلام من بنی مسجد اللہ بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ

مسجد جامع بتوفیق خداوند الہ	وز طفیل مصطفیٰ صاحب تمکین و جاہ
شد بعہد دولت شاہ کہ صیت عدل او	مغرب و مشرق گرفت از پشت ماہی تا بماہ

آنکہ شاہ پور ابراہیم عادل .... سرفراز — آفتاب سلطنت شاہ جہاں محمود شاہ
ایں بنا کردہ بعہد حضرت صدر کریم — مقطع صوب بہار و دستگیر داد خواہ
اشرف الحق اکرم دارشد بفضل ایں چنیں — دولت آوارہ سرمداں ملی عالی پناہ
نزہت بیت المقدس حرمت بیت الحرام — مسجدے بنمود چوں بیت علو بارگاہ
ہندۂ فصل الثنیشہ لبسنہ ہفتم از صیام — ہشت صد پنجاہ و نہ تاریخ بودہ سال و ماہ

۸۵۹ھ

قناتی مسجد کا کتبہ ۸۰۷ھ

کاغذی محلہ بہار شریف میں حضرت احمد لبتانی کا مزار ایک گنبد کے اندر ہے مشہور ہے کہ انہوں نے حضرت مخدوم شرف الدین بہاری کو ابتدائی درس دیا تھا، گنبد سے متصل ایک قناتی مسجد کی دیوار میں ایک کتبہ پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

در عہد بادشاہ جہانگیر جم نشاں — برہان روزگار براہیم در جہاں
زکرد قطب احمد عارض بنا یقیں — تاریخ سال ہشت صد ہفت در بیاں

۸۰۷ھ

محلہ پیر پہاڑی کے کتبات

قصبہ بہار شریف میں پیر پہاڑی ایک نمایاں پہاڑی ہے اس پر متعدد قبریں ہیں جو احاطے کے اندر واقع ہیں، اس احاطہ میں ایک بلند گنبد کے اندر ملک ابراہیم (بیو) کا مزار ہے۔ گنبد کے شرقی دروازہ میں ایک کتبہ پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

کتبہ ۷۵۳ھ

ایں مقطع بہار ملک سیف دولت است — کز سہم تیغ او سپر انگندہ آفتاب
بت راہمی شکست چو ہم نام خویش را — در عالم بقاش شود بت شکن خطاب
صفدار صف شکن چو دارا ستے بحرب — رستم زتیب فنادے تہمتن شدے زتاب
خورشید اگر چہ لشکر سیارہ را شکست — آخر زکوہ ساخت سپر پردۂ حجاب

تاریخ آفتاب کہ یکشنبہ از جہاں   چوں لعل رفت در دل سنگ از برائے خراب

بود او ز معظم ذی الحجہ سیزدہ   وز سال بود ہفصد و پنجہ سہ در حساب

گنبد کے دکھن جانب کا کتبہ سنہ ۷۵۳ھ

دریں گنبد کہ ہست از روئے معنی   بقدر از گنبد افلاک برتر

نخفتہ شیر مردے کز بہ ہیبتش   نخفتے شیر اندر بطن شپّر

مدار الملک ابراہیم ابوبکر   کہ تیغ از بہر حق می زد چو حیدر

چنیں لشکر کشے لشکر کشائے   نخیزد دویم اندر ہفت کشور

کنوں چوں بر درت افتاد یارب   ز راہ لطف بکشائی بر و در

بمشک رحمت و کافور راحت   کنی دیوار خاکش را معطر

گنبد کے پورب جانب والا کتبہ

بعہد دولت شاہ جہانگیر   کہ باد او را بہار ملک نوروز

شہنشاہ جہاں فیروز سلطاں   کہ بر شاہان گیتی گشت فیروز

ملک سیرت ملک بیوہ براہیم   کہ بد در دین چوں ابراہیم کیں سوز

چو آمد سیزدہ تاریخ از ماہ   بماہ ذی الحجہ یکشنبہ از روز

ز ہجرت ہفصد و پنجہ سہ تاریخ   مسافر شد ملک در جنت ادبی روز

خداوندا بفضل خویش بر وے   کنی آسان حساب آخریں روز

ہلسا کی مسجد کا کتبہ

یا مالک الملک   لسانہ وقایلہ وکاتبہ

بدرگاہ ولی حق شاہ جمن   کہ او مرد ز مردان خدا بود

بدور شہ سلیم اکبر آں شاہ   کہ از حامی شرع مصطفےٰ بود

بنائے مسجد بنہاد مردے   کہ از جاں دوستدار مرتضیٰ بود

خرد پرسید کیں شخصے کہ بائیست   بگو نامش چہ تاریخ از کجا بود

زغیب آمد ندا، کاے خردمند — بگو تاریخ و نام او رضا بود

۱۰۱۳ھ

ر ض ا ب و د — سنہ الف ثلاثہ عشر — ہزار و سیزدہ
۲۰۰ ۸۰۰ ۱ ۲ ۶ ۴

شیخپورہ (ضلع مونگیر) حضرت مخدوم شعیب کے احاطہ کی مسجد سنہ ۱۲۶۵ھ کا کتبہ

مسجد کہنہ از زمانہ بود — از بشارت کریم گشت درست

سال تاریخ ایں چنیں ہاتف — از سر حق تطہیر کعبہ گفت

۱۲۶۵ھ

قطعہ سال وصال مخدوم شیخ پوری

عارف حق جناب شاہ شعیب — حیف خود را ز جسم خلق نہفت

سال وصلش زغیب پرسیدم — محرم حق ملی شعیب بگفت

شاہی مسجد قلعہ مونگیر کے اندر

مسجد ساختند دیں داراں — از اہتمام تمام ممنوں خاں

ختم سال آں ز روئے ہدیٰ — ہست سجدہ گہہ خدا طلباں

۵ + ۱۲۵۹ = ۱۲۶۴ھ

کتبہ مسجد محلہ بارہ منصور پور مونگیر سنہ ۱۰۸۰ھ

اللہ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

بفقیر حقیر اسیر محمد — کہ نامش بود عبدالخالق بعادت

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ سنہ ۱۰۸۰ھ

کہ پرداختہ مسجد خوش بنا — بنور ہمایوں و سال سعادت

ابوبکر و عمر عثمان و حیدر

خرد گفت تاریخ سالش بگویم | بنا کردہ مسجد ز بہر عبادت

کتبہ مسجد خانقاہ رحمانیہ واقع مخصوص پور

تنل هی مسجد اسس علی التقوٰی

صاحب چودھام خاں حق جو	ساختہ مسجد خوش دلجو
سال بھر روز زروئے دیں	گفت ہاتف بگوش دل بشنو
مسجد اسس علی التقوٰی	فاعبدو والسجدوا لوجہ اللہ

کتبہ کنواں جو قلعہ کے دکھن دروازہ سے کچھ فاصلہ پر باہر واقع ہے (مونگیر)

بعہد دولت مخصوص خاں	کہ بادا تا ابد او در لقائیش
بنا کردند سہ باغ چاہے	کہ چاہ باغ شد دلکش نہایش
ز ہجرت در ہزار و ہفتی سالی	مرتب شد بنائے دلربایش
دو چاہ و دو چاہ در صورت یکے بود	فزوں داں باغ را جائے بجایش
شدش تاریخ چاہ و باغ در دہر	فزوں آمد ز چاہ باغ بایش

۱۰۱۲ - ۵ = ۱۰۰۷ھ

مونگیر میں شاہ نافع کا مزار سنہ ۹۰۳ھ

قلعہ کے اندر حضرت شاہ نافع کا مزار واقع ہے کتبہ کی نقل یہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نصر من اللہ و فتح قریب و بشر المومنین بنا هو الگنبد فی عهد السلطان العادل

سید السادات مجمع السعادات علاؤ الدنیا والدین ابو المظفر حسین شاہ

خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ بانی خیر دانیال شاہ سنہ اثنی و تسعمایہ سنہ ۹۰۲ھ ۱۴۹۷ء

جہانگیر چمپانگر میں گنبد کا کتبہ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ابوبکر صدیق و عمر فاروق و عثمان غنی و علی کرم اللہ وجہ

چوں نصف العباد اللہ خواجہ احمد سمرقندی حسب الحکم نواب قدس القاب شاہزادہ عالمیان شاہزادہ پرویز جہانگیر بخدمت فوجداری سرکار مونگیر آمدہ بود بہ بنائے عمارت ایں روضہ منورہ توفیق یافت ۱۰۳۲ھ ہزاری و دو صاحب مزار کون تھے صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا عوام الناس اس کو مخدوم یا پیر کا مزار بتاتے ہیں نام نہیں جانتے۔

کتبہ مسجد موضع چراند ضلع سارن

چھپرہ سے کوئی تین کوس پورب چراند ایک قدیم بستی ہے جہاں پرانے قلعہ کے آثار پائے جاتے ہیں وہیں ایک قدیم مسجد ہے، مسجد کا کتبہ یہ ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بنی مسجد اللہ بنی اللہ لہ بیتا فی الجنہ مثلہ بنی ھذا المسجد الجامع السلطان المعظم والمکرم علاؤ الدنیا والدین ابو المظفر حسین شاہ السلطان بن سید اشرف الحسینی خلد اللہ ملکہ سلطنتہ فی سنتہ تسع وتسعمائۃ ۹۰۹ھ

اصل مسجد منہدم ہو گئی ہے اور اب اس کی بعض دیواریں شکستہ حال ہیں

مذکورہ بالا کتبات کی جو نقلیں پیش کی گئی ہیں ان سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نے یہ تاریخی کتبات کتنی جانفشانی اور سخت محنت کے بعد حاصل کئے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد اس طرح ہے:

کتبات، اطراف عظیم آباد مع قصبہ منیر و داناپور و پھلواری	۲۶۰
قصبہ اورنگ آباد	۴
〃 داؤد نگر	۲
〃 سہسرام	۲۳
〃 بہار شریف	۲۶

کتبات:		
	مونگیر	۶
	ہلسہ	۲
	بھاگلپور	۲
	ضلع سارن	۱
	قصبہ باڑھ	۱
		۳۳۷

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم نے لگ بھگ ساڑھے تین سو کتبات کی نقلیں جمع کی ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم کے وہ مضامین بھی کافی قابل قدر ہیں جن میں انہوں نے: چند نادر کتبات کی نقلیں شائع کی ہیں، بلخی صاحب مرحوم کا ایک تحقیقی مضمون مولوی شجاع الدین رسالہ صبح نو اپریل ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے مولوی شجاع الدین، ان کے والد حضرت یتیم اللہ اور ان کی بیگم گیتی آرا کے کتبات کی نقلیں شائع کی ہیں، ان کتبات کی تاریخی اہمیت نہایت ہی اہم ہے، گیتی آرا بیگم شاہ عالم بادشاہ کی نواسی تھیں اور مولوی شجاع الدین کے نکاح میں آئیں، مولوی شجاع الدین ان کے والد اور ان کی بیگم کے مزارات قصبہ چواڑہ ضلع مونگیر میں ہیں اور شیخپورہ سے جموئی جانے والی سڑک کے دکھن ایک احاطہ میں واقع ہیں، اب ان مزارات کے کتبات کی نقلیں پیش کی جاتی ہیں۔

مرزا وحید عصر فرید زمانہ مولانا یتیم اللہ علیہ الرحمۃ

هو اللہ الباقی

آنجناب از اولاد حضرت امام باقر از سادات ترمذ اند..... علمائے روزگار و اجلۂ کبار بود، در علم معقول و منقول بود در علم فقہ، حدیث، تفسیر، کلام، یگانۂ زمانہ بود، ولادت آنحضرت در سال یک ہزار و یک صد و پنجاہ ہجری است، اسی سال در تحصیل و تکمیل علوم ظاہری بدل ہمت نمودہ بہ تحقیق و تطبیق اختلافیات و اصول و فروع مذاہب وادیان گوئے سبقت از امثال و اقران بردہ بلکہ در کشف بعضے معلقات مسائل کہ بہ افکار حکمائے سلف نہ کشود بحکم فضلنا بعضکم علی البعض منفرد گردیدہ و یک چند بہ در خواہش بادشاہ وقت معطلات خدمت سلطانی... تقرب سلطان زمان ماند و بعدہ بہ تقاضائے

طبیعت اصلی بفیضان صحبت بعضے مقتدیان طریقت بہ اکتساب معارف عقب یقینیہ و علوم باطنیہ ترک و تجرید گزید و چہل سال بہ ریاضت و درس تفسیر و فقہ بسر برد و در سنہ ۱۲۲۱ھ انتقال نمود و ایں کتبہ و تعویذ را شجاع الدین علی ابن آنجناب در دار الخلافت شاہجہان آباد کہ عہدۂ حکومت عدالت آنجا با خدمت افتائے صدر داشت و در سنہ ۱۲۲۳ھ و در سنہ ۱۲۲۵ فصلی و در سنہ ۱۸۲۴ء و در سنہ ۱۸۷۸ء سمت مرتب گردانیدہ و ہم دریں سال محمد یحییٰ ولد آنحضرت کہ فاضل ذکی الطبع بصفات حمیدہ بود و خدمت عدالت غازی پور داشت وفات نمودہ بجوار مزار والد بزرگوار مدفون شد انا للہ و انا الیہ راجعون

(۲) مزار سراسر عبرت و اعتبار سید شجاع الدین علی خاں رضوی

اے زائر خاک مرقد من	ہشدار دریں راہِ خطرناک
دیروز بہ عزّ درس حکمت	می بود سرم باوج افلاک
امروز چنانکہ کس نداند	گمنام فتادہ ام تہ خاک
فردا تو شوی غبار چوں من	اماک ازیں گریوہ خاک

ایں آثار صورت آں ہیولی او نشان مولائے آں صورت است کہ در لسان ظہور آں را گاہ شجاع الدین علی گفتند و گاہے خاک تیرہ و گاہے معدوم و گاہے عالم و گاہے معلوم می خوانند گاہے بصورت انسان بہ حکیم و عالم مشہور و گاہے بخاک ظلمانی از چشم ظاہر مستور۔

اے از تو وجود جملہ موجود	از بود تو ہست ایں ہمہ بود
تا از تو جدا شدم فتادم	در کاہش رنج و محنت و غم
نامم شدہ گہ علی و گہ خاک	گہ زیر زمیں گہے بر افلاک
گہ عالم و گاہ گشتہ معلوم	موجود گہے و گاہے معدوم
اندر ظلمت خراب و خیرہ	ایں وہم تباہ و عقل تیرہ
جستیم ہر انجملہ ہستی	در ہر چہ بصنع نقش بستی
در علم طبیعی و الٰہی	معروف بدل شدم کما ہی
در مسئلہ وجوب امکاں	گردم بطریق فکر امکان

در بحث بقائے نفس انساں — بعد از عدم و خراب ابداں
در علم کلام و بحث ادیاں — در خوض باصل کفر و ایماں
مقصود تفکرم نہ بودی — سامان تحیرم تو بودی
کرم نظر بوسع امکاں — پائے نظرم بہ اوج کیواں
سی سال بہ فکر کوہ کندم — نکشود بجہد فکر بندم
ایں سو چو کشیدہ رہ ندیدم — از مدرسہ رخت بر کشیدم
در خدمت صوفیان آفاق — ارباب صفا و اہل اشراق
رفتم بہ نیاز و صدق ایقاں — مشغول شدم بہ کسب فیضاں
دیدم ہمہ راز خود برفتہ — بر وہم و خیال و فکر بستہ
در بند خیال و وہم خود مست — نقصان و کمال شاں آنست
بعد از نظر کمال تدقیق — باجملہ یقیں شدم بہ تحقیق
تا آنکہ تشخص من و اوست — بُعد است ہزار سال اندوست
نتواں بہ تخیلات امکاں — رفتن بہ حریم جان جاناں
چوں گشتہ چنیں سقیم انجام — در راہ فنائے خود روم گام
بگذاشتم ایں تشخص خویش — برداشتم ایں حجاب از پیش

تاریخ وفات ایں مرد بزرگ ١٢٢٧ھ ہجری است

فاعتبروا یا اولی الابصار

ایں مزار سراسر عبرت و اعتبار نواب گیتی آرا بیگم بنت نواب زینت النسا بیگم بنت شاہ عالم بادشاہ ہندوستان کہ در قلعہ سرخ پیدا و پرورش یافتہ و بسبب نکاح با سید شجاع الدین علی خاں بہادر رضوی دریں خاندان مدفون گردیدہ و تاریخ سال انتقال از مصرع آخر قطعہ بعبارت ظاہر بحساب ابجد بر می آید۔

قطعہ

گیتی آرا بیگم شہزادی عالی نسب — چوں ازیں عالم بسوئے خلد اعلیٰ می رود
سال تاریخش چو از دل جستم وہاتف بگفت — یک ہزار و دو صد و پنجاہ و شش ہجری برد

۱۲۵۶ ہجری

بلخی صاحب مرحوم کا ایک اہم تاریخی و تحقیقی مضمون قلعہ رہتاس کی سرگذشت. رسالہ معاصر پٹنہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں بھی بلخی صاحب مرحوم نے اسلامی عہد کے کتبات کی نقلیں پیش کی ہیں چنانچہ مثال کے طور پر ایک کتبہ کی نقل پیش کی جاتی ہے۔

ساقی خاں کا مقبرہ ۹۸۶ھ

فغاں از گردش چرخ ستمگر — کہ نبود با کس اورا مہربانی
خلف ساقی سلطاں راست دل — کہ گردمعتبر باسم فانی
قضا را آنچناں رنجور گردید — کہ از صحت نبود اورا نشانی
بر او پیک اجل آمد بگفتا — سفر کن در ازیں دنیائے خانی
سفر کرد او ازیں عالم بیکدم — ایں بابد کردگار لامکانی
بجستم از خرد تاریخ فوتش — بگفتا در بہشت جاودانی

۹۸۶ھ

بلخی صاحب کا ایک اہم تحقیقی مضمون "امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں" رسالہ "صبح نو" مئی ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبروں کے کتبات کی نقلیں شائع کی تھیں۔

قطعہ تاریخ رحلت مفتی امیر مینائی لکھنوی

امیر کشور معنی امیر مینائی — خدا کے عاشق صادق نبیؐ کے فقیر
گئے جو خلد بریں تو ان کی تربت پر — جلیلؔ نے یہ لکھا روضۂ جناب امیر

۱۳۱۸ھ

داغ دہلوی کی قبر کے کتبہ کی نقل

رفت از دہر چوں فصیح الملک | لرزہ افتاد در تمامی ہند
اوستاد نظام آصف جاہ | مورد لطف شاہ حامی ہند
راست بر قامتش قبائے سخن | زیبد وے خطاب جامی ہند
سلک نظمش لساں سلک گہر | جوہری سخن نظامی ہند
شد وفاتش بشام یوم الحج | دفن شد روز عید سامی ہند
آہ از دل کشید سائل گفت | مدفن پاک داغ نامی ہند

۱۳۲۲ ھ

بلخی صاحب مرحوم نے کافی تلاش و جستجو کے بعد کتبات کی نقلیں حاصل کیں۔ موصوف جہاں کہیں بھی تشریف لے جاتے وہاں کی تاریخی عمارات کا ضرور معائنہ کرتے چنانچہ اگر انہیں کوئی نادر تاریخی عمارات کا کتبہ نظر آتا تو وہ اس کا چربہ لے کر ضرور اس کی نقل حاصل کر لیتے۔ یوں تو صوبہ بہار میں کئی ایسے محقق ہیں جو ہندوستان گیر شہرت کے حامل ہیں لیکن آج تک کسی محقق نے بھی عصری تحقیقات کا انکشاف نہیں کیا چنانچہ بلخی صاحب مرحوم صوبہ بہار کے واحد محقق ہیں جنہوں نے عصری تحقیقات کا انکشاف کیا اور یہ خوبی بلخی صاحب مرحوم کی ذات ہی تک محدود ہو کر رہ گئی۔

پٹنہ یونیورسیٹی اور بلخی صاحب مرحوم

بلخی صاحب مرحوم اپنی ملازمت سرائے کیلا اسٹیٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن عظیم آباد تشریف لائے سید حسن عسکری اور ڈاکٹر کے۔ کے دتا کی سعی سے ان کی بحالی بحیثیت ناظم شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسیٹی میں ہوئی چنانچہ اس شعبہ میں بلخی صاحب مرحوم کے بہ حیثیت محقق کیا کارنامے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اس کا جائزہ جناب ڈاکٹر خواجہ افضل امام کے مضمون سے پٹنہ یونیورسیٹی ریسرچ جرنل سے لیا جاتا ہے۔ پٹنہ یونیورسیٹی کے سابق ناظم شعبہ مخطوطات جناب ڈاکٹر خواجہ افضل امام بلخی صاحب کے تحقیقی کارناموں کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں:

"عظیم آباد کے جن لوگوں نے ہندوستان اور بالخصوص صوبہ بہار کی تاریخ

اور ادب پر گہری نظر رکھی ہے ان میں پروفیسر عسکری، ڈاکٹر کے۔ کے دتا اور فصیح الدین بلخی مرحوم قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر حضرات کا سروکار پٹنہ یونیورسٹی سے تھا مگر بلخی صاحب مرحوم سرائے کیلا اسٹیٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد وطن واپس آئے لہٰذا انہی حضرات نے بلخی صاحب کو پٹنہ یونیورسٹی سے منسلک کرنے کی صورت نکالی، یہ زمانہ ۴۷-۱۹۴۶ء کا تھا، ہندوستان کے نقشہ پر خط نسخ کھینچا جا رہا تھا لوگ ایک نئے ملک کے قیام کے لئے کوشاں تھے۔ پٹنہ کے چند اہل علم ایک علمی مرکز کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے جو آج شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے دو سکشن ہوئے، ایک فارسی عربی اردو اور دوسرا ہندی سنسکرت اور میتھلی۔ آخر الذکر کا تعلق شاستری جی سے رہا جو بہار ریسرچ سوسائیٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد اس سے منسلک کردیئے گئے تھے مگر شعبہ کی تمام ذمہ داریاں انہی کے سر تھیں اور وہ ناظم شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسیٹی سمجھے جاتے تھے۔

ممدوح کو مخطوطات سے کیسا شغف تھا صرف وہی حضرات بیان کر سکتے ہیں جنہوں نے انہیں بر سر کار دیکھا ہے۔

"کرسی بغرض روشنی کھڑکی کے قریب کرلی گئی ہے، ہاتھ میں ایک بڑا انگیین خائن شیشہ ہے آنکھ شیشہ سے لگی ہوئی ہے اور شیشہ کتاب سے، یقین جانئے آنکھ شیشہ اور کتاب کے درمیان کوئی خاص فصل نہیں ہے، اس عالم انہماک میں اگر کوئی صاحب ذوق تشریف لائے تو خیر علمی گفتگو شروع ہوئی ورنہ صرف ایک سگریٹ دے کر انہیں واپس کردیا۔

بلخی صاحب مرحوم کی پٹنہ یونیورسیٹی میں بہ حیثیت ناظم شعبہ مخطوطات کیا ذمہ داریاں تھیں اس کے متعلق ڈاکٹر خواجہ افضل امام صاحب اپنے مقالہ میں یوں لکھتے ہیں۔

" ان کی ذمہ داریاں مختلف تھیں، ریسرچ اسکالر کی ہر ممکن معاونت، مخطوطات

کی فراہمی، ان کی فہرست کا کیٹلاگ تیار کرنا، کسی نادر نسخہ کی طباعت، برٹش میوزیم انڈیا آفس کے کسی نسخہ کی حاصل کردگی وغیرہ وغیرہ سکشن کے قیام کے بعد تقریباً جتنے لوگوں نے پٹنہ یونیورسیٹی سے اُردو، فارسی یا تاریخ میں ریسرچ ڈگریاں حاصل کی ہیں وہ بلاشبہ بلخی صاحب کے مرہون منت ہیں، خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے اپنا مقالہ ان کی زندگی میں تیار کرالیا جو بچ گئے وہ ابتک یوسف بے کارواں بنے پھر رہے ہیں، مرحوم کا تعلق جتنا اردو فارسی عربی سے تھا اس سے کسی طرح کم تاریخ سے نہ تھا، "تاریخ مگدھ" آج بھی کالجوں میں رائج ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے طلبہ بھی اس خانقاہ سے فیضیاب ہوتے تھے، ہمارے اس دعوی کی تصدیق ڈاکٹر قیام الدین، ہر نندن پرشاد اور لکشمی کانت چودھری کر سکتے ہیں۔

اس شعبہ سے ان کی وابستگی ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۹ء تک رہی جس میں انہوں نے ساڑھے چودہ سو مخطوطات، فرامین، اسناد وغیرہ جمع کرلئے، کتابوں کا معتدبہ حصہ حیدرآباد سے آیا جہاں بلخی صاحب اور پروفیسر عسکری سید عبدالرحیم صاحب مدظلہ کے مہمان رہے۔ کتابوں کی تلاش اپنے صوبہ کے کسی شہر میں نہ لے گئی، کونسا خانوادہ تھا جہاں اس کی فکر اور جستجو میں سرگرداں نہ پھرے اور حتی الوسع کامیاب نہ لوٹے یہاں تک کہ بعض اسکولوں سے قلمی کتابیں لے کر وہاں مطبوعہ کتابیں بھجوادیں جیسے کہ محمڈن اسکول پٹنہ سیٹی وغیرہ۔

ڈاکٹر خاجہ فضل امام نے اپنے مضمون "فصیح الدین بلخی مرحوم اور پٹنہ یونیورسیٹی" میں بلخی صاحب کی جمع کردہ فارسی اور اردو کتابوں کی فہرست پیش کی ہے جو سطور ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

	عربی	فارسی	اردو
تاریخ	—	۶۰	۴
تذکرہ	۱۲	۵۷	۵

	عربی	فارسی	اردو
سفرنامہ	۱	۵	۱۰
جغرافیہ	—	۳	—
انشاء	—	۱۸	
دواوین	۱	۵۹	۱۸
منظومات	۱	۱۰۱	۹۲
ادبیات	۱۱	۱۱۲	—
قواعد	۱	۴۳	—
فن فصاحت وغیرہ	۶	۴۰	--
لغت وغیرہ	۳	۲۶	—
تصوف	۴	۱۰۱	-
حساب	۴	۲۸	-
منطق	۸	—	-
ہندسہ	۱	۶	-
فقہ و مذہب	۶۱	۸۷	۳۷
متفرقات	۲۱	۱۱۰	-
نقل خرابین داستان	-	۲۴۰	-
کیمیا	۲	-	

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم نے اپنی پٹنہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران لگ بھگ ساڑھے چودہ سو کتابیں جمع کیں ، راقم نے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات کے موجودہ ناظم ڈاکٹر حسن امام سے ملاقات کی انہوں نے راقم کو بتایا کہ بلخی صاحب مرحوم نے اپنی ملازمت کے دوران

۲۲ اگست ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۸ ستمبر ۱۹۶۰ء تک لگ بھگ ساڑھے چودہ سو عربی، فارسی اور اردو کی مخطوطہ و مطبوعہ کتابیں جمع کیں چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کی اس شعبہ سے سبکدوشی کے بعد اس شعبہ کے کام میں مزید سست رفتاری آ گئی یعنی ۱۵ ستمبر ۱۹۷۸ء تک اس شعبہ میں لگ بھگ ساڑھے تیئس سو کتابیں جمع ہوئی ہیں جیسا کہ اس شعبہ کے کیٹلاگ کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے یعنی اس طویل مدت کے دوران صرف ساڑھے نو سو کتابوں کو پٹنہ یونیورسیٹی کے ناظموں نے جمع کیں یہ طویل عرصہ لگ بھگ اٹھارہ (۱۸) سال کا ہوتا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم تحقیقی کاموں کے سلسلے میں چھپے ہوئے خزانوں کو حاصل کرنے کے لئے بقول شیخ سعدی "بسیار سفر باید" کے قائل تھے، ہندوستان کی شاید کوئی بھی لائبریری ان کی نظر سے بچ گئی ہو جہاں بلخی صاحب تشریف نہ لے گئے ہوں گے، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) رام پور کی لائبریری، کلکتہ کی مشہور و معروف امپیریل لائبریری، علی گڑھ، دہلی، بمبئی، مرشد آباد، غرضکہ جگہ جگہ بلخی صاحب مرحوم تشریف لے گئے۔ صوبہ بہار میں دسنہ کا کتب خانہ، گیا شہر میں منولال کی لائبریری، بہار شریف، استھانواں، مظفر پور، بھاگلپور، دربھنگہ، پورنیہ، چمپارن، مونگیر وغیرہ جگہوں کی خانقاہوں، صوبہ بہار کے اندر خانقاہ عمادیہ پٹنہ سیٹی، حضرت رکن الدین عشق کا تکیہ، میتن گھاٹ، پھلواری شریف، مونگیر، بھاگلپور، منیر شریف وغیرہ خانقاہوں کی بھی سیر کی۔ صوبہ بہار کے نوابوں، رئیسوں اور اہل علم حضرات سے گذارش کر کے وہ چھپے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈتے تھے۔

بلخی صاحب مرحوم تحقیق و جستجو کے سلسلہ میں جب بھی سفر میں روانہ ہوتے تھے تو ان کے ساتھ پٹنہ یونیورسیٹی سے تعلق رکھنے والے ہم مشرب اور ریسرچ اسکالر بھی ہوتے تھے، عسکری صاحب بار بار بلخی صاحب مرحوم کے ساتھ سفر میں شریک رہے، کئی مرتبہ ڈاکٹر کے۔ کے۔ دتا صوبہ سے باہر ان کے ساتھ رہے۔ ریسرچ اسکالروں میں ڈاکٹر جٹا شنکر جھا، ڈاکٹر قیام الدین احمد اور جے دیو مصرا بھی ان سے قریب رہے۔

اس نوعیت کے دور دراز کے سفر سے بلخی صاحب اپنے وطن واپس آتے تھے تو ان کے

ساتھ بوروں میں بھرے ہوئے کاغذات لوہے کے ٹرنک میں بھرے ہوئے مخطوطات وقلمی کتابیں
اور پرانی مطبوعہ کتابیں ہوتی تھیں۔ وہ صوبہ بہار سے باہر یا صوبہ کے اندر ہی اس کام کے لئے جاتے تو
ان کی نگاہ صرف وہاں کے کتب خانوں پر نہیں ہوتی، شہر میں گھوم گھوم کر لوگوں سے اپنے مطلب کی
چیزوں کو حاصل کرتے تھے۔ پتہ ملنے پر اس شخص کے گھر پر فوراً حاضر ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ
شہر کے مشہور کباڑی کے لگائے ہوئے ڈھیروں میں گھس جاتے تھے اس عمل میں ان کا ہاتھ پاؤں
اور کپڑا گندہ ہو جاتا تھا کبھی ایسا ہوتا کہ داموں پر ان ساری چیزوں کو خرید لیتے اور بوروں میں
بھر کر ان چیزوں کو گھر لاتے اس کے بعد کام کی چیزیں برآمد کر لیتے اس کے بعد اپنے سعنہ کی
رپورٹ [illegible] میں درج کر دیتے، اس نوعیت کی رپورٹ کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ترجمہ [illegible] جرنل ۱۹۴۹ء جلد چہارم

[illegible] نے [illegible] ریسرچ سوسائٹی نے دو محقق پنڈت وشنو لال شاستری اور جناب
[illegible] دونوں حضرات نے تحقیق و جستجو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تاریخی اہمیت رکھنے
[illegible] صوبہ بہار کے مختلف حصوں میں گھوم گھوم کر اس کارہائے رفتہ کی چھان بین شروع کی۔
جناب [illegible] کی چھان بین کا نتیجہ [illegible] ملاحظہ ہو
[illegible] میں ہوئی۔ ریسرچ اسکالر کی حیثیت
سے تو جناب [illegible] نے اپنا کام شروع کر دیا اور زندگی کے مختلف خیال سے تعلق رکھنے والے
لوگوں سے [illegible] خبر ملی کہ محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی کی لائبریری میں کافی ایسے
ذخیرے ہیں [illegible] اسکول کے اراکین سے اجازت لے کر ان چیزوں کا معائنہ کیا تو
پایا کہ [illegible] کی حیثیت مخطوطات کی تھی، جس پہلی کتاب
پر ان کا [illegible] جامی کی مثنوی یوسف زلیخا کا قلمی نسخہ تھا، اس جانچ پر یہ اندازہ ہوا کہ اس مخطوطہ
[illegible] سے تعلق [illegible]
[illegible] نواب شجاع الدین خاں [illegible]
ساری کتابوں کو [illegible]

کارآمد تاریخی اور ادبی قدروں کی حامل تھیں۔ بلخی صاحب نے اسکول کی مجلس انتظامیہ سے کہا کہ ان کتابوں کی حفاظت ہونی چاہیئے جو اسکول میں ممکن نہیں لہٰذا پٹنہ یونیورسیٹی کو یہ کتابیں دی جائیں اور اس کے عوض طلبا کے لئے کارآمد موجودہ علم کی کتابیں حاصل کرلینی چاہیئے، فہرست نیچے ملاحظہ ہو۔

(۱) یوسف زلیخا (قلمی) سوہداد نادر شاہ راجہ جگل کیشور بہ شجاع الدین خاں نوشتہ بود۔ (۲) جہانگیر نامہ (قلمی) (۳) مکاتیب غلام ابوصمد افضل محمد کا طبع کیا ہوا (۴) مثنوی کلام (۵) شاہ عالم نامہ (شاہ عالم اول کی گدی نشینی سے لے کر وفات تک کی تاریخ (۶) مہابھارت (فارسی زبان میں مہابھارت کا ترجمہ) (۷) عجائب الابدان شیخ عذاری کی عربی نظموں کا فارسی نثر میں ترجمہ صفحہ چار کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی نقل شہنشاہ فرخ سیر کے عہد میں ہوئی اور اس کا مترجم حسن الحسینی نام کا کوئی شخص تھا (۸) ظفر نامہ تیموری تیمور کی فتوحات کا حال اس میں دلی اور میرٹھ کی فتوحات کا حال درج ہے پوری جلد میں لگ بھگ ایک ہزار صفحات ہیں (۹) ظفر نامہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظفر نامہ کی تلخیص ہے (۱۰) فوائد صوفیہ۔ فارس کے صوفی خاندان کی تاریخ۔ اس میں لگ بھگ تین سو برس کے حالات درج ہیں۔ اس مخطوطہ کی نقل ۱۲۱۱ھ میں ہوئی (۱۱) مجموعہ دیوان وقصائد فرحت (اٹھارھویں صدی کا ایک مشہور اردو شاعر۔ اس قلمی نسخہ پر ۸ر دسمبر ۱۷۹۲ء کی تاریخ درج ہے (۱۳) دیوان فدوی۔ یہ ایک نایاب قلمی نسخہ ہے (۱۴) دیوان سلطان جان اردو کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ان کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صوبہ بہار میں غدر ۱۸۵۷ء سے ان کا تعلق تھا (۱۵) دیوان منشا مرنا۔ احمد منشا اپنے وقت کے مشہور اردو شاعر تھے اور اب ان کا کلام نایاب ہے (۱۶) شرح شیخ بوعلی (چھ سو برس) سے زائد قدیم قلمی نسخہ جس کی نقل ۷۵۴ھ میں ہوئی، شیخ بوعلی کا شمار فلسفی اور طبیب میں ہے (۱۷) بیتال پچیسی۔ ہندی میں قصہ کہانی کی مشہور کتاب کا فارسی ترجمہ (۱۸) طوطا کہانی شاہ جہاں آباد (دلی) کے حیدر بخش کی تصنیف (۱۹) مراۃ الخیال ایک نایاب قلمی نسخہ جس کی نقل ۱۲۲۹ھ میں ہوئی اس میں چار سو چون (۴۵۴) صفحات ہیں۔ یہ کتاب موسیقی اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے (۲۰) لطائف الطوائف فارسی یہ مخطوطہ اب نایاب ہے (۲۱) تحفۃ السالکین۔ صوفیوں اور فقیروں کی سوانح پر

رد شیعی جس کی نقل ۱۱۱۲ھ میں ہوئی (۲۲) معجزات مرتضویہ پیغمبر اسلام کے جانشینوں کے معجزوں کا حال جس کے بارے میں یقین کیا جاسکتا ہے کہ نایاب ہے (۲۳) مجمع الصنائع فارسی میں ملمع سازی کے طریقہ پر ایک قلمی نسخہ یہ کتاب نظام الدین احمد بن صالح الحسینی کی لکھی ہوئی ہے (۲۴) رسالہ صرف و نحو ترکی فارسی قزلباش اور رومی زبان لکھی ہوئی مگر خستہ حالت میں ہے لیکن مفید اور نایاب ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں بلخی صاحب مرحوم نے گیا اور بھاگلپور کا بھی دورہ کیا اور کئی ایسے اشخاص سے بھی ملاقاتیں کیں جن کے پاس قلمی نسخے یا مخطوطے تھے اورنگ آباد سب ڈویژن میں انہیں معلوم ہوا کہ اورنگ زیب کے پہلے گورنر برائے صوبہ بہار نواب داؤد خاں کے خاندان والوں کے پاس کچھ نہایت ہی اہم فرامین ہیں، بلخی صاحب مرحوم ان فرامین کی نقل لینے کامیاب ہو گئے، یہ فرامین مختلف ادوار سے تعلق رکھتے تھے جن کی مجموعی تعداد آٹھ تھی، اورنگ آباد سے گیارہ میل پچھم کی طرف سری سا نام کی جگہ میں ایک کتبہ ۱۰۷۰ھ کی نقل انہوں نے حاصل کی، یہ کتبہ درمیان دروازہ کی مسجد میں لگے ہوئے ایک پتھر پر ہے اور کہا جاتا ہے کہ نواب قمر خاں کی عملداری کے زمانہ میں اس کی تعمیر ہوئی تھی، بلخی صاحب مرحوم نے یہ دریافت کیا کہ ۱۰۷۰ھ سے تعلق رکھنے والا یہ کون حاکم تھا، بلخی صاحب مرحوم نے کئی لوگوں سے ملاقات کی اور یہ پتہ چلا کہ قلمی نسخے بدقسمتی سے سب ضائع ہو گئے، رجولی کے ایک شاہ صاحب کے پاس یہ موجود تھے جو کوڈرما گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا، مہینہ کے آخر تک بلخی صاحب مرحوم رہے، کئی لوگوں سے ملاقات کی شاہ محمد خالق نامی ایک شخص کے یہاں کچھ دنوں تک رہے لیکن کوئی فرمان یا مخطوطہ نہیں ملا، شاہ صاحب نے کچھ تحریریں ان صوفیوں کی دکھلائیں جن کے خاندان سے وہ تھے۔

درگاہ شہباز صاحب میں انہوں نے ایک کتبہ دیکھا جو بنگالہ کے حسین شاہ سے تعلق رکھتا تھا اور ۱۲ رجب ۹۰۰ھ کا تھا، یہ کتبہ درگاہ کے باہری دروازہ کی دہلیز پر ہے اس کے پڑھنے کے لئے ایک سیڑھی کی ضرورت پڑی اور مزدوروں سے کتبہ کی صفائی کرائی، یہ درگاہ سلاچک میں ہے، بھاگلپور میں بلخی صاحب نے چند شاہی فرامین دیکھے۔ یہ فرامین محلہ خلیفہ باغ

کے جناب سید شاہ فخر عالم کے پاس تھے۔ سب سے پرانا صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والا فرمان
شہنشاہ اکبر کے وقت کا تھا اس پر خان جہاں حسین قلی خاں کی مہر لگی ہوئی تھی جس نے بہار
اور بنگال کے خودسر بادشاہ داؤد قریشی کو قتل کیا تھا۔ فرمان پر تاریخ ۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء ڈالی گئی
ہے، دوسرے فرمان پر اورنگ زیب کے بیٹے اعظم شاہ کی مہر ہے، ایک دوم مہر ہے پر دو سو بیگھہ
زمین بطور امداد معاش سید امان اللہ عرف پیر دھڑیا کو دیے جانے کا حکم ہے۔ اس پر ۱۰۹۲ھ
کی تاریخ ہے جو اورنگ زیب کی حکومت کا چوبیسواں برس تھا۔ تیسرا فرمان محمد شاہ کے وقت
کا ہے۔ اس پر مہر عسکر خاں کی ہے ۱۱۳۱ھ کا یہ فرمان ہے۔ اس سنہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
ایک سید سلطان احمد نامی شخص نے فریاد کی تھی کہ دس برس کے اندر بارہ سو نوے (۱۲۹۰) روپیوں کی
مالگذاری کو بڑھا کر آٹھ ہزار (۸۰۰۰) کر دیا گیا ہے چنانچہ اسے گھٹا کر بیالیس سو پچاس روپے کر دیے
گئے۔

ستمبر کے مہینہ میں بلخی صاحب نے آرہ سہسرام کا دورہ کر کے محمد سید اظہار الحسن آروی سے
ملاقات کی جنہوں نے ایک بہت پرانا مخطوطہ دکھایا۔ خستہ حالت میں یہ ایک ضخیم جلد تھی۔ شروع
اور آخر میں بہت ساری نظمیں اور کہانیاں تھیں، مخطوطہ کی مکمل چھان بین کے بعد یہ معلوم ہوا کہ بیچ کے
حصہ میں نظام الملک کا شہنشاہ محمد شاہ کے نام ایک خط تھا اور ساتھ ساتھ صوبہ داری بنگال کی
تقرری کا پروانہ ملازمت بھی تھا۔ کچھ حصے ضائع ہو چکے تھے ان پر سادہ کاغذات لگا دیے گئے تھے
یہ ۱۱۳۰ھ کا ہے اس کی نقل مالک کی اجازت لے کر حاصل کر لی گئی ہے۔

سہسرام میں بلخی صاحب مرحوم نے مولانا حکیم فخر الحسن صاحب کے پاس ایک قلمی
دیوان پنڈت چندر بھان برہمن کا دیکھا یہ دیوان نامکمل تھا۔ اس لئے کہ ردیف ذ تک کی
غزلیں اس میں تھیں اور ردیف 'ی' تک یہ دیوان نامکمل تھا، چندر بھان شاہ جہاں کے دربار میں
معتمد تھا اور اس کا کام شاہی فرامین اور مسودوں کو جانچنا اور درست کرنا تھا، بلخی صاحب نے
مخطوطات کے اوراق پریشاں بھی دیکھے اور انہیں درست کرنے پر انھوں نے شاہ جہاں کے بیٹوں
میں گدی کے لئے خانہ جنگی کی تاریخ مرتب کی، بدقسمتی سے شروع کے سترہ صفحات غائب تھے۔

ان چیزوں کے مالک نے گمشدہ اوراق کو تلاش کر کے دکھلانے کا وعدہ کیا۔

دوسرے مخطوطات میں چھ سو برس سے پرانا مشکوٰۃ شریف کا ایک قلمی نسخہ ملا۔ عربی میں منطق پر بروائی کا ۱۰۳۳ھ کا مرتب کردہ نسخہ تھا یہ نسخہ اس اعتبار سے کام کا تھا کہ مشہور مصور شیخ عنایت اللہ کی بنائی ہوئی ۸۵ تصویریں تھیں، مغل آرٹ کے یہ اچھے نمونے تھے۔ اس کتاب کے مالک سید حبیب اللہ معرفت سید مبارک حسین ساکن پاٹی گلی پٹنہ سیٹی تھے۔ اس کے دوسرے صفحہ پر مصور عنایت اللہ لکھتا ہے کہ ۱۰۸۱ھ سنہ ۱۶۷۱ء میں فن مصوری شروع کیا، آخری ورق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۴۸ برسوں میں اس نے اس کام کو ختم کیا، اکتوبر ۱۹۲۷ء میں بلجی صاحب اسلام پور ضلع پٹنہ لکھمیاں ضلع مونگیر اور داؤدنگر ضلع گیا تشریف لے گئے۔ لکھمیاں اور باری سلیبا میں ذاتی کتب خانوں کو دیکھنے کا موقع ملا، پہلی جگہ انہیں مکاتیب علامی ابوالفضل اور وقائع نعمت خاں اورنگ زیب کی تین برسوں کی دکنی مہم اور حکومت کا حال معیار ایک نہایت ہی وقیع مخطوطہ قرآن حکیم کا چھ سو برسوں کا پرانا ملا یہ مخطوطے پروفیسر کلیم الرحمٰن مرحوم کے کتب خانے میں ملے۔

اکتوبر کے آخری ہفتہ میں وہ گیا تشریف لے گئے۔ وہاں سے انہوں نے آٹھ قیمتی فرامین کی نقلیں حاصل کیں جو داؤدنگر کے نواب داؤد خاں کے وارث محمد صادق خاں کے پاس تھے، ان میں سے ایک فرمان ۱۰۶۷ھ کا شاہزادہ داراشکوہ کا تھا دوسرا فرمان ۱۰۶۹ھ کا اورنگ زیب کا تھا، اورنگ زیب کی اڑتالیس برس کی حکومت کی نشاندہی کرتا تھا، چوتھا فرمان ۱۱۲۵ھ کا فرخ سیر کا تھا، پانچواں ۱۱۳۱ھ کا محمد شاہ کا تھا چھٹا بھی ۱۱۵۳ کا محمد شاہ کا تھا، ساتواں ۱۱۷۲ھ شاہ عالم ثانی کا تھا۔

نومبر کے اواخر میں بلجی صاحب نے آرہ اور گیا کا دورہ کیا، یہ دورہ زیادہ امید افزا نہیں ثابت ہوا لیکن شاہ اظہار کے بھائی شاہ شرف الدین نے پٹنہ میں کچھ پرانے کاغذات دکھانے کا بالکل وعدہ کیا۔

دسمبر کے مہینہ میں بلجی صاحب مرحوم نے کھجبورہ، چوارہ، امرتھا اور جموئی یعنی مونگیر ضلع کا دورہ کیا، حسین آباد کے نواب کے ذاتی کتب خانہ کی اجازت سید صابر حسین سے حاصل کی،

شیخپورہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر انہوں نے شاہ عالم کی نواسی گیتی آرہ کا مقبرہ دیکھا، اس قبر کے کتبہ کو پڑھا شاہ یتیم اللہ اور اس کے شوہر شجاع الدین رضوی کی قبر بھی دیکھی، تینوں کتبوں پر ۱۲۲۲ھ ۱۲۳۷ھ اور ۱۲۵۶ھ کی تاریخ ہے۔ وہاں بلخی صاحب نے ایک خاص کتب خانہ بھی دیکھا لیکن کوئی خاص کام کا مواد دستیاب نہیں ہوا، ایک طالب علم محمد علی احمد کی مدد سے انہوں نے اورنگ زیب کے عہد کے ایک فرمان کی نقل حاصل کی جس پر امین خاں بیگ بہادر کی مہر تھی، موضع امرتھ میں انہوں نے شاہ سید احمد غازی کی درگاہ بھی دیکھی، سید عبدالمجیب ایک پنشن یافتہ پولس افسر اور گاؤں کے دوسرے لوگوں نے کہا کہ ان لوگوں کے پاس مخطوطات کافی تھے لیکن کیڑوں نے چاٹ کر ختم کر دیا۔

جموئی میں بلخی صاحب مرحوم کو یہ خبر ملی کہ تواریخی اسناد راجہ گدھور کے پاس کافی ہیں، مختصر یہ کہ دسمبر ۱۹۴۷ء تک چار ماہ تین ہفتوں کی جد و جہد میں انہوں نے سیکڑوں مخطوطات کا معائنہ کیا، پٹنہ، آرہ، مونگیر، بھاگلپور کے اضلاع میں کیا اور انہوں نے یہ کوشش کی کہ پٹنہ یونیورسیٹی لائبریری میں قیمتی مخطوطات کو محفوظ کر لیا جائے تاکہ مختلف ریسرچ اسکالروں کے لئے یہ چیز کارآمد ہو، درجنوں شاہی فرامین کی نقلیں، اسناد اور چار نہایت ہی اہم فارسی کے کتبات حاصل کئے۔

بلخی صاحب نے یونیورسیٹی میں یہ بھی رپورٹ پیش کی کہ ان فرامین، اسناد، قلمی کتابوں اور دیگر مخطوطات کے علاوہ انہوں نے کافی تعداد میں کتبوں کا بھی معائنہ کیا ہے جن سے تیرہ صدی ہجری اٹھارہویں صدی عیسوی تک کے شہنشاہوں، بادشاہوں اور صوبہ داروں کی واقفیت ہوتی ہے جن کا تعلق صوبہ بہار کی تاریخ کے مختلف عہدوں سے ہوتا ہے اس پر طویل مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ بہار میں مسلمانوں کی چھ سو برسوں کی حکومت کے بارے میں بہت ساری معلومات فراہم ہوں گی۔

Annual report of the regional records Survey Committee by Dr K.K. Dutta 1950-51

کی فائل دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم نے پٹنہ یونیورسیٹی کے شعبہ مخطوطات

میں کتنی نادر اور نایاب کتابیں جمع تھیں۔ موصوف کی جمع شدہ کتابوں کو درج ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کی حاصل شدہ فارسی مخطوطات یہ ہیں :

(۱) مجموعۃ الانشاء، مصنفہ منشی محمد صادق بن مظفر حسین، مصنف رحمت خاں ناظم بنگال کے یہاں لگ بھگ بیس سال دیوان رہا، شاہی فرمان کو لکھا کرتا تھا، اس کتاب میں بہت سی نادر کتابوں اور تاریخی حوالے بھی درج کئے ہیں ساتھ ہی ساتھ تاریخی مقاموں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس نے رحمت خاں ناظم بنگال کی وفات ۱۱۴۷ھ کے بعد لاہور بود و باش اختیار کیا جہاں اس نے یہ کتاب لکھنی شروع کی۔

(۲) ملفوظات حکیم قاسم الدین۔ حکیم قاسم الدین نے دیوان راج کمار سنگھ کے یہاں لگ بھگ ۲۰ سال کی ملازمت کی۔ ان کے آباد اجداد ہندوستان میں مسلمانوں کے اوائل حکومت کے درمیان آئے جہاں ڈمبیا نامی گاؤں ضلع پٹنہ میں بود و باش اختیار کر لی۔

(۳) مکتوبات مرزا قتیل تلمیذ خواجہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۴) مکتوبات عبدالرحیم خانخاناں شہنشاہ اکبر کے دربار سے وابستہ تھے اس مکتوبات میں گورکھپور کے نظامت حکومت کا حال ملتا ہے۔

(۵) تاریخ مراۃ العالم مصنفہ بختیار خاں۔ اس تاریخی کتاب میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اوائل حکومت سے لے کر شہنشاہ اورنگ زیب تک کے حالات ملتے ہیں۔

(۶) خلاصۃ التواریخ مصنفہ سجن سنگھ۔ اس تصنیف میں ہندوستان کے ابتدائی تاریخی حالات سے لے کر شہنشاہ شاہجہاں کی زندگی کے آخری حالات اور اس کے فرزندوں کے مابین گدی کی جنگ تک کے حالات ملتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے نادر تاریخی حالات ملتے ہیں۔

Annual report of the regional survey committee
by K.K. Dutta 1951-52

کی رپورٹ کے مطابق بلخی صاحب مرحوم نے پٹنہ یونیورسیٹی شعبۂ مخطوطات میں مندرجہ ذیل کتابیں جمع کیں۔ ڈاکٹر کے۔ کے دتا لکھتے ہیں کہ میں بہت شکر گذار ہوں کہ جناب الف بلخی اور جناب پروفیسر

سید حسن عسکری کی کوششوں سے مندرجہ ذیل فارسی کے مخطوطات شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسیٹی میں درج ہوئے۔

(۱) فن تاریخ: - تذکرہ تیموری بزبان فارسی مصنفہ شہنشاہ تیمور ترجمہ بزبان ترکی، تاریخ نوشتہ درج نہیں۔ خط نستعلیق کی تحریر ہے سائز ۱۶×۱۰ - ۲۷۸ صفحات پر مشتمل ہے موضوع اس تاریخ میں شہنشاہ تیمور کے حالات ملتے ہیں۔

(۲) فن تاریخ: تذکرۃ السلاطین جلد دوم بزبان فارسی، تاریخ نوشتہ درج نہیں، خط نستعلیق میں لکھی ہوئی سائز ۱۶×۱۰ - ۵۲۱ صفحات، موضوع اس کتاب میں شہنشاہ شاہجہاں اور شہنشاہ اورنگ زیب کی حکومت کے حالات ملتے ہیں۔

(۳) فن تاریخ: خلاصۃ الاحوال بزبان فارسی مصنفہ منشی آشرم ۱۲۰۶ھ میں لکھی گئی خط نستعلیق کی تحریر ہے سائز ۹½×۵½ - ۱۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ موضوع اس کتاب میں ہندوستان کی ابتدائی تاریخی حالات سے لے کر شاہ عالم ثانی تک کے حالات ملتے ہیں۔

(۴) تاریخ عماد السعادات بزبان فارسی مصنفہ غلام علی نقوی ۱۲۶۹ھ میں لکھی گئی ہے خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ ہے سائز ۷×۱۰، صفحات ۳۰۴ پر مشتمل ہے، موضوع اس کتاب میں اودھ کے نواب سعادت خاں کی حکومت کے حالات ملتے ہیں۔

(۵) تاریخ عالم آرائے عباسی جلد دوم بزبان فارسی۔ تاریخ تحریر درج نہیں۔ خط نستعلیق کا بہتر نمونہ ہے، سائز ۸×۱۴ - ۴۰۴ صفحات۔ اس کتاب میں فارسی شہنشاہ عباسی کے دور کے حکومت کے حالات اور کارنامے اور فارس کے ہمسایہ ممالک کے بھی حالات ملتے ہیں (۶) تاریخ عالم آرائے عباسی جلد ششم بزبان فارسی۔ تاریخ تحریر درج نہیں۔ سائز ۸×۱۴ - ۴۶۸ صفحات خط نستعلیق میں تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب میں بھی مذکورہ بالا حالات ملتے ہیں (۷) مکتوبات خلاصۃ الانشاء بزبان فارسی مصنفہ لچھمی رام پنڈت دیدی ۱۲۳۲ھ میں مکمل ہوئی، خط نستعلیق میں لکھی گئی۔ سائز ۷×۱۰½ ۹۰ صفحات۔ کتاب کا پہلا صفحہ تلف شدہ ہے۔

بلخی صاحب مرحوم نے ۵۵-۱۹۵۴ء کے زمانہ میں ۲۴۹ یعنی لگ بھگ ڈھائی سو نادر

مخطوطات پٹنہ یونیورسیٹی کے شعبہ مخطوطات میں جمع کیں، چند نادر مخطوطات درج ذیل ہیں:

(۱) تحفۃ الانشار مصنفہ عبدالحسن ۱۰۴۶ھ ۔ دکنی اردو کا ایک نادر نمونہ ہے۔

(۲) سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم بزبان اُردو ۱۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے، جس پر علامہ شبلی نعمانی کا مقدمہ ہے یہ کتاب عربی زبان سے موازنہ اور تصحیح کے بعد مرتب کی گئی ہے (۳) دیوان ولی دکنی مرقومہ ۱۱۲۶ء یہ دیوان ولی دکنی کا سب سے پرانا نسخہ ہے (۴) طوطا کہانی مصنفہ حیدر بخش حیدری مرقومہ ۱۲۷۱ھ (۵) قصہ گل بکاولی مصنفہ نہال چند مرقومہ ۱۲۷۱ھ (۶) ہشت بہشت مصنفہ محمد باقر آغا الاری مرقومہ ۱۲۶۳ھ، یہ مخطوطہ حیدرآباد کے سرکاری کتب خانہ سے بھی بہتر نسخہ ہے (۷) اخوان الصوفی کا غیر مطبوعہ ترجمہ مرقومہ ۱۸۱۰ء (۸) سلاسۃ الرسل مرقومہ ۱۲۳۷ھ اس کتاب میں علم رسل کے موضوع پر بحث کی گئی ہے (۹) تکمیل الایمان مصنفہ عبدالحق دہلوی مرقومہ ۱۲۹۸ھ اس کتاب میں ہندوستان میں تحریک وہابیہ کے مفصل حالات لکھے ہیں (۱۰) طوطی نامہ مصنفہ ضیاء نقشبندی (۱۱) شہامۃ المرجان مصنفہ آزاد بلگرامی مرقومہ ۱۲۷۱ھ (۱۲) خطوط ٹیپو سلطان، اس مکتوبات کے مجموعہ میں ٹیپو سلطان کے اہم تاریخی خطوط ہیں جو مورخ کے لئے بہت ہی کارآمد ہیں (۱۳) طبقات اکبری مصنفہ نظام الدین احمد یہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں لکھی جانے والی ایک اہم اور مشہور تاریخ ہے (۱۴) آصف الاشرف مصنفہ نصیر الدین طوسی (۱۵) فرخ سیر (۱۶) مثنوی جوہر ذات مرقومہ ۱۰۶۱ھ عطار کی مثنوی کا ایک مشہور اور قدیم نسخہ (۱۷) ملفوظات بختیار کاکی مرقومہ ۱۱۹۴ھ (۱۸) کلیات انوری (۱۹) روزنامچہ سفر سالار جنگ مرقومہ ۱۲۹۳ھ بزبان فارسی (۲۰) کیمیائے بنالیق، عربی زبان میں فن کیمیا کے موضوع پر ایک نادر مخطوطہ (۲۱) معرفت انطل عربی زبان میں نظام شمسی کے موضوع پر ایک نادر مخطوطہ۔

بلخی صاحب مرحوم کو پٹنہ یونیورسیٹی نے ۱۹۵۶ء میں تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں نیپال بھیجا۔ اس سفر میں بلخی صاحب مرحوم کے ساتھ کئی حضرات گئے، پٹنہ یونیورسیٹی کے رجسٹرار کے اس خط کی نقل کو پیش کیا جاتا ہے جس کو انھوں نے بلخی صاحب مرحوم کے نام لکھا تھا۔

From

Sri J. Sahay M.A.T.D (London)
Registrar Patna University
PATNA-5

(1) To

Dr. K. K. Dutta
Dean Faculty of Arts
Patna University, PATNA

(2) Dr. A. S. Altekar
Head of the Depts of
Ancient Indian History
and Culture Patna University
PATNA

No. G/18845-46 Patna
Dated 5th October 1956

Subject: Sending of research party to Nepal.

Sir,

With reference to your letter No (1) 183 dated 20th of August 1956 (2) 445 ALHLC dated the 11th of August 1956 on the subject noted above. I am directed to send herewith a scheme for sending of a research party to Nepal as approved by the

syndicate at its meeting held on 22nd of September 1956.

I have to request you kindly to draw up accordingly a programme for sending the party to Nepal in consultation with Dr. A-S. Altekor/ Dr K. K. Dutta and send the same to me immediately for taking necessary action in the matter so that the party may proceed during the Puja vacation.

A copy of this letter is being sent to the other members of the research party for their present information.

Yours faithfully
Sd/ J. Sahay
Registrar.

Memo No G/18847-53

Patna the 5th October 1956

Copy alongwith Copy of the enclosure forwarded to:-

(1) D. Dr. B. P. Sinha Head of Dept. of Ancient Indian History and culture, Patna University Patna
(2) Prof. S. H. Askary Patna College.

(3) Dr. R. S. Sharma Dept. of History Patna University.

(4) Dr. V. P. Upadhya Asst. Director of Sanskirit Education, Patna.

(5) Pandit V. L. Shastari Research Asst. Patna University

(6) Shri F. Balkhi Research Asst. Patna University Patna

(7) The Budget Account Officer Patna University in duplicate for information and necessary action.

Enclo

R.H.S. 1 10/56

J. Sahay
Registrar.

ملک نیپال اپنے تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے ہندوستان سے مماثلت رکھتا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے حکم کے مطابق بلخی صاحب مرحوم نے تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں ۸ نومبر ۱۹۵۶ء کو نیپال کا دورہ کیا، پٹنہ یونیورسٹی کی یہ پہلی ٹیم جو اپنے تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں نیپال گئی اس گروپ کے شرکا میں پروفیسر سید حسن عسکری۔ ڈاکٹر آر۔ اس۔ شرما، شری جگدیو شرما اور بلخی صاحب مرحوم سے ملک نیپال کے موجود دارالسلطنت کاٹھمنڈو بلکہ مضافات، قصبات پاٹن اور بڑھ گاؤں کا بھی دورہ کیا۔

بلخی صاحب مرحوم نے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات کے لئے لگ بھگ دو درجن عربی، فارسی اور اردو کے نادر مخطوطات فراہم کئے۔

نیپال کی بیر لائبریری اور کیسر لائبریری میں اردو، فارسی اور عربی کے مخطوطات دستیاب نہیں ہوئے لیکن نیپالی میوزیم میں عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات پائے گئے جو علم نجوم وغیرہ اور دیگر ادبی موضوعات پر تھے اور آخری الذکر کا تعلق فارسی کی تصنیفات سے تھا اور آدھے کا تعلق دیوناگری رسم الخط سے ہے۔ اردو ترجمہ اور یہ ساری کتابوں کا معائنہ میوزیم کے اعلیٰ حکام کی اجازت کے

بعد کیا گیا۔

آخر کار بلخی صاحب مرحوم نے نیپالی مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا جو کشمیری نژاد تھے جن کے سعی سے لگ بھگ ایک درجن مخطوطات کا معائنہ کتب خانہ دار المطالعہ میں کیا جو اندرا چوک کے پاس ہے اور اٹھارہ عدد مخطوطات جناب خواجہ حسن شاہ کے دولتکدہ باغ بازار میں۔ بلخی صاحب مرحوم کو یہ بھی خبر ملی کہ نیپالی مسلمانوں کے پاس کافی تعداد میں فارسی کے مخطوطات ان کے ذاتی گھروں میں موجود ہیں جن کو حکیم حسن شاہ نے اپنی نظروں سے دیکھا۔ فارسی کے مختلف مخطوطات جن کو بلخی صاحب مرحوم نے معائنہ کیا ان کی تفصیل یہ ہے:

مخطوطات دار المطالعہ اندرا چوک، جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہے

(۱) قواعد التاریخ مصنفہ طفیل اللہ (۲) مفتاح العلم مصنفہ محمد حیات ان مخطوطات کے اواخر میں اردو میں اہم جنسیات کی اطلاع ملتی ہے (۳) تزک تیموری مصنفہ شاہ تیمور مرقومہ ۱۲۴۳ھ (۴) مکاتیب علامہ ابو الفضل جامع بھتیجا عبد الصمد افضل سال مرقوم درج نہیں لیکن یہ لگ بھگ دو سو سال پرانا نسخہ ہے (۴) مراتب المجاہدین مرقومہ ۱۲۲۳ھ اس مخطوطہ کا پہلا صفحہ غائب ہے۔ اس کتاب میں اسلامی فلسفہ سے بحث کی گئی ہے (۵) تاریخ بنگلہ مرقومہ ۱۸۱۲ء اس تاریخ میں شہنشاہ اورنگ زیب سے لے کر نواب علی [illegible] خاں ناظم بنگالہ اور سراج الدولہ کی شہادت کے حالات ملتے ہیں یہ ایک نادر نسخہ ہے، اس مخطوطہ کے چند ہی نسخے موجود ہیں جن میں برٹش میوزیم اور حیدرآباد اسٹیٹ لائبریری قابل ذکر ہیں اس کے مصنف سلیم اللہ ہیں۔ موجودہ نسخہ کے نقل نویس راج محل کے گوپال لال ہیں جو باشندہ ہگلی کے ہیں (۶) بادشاہ نامہ اس تاریخ میں شہنشاہ شاہجہاں کے دور حکومت ۱۶۵۷ء سے [illegible] تک کے حالات ملتے ہیں اس کا پہلا اور آخری صفحہ غائب ہے (۷) جواہر التفسیر قرآن حکیم کی تفسیر ہے یہ نہایت ہی قدیم اور اہم مخطوطہ ہے اور [illegible] ہے۔ اس نسخہ کی نمائش پانچ موقعوں پر ہندوستان کے سلاطین کے سامنے کی گئی اور یہ مخطوطہ ۹۷۳ھ شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں مکمل ہوا (۸) دیوان شوکت، فارسی ادب کے مشہور شاعر شوکت کے مختلف اصناف شاعری پر مشتمل ہے اس کے مرتب التفات خاں ہیں جو اعلیٰ عہدے پر فائز تھے یہ نسخہ ۱۱۴۲ھ میں مرتب ہوا (۹) سکندر نامہ مصنفہ نظامی گنجوی مرقومہ ۱۲۵۹ھ۔

جناب حکیم حسن شاہ محلہ باغ بازار کاٹھمنڈو کے ذاتی کتب خانہ میں فراہم شدہ مخطوطات

(۱) انیس العاشقین ایک پرانا اور نادر مخطوطہ جس میں تصوف کے رموز و نکات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۰۳۵ھ میں مرتب ہوا جو شہنشاہ جہانگیر کا آخری عہد حکومت تھا (۲) شرح خلاصۃ الفصیح مرتبہ عبدالعزیز بظاہر ایک قدیم مخطوطہ اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ (۳) بیاض واثق مرقومہ ۱۲۴۷ھ ایک نادر مخطوطہ جس میں شاعر کے فارسی اور اردو کے کلام ہیں۔ اس کے علاوہ ٹھمریاں، سوہان اور کلاسیکی گیت ہیں جو ہندی اور اردو میں ہیں۔ (۴) ....

(۵) ایک نادر مخطوطہ جس میں لذیذ کھانا بنانے کے طریقے بتائے گئے ہیں جس کے اول اور آخر کے صفحات غائب ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ خستہ حالت میں موجود ہے (۶) کنز الدقیق مرتبہ نصراللہ بن محمد بن حمید یہ مخطوطہ شہنشاہ اورنگ زیب کے پینتس ۳۵ سالہ عہد حکومت میں مرتب ہوا اس میں مذہبی فلسفہ کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ مؤلف نے سلطنت مغلیہ کے مختلف شہنشاہوں کے عہد حکومت کے حالات لکھے ہیں (۷) اصل المعرفت مرقومہ ۱۲۱۱ھ ایک نادر مخطوطہ ہے جس کا پہلا صفحہ غائب ہے اس مخطوطہ میں کئی دیگر مخطوطات بھی شامل ہیں جن میں قنات و عشرت تاریخی جو مختلف تاریخی واقعات کو ظاہر کرتے ہیں اور مطالب رشیدی جس میں صوفی طریقت شاہ شہاب تراب علی ابن محمد کاظم قلندر کے ہیں (۸) شرح مثنوی مولانا روم از ہدایت اللہ ابن عبدالفتح حسین ایک مشہور صوفی کی تخلیق ہے جو مکمل مفصل اور قابل تحسین ہے (۹) سلامۃ الذہب دفتر دوم ایک قدیم مخطوطہ جس میں اسلامی فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے (۱۰) انشاء رفائق مکتوبات تحریر کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں، اس کو نواب میر قاسم نے اپنے بچہ کی تعلیم کے لئے ۱۹۳۰ء میں لکھا تھا (۱۱) بیاض خصوصی یا ملفوظات خواجہ سید عظیم الدین بدخشانی، اس بیاض بر جلیس قدر ابن آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے اپنی جائداد کو جو بیچا ہے اس کی تین مختلف روداد یں اس میں ملتی ہیں (۱۲) تاریخ حسن عبدالرسول غہوا جلد اول، یہ کشمیر کی تاریخ ہے۔ جس میں مفصل حالات ملتے ہیں۔ یہ فارسی زبان میں ہے جو ۱۳۱۷ھ میں مکمل ہوا، مؤلف نے تاریخ لکھنے کے سلسلے میں مختلف ذرائع کا سہارا لیا ہے جس میں لگ بھگ ۳۰ کتابوں کے حوالے ہیں (۱۳) شرح سوائے یک محرکہ مؤلف قاضی شہاب الدین مخطوطہ مرقومہ ۱۱۶۶ھ اس میں اسلامی تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے (۱۴) رسالہ وجیہہ الحفظ مرتبہ لطف اللہ مخطوطہ مرقومہ ۱۲۲۲ھ

(۱۵) کتاب ادائے عبادت کی۔

چنانچہ مذکورہ بالا کتابوں کی جو تحقیق بلخی صاحب مرحوم نے کی وہ عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات تھے جن کا معائنہ بلخی صاحب نے کاٹھمنڈو نیپال میں کیا جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جیسے مکتوبات فلسفہ التصوف، شاعری، مذہب، عام موضوع، سوانح اور ملفوظات وغیرہ۔

بلخی صاحب مرحوم ۱۹۵۸ء میں ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر قیام الدین کے ہمراہ بھاگلپور تحقیقی کاموں کے سلسلے میں تشریف لے گئے جہاں انہوں نے چند نادر مخطوطات اور سکوں کا معائنہ کیا، اس کے علاوہ بھاگلپور کے مضافات کے بھی قصبات کا دورہ کیا جہاں انھیں اپنے کام کی چیزیں دریافت ہوئیں، طوالت کے پیش نظر اس کی تفصیلی رپورٹ پیش کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔

انڈین ہسٹوریکل رکارڈ کمیشن کا انیسواں[۳۲] سالانہ اجلاس پٹنہ میں ۱۹۷۶ء میں منعقد ہوا تھا چنانچہ ادارہ کی طرف سے مخطوطات اور سکوں کی نمائش بھی ہوئی تھی چنانچہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات سے چند نادر اردو، فارسی اور عربی کے مخطوطات کی نمائش کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مثنوی گوہر جوہری مصنفہ شاہ آیت اللہ جوہری۔ واحد نادر قلمی نسخہ مرقومہ ۱۱۶۱ھ (۲) تاریخ مہابت جنگ مصنفہ یوسف علی (علی وردی) کے عہد حکومت کے حالات ہیں اس کے چند ہی قلمی نسخے موجود ہیں۔ (۳) مظفر نامہ مصنفہ کرم علی خاں صوبہ بہار، بنگال، بہار اور اڑیسہ کی نادر تاریخ ہے۔ اس مخطوطہ میں اٹھارہویں صدی کے آخری چوتھائی کے حالات ملتے ہیں اس کے بھی چند ہی نسخے موجود ہیں (۴) تذکرہ گلزار ابراہیم مصنفہ نواب علی ابراہیم خاں خلیل اس میں اٹھارہویں صدی تک کے شعراء کے حالات ملتے ہیں (۵) دیوان شاداں حیدرآباد کے راجہ چندو لال شاداں کی شعری تخلیق ہے (۶) سفرنامہ ابن بطوطہ جلد ۲ کا اردو ترجمہ ۱۹۰۱ء یہ بالکل صحیح ترجمہ ہے (۷) شرح دیوان حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہ (۸) مثنوی تحفۃ النساء مرقومہ ۱۰۶۶ھ سولہویں صدی کے دکنی اردو کا ایک نادر نسخہ (۹) ہشت بہشت مصنفہ محمد باقر آغا باشندہ نودہ مکمل نسخہ ہے۔ اس کے سنہرے حاشیے پر کچھ نوٹس ہیں (۱۰) احوال نادر شاہ کی رضا مصنفہ راجہ جنگل کشور یہ تاج الدین محمد خاں نوشتہ نادر شاہ کے دہلی پر حملہ کے دونوں عینی گواہ شاہد ہیں (۱۱) مرادوالملک مصنفہ تاج الدین عوظہ (۱۲) شرح رخ صادق مرقومہ ۹۵۵ھ

علم نجوم کے موضوع پر فارسی زبان میں نادر کتاب ہے۔ (۱۳) دیباچہ دیوان حافظ مصنفہ غلام شیراز (۱۴) کیمیائے بسلیقہ ایک قدیم مخطوطہ علم کیمیا کے موضوع پر ہے (۱۵) معرفت افلاک عربی زبان میں ایک نادر نسخہ ہے جس میں نظام شمسی اور نظام قمری کا ذکر ہے (۱۶) شمس العلوم ولطیف العارفین عربی زبان میں نادر نسخہ ہے (۱۷) الاشبہی وتصنیف العارف ایک نادر مخطوطہ (۱۸) حاشیہ کتاب حیات قاضی رومی نادر مخطوطہ (۱۹) روضۃ المشبہ مصنفہ ولی مرقومہ سنہ ۱۱۳۰ھ یہ شاعر اردو کے مشہور شاعر ولی دکنی کے عصر کا ہے۔

مذکورہ بالا اردو، فارسی اور عربی کے مخطوطات جن کی نمائش انڈین ہسٹوریکل سوسائٹی کے تیئیسواں اجلاس میں کی گئی یہ سب بلخی صاحب مرحوم کی سعی کی بدولت حاصل کی گئیں۔

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کی جب ہم تحقیق نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ بلخی صاحب نے فن تحقیق کا ایمانداری سے ثبوت پیش کیا ہے اور یہی خوبی اردو کے محققوں میں ڈاکٹر عبدالحق محی الدین قادری زور، مسعود حسن رضوی ادیب اور قاضی عبدالودود جیسے مشہور محققوں کے یہاں نظر آتی ہے یہ اور بات ہے کہ صوبہ بہار میں رہنے کے سبب ان کی شہرت زیادہ نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

باب ہفتم

فصیح الدین بلخی مرحوم بہ حیثیت تذکرہ نگار

اُردو ادب میں تذکرہ نگاری کی ابتدا فارسی تذکروں کی تقلید میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے اردو کے قدیم تذکروں کی زبان فارسی تھی یہاں تک کہ اردو کا سب سے مشہور اور مستند تذکرہ نکات الشعرا بھی فارسی زبان میں لکھا گیا۔ اس کا عظیم ثبوت یہ ہے کہ محمد حسین آزاد کے تذکرہ "آب حیات" سے قبل جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان کی زبان فارسی ہے۔

فارسی ادب میں تذکرہ نگاری کی ابتدا آغاز اسلام کے کئی سو سال بعد ہوئی۔ صاحب راحت الصدور و آیت السرور کے بیان کے مطابق چھٹی صدی ہجری کے وسط میں طغرل بن ارسلان کی خواہش پر شعرا کے کلام کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، تذکرے کی حیثیت سے جس تذکرہ کا نام لیا جا سکتا ہے وہ نورالدین محمد عوفی کا لباب الالباب ہے، لباب الالباب سے قبل بھی بعض ایسی تصنیفات ہیں جن میں فارسی شاعری اور فارسی شعرا کا ذکر کیا گیا ہے[1]

(۱) مناقب الشعراء

(۲) مجمع النوادر

---

[1] تذکروں کا تذکرہ نمبر، نگار ۱۹۶۴ء سالنامہ پاکستان ص ۸

(۳) راحت الصدور

لباب الالباب ہی فارسی کا پہلا تذکرہ ہے اور ایڈورڈ براؤن نے صحیح لکھا ہے

عزت ایں کتاب لباب الالباب دریں است کہ دریں فن تقریباً یادگار وحید است

فارسی کا پہلا تذکرہ لباب الالباب ۶۱۷ھ اور ۶۱۸ھ کے درمیان تکمیل کو پہنچا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے فارسی تذکروں اور ان کی اہمیت کو دو خاص گروہ میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) عام تذکرے یعنی ایسے تذکرے جن میں فارسی شاعری کے آغاز سے لے کر معاصرین تک کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً تذکرۃ الشعرا، خلاصۃ اشعار، خزینہ گنج الہٰی، مراۃ الخیال، سفینہ خوشگو، ریاض الشعرا، ید بیضا اور عرفات العاشقین وغیرہ۔

(۲) خاص تذکرے یعنی وہ تذکرے جن میں کسی خاص عہد یا دور یا صرف معاصر شعرا کا ذکر آیا ہے مثلاً مجالس النفائس، کلمات الشعرا، تذکرہ نصر آبادی۔

اردو شعرا کے تذکروں کا آغاز اور پہلا تذکرہ

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا اور رفتہ رفتہ دیسی راجہ نوابوں اور بعدہٗ انگریز کے ہاتھوں منتقل ہوگیا، اس سیاسی تبدیلی نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا وہاں زبان و ادب پر بھی گہرا اثر پڑا۔ فارسی زبان جو کئی صدیوں سے سرکاری زبان تھی اب اس کی جگہ اردو نے لے لی اردو نثر نگاری کی طرف ذرا دیر میں توجہ دی گئی یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ فارسی زبان میں لکھے گئے۔

تذکرہ گلشن ہند مولفہ مرزا لطف علی، جو تذکرہ گلزار ابراہیم کا آزاد ترجمہ ہے، سارے کے سارے تذکرے فارسی زبان میں ہیں۔ آب حیات کی سنہ تالیف ۱۸۸۰ء تک یہ سلسلہ قائم رہا۔

شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ میر کا نکات الشعرا ہے، سوال یہ ہے کہ اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج میر اور درد کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا اور بعض معاصرین محمد یار خاں خاکسار، رفیع الدین سودا اور سراج الدین خاں آرزو اور سید امام الدین نے بھی اردو شعرا کے تذکرے ترتیب کئے تھے لیکن دست زمانہ سے

محفوظ نہ رہ سکے اور آج یہ تذکرے ناپید اور نایاب ہیں، اردو کے قدیم تذکروں میں مندرجہ ذیل[1]
کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

(۱) نکات الشعراء	از میر تقی میر مولفہ ۱۱۶۵ھ
(۲) گلشن گفتار	از حمید اورنگ آبادی مولفہ ۱۱۶۵ھ
(۳) تحفۃ الشعراء	از افضل بیگ قاقشال مولفہ ۱۱۶۵ھ
(۴) ریختہ گویاں	از فتح علی گردیزی مولفہ ۱۱۶۶ھ
(۵) مخزن نکات	از قیام الدین قیام مولفہ ۱۱۶۸ھ

اردو تذکروں کی تقسیم: فارسی تذکروں کی طرح اردو تذکروں میں بڑی رنگا رنگی بحیثیت مجموعی ان کا تنقیدی اسلوب اور تحسین لب و لہجہ یکساں ہے لیکن مؤلف کا مزاج تحریر علاقہ ماحول اور انفرادی رنگ ان تذکروں میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان کی ہئیت اور موضوع کو مدنظر رکھ کر ہمارے ناقدین نے مختلف طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

محی الدین قادری زور نے مصنف کی نوعیت کا لحاظ رکھ کر تین خاص قسمیں کی ہیں:

۱۔ وہ جو کسی بڑے شاعر کے نتیجۂ فکر ہیں۔

۲۔ وہ جن کے مصنف خود بڑے شاعر ہیں۔

۳۔ وہ جن کے مصنفین کو سخن گو نہیں بلکہ سخن فہم کہنا چاہئے۔

نگارساں تاسی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور شمس اللہ قادری نے ان تذکروں کو ان کے اعتبار سے دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔

(الف) عام تذکرے جن میں ابتدا سے لے کر معاصرین تک کے حالات ردیف وار بلحاظ ادوار میں جمع کئے جاتے ہیں۔

(ب) خاص تذکرے جن میں کسی خاص عہد کے شعراء یا خاص مصنف شعرا یا کسی خاص علاقوں سے شعرا کا ذکر آیا ہو۔

بعض ناقدین نے تذکروں کے مختلف خصوصیات کے اعتبار سے سات قسمیں تعین کی ہیں۔

---

[1] تذکروں کا تذکرہ نمبر نگار ۱۹۶۴ء ص ۲۸

اوّل : وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات جمع کیے گئے ہیں اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

دوم : وہ تذکرے جن میں تمام قابل ذکر شعرا کا تذکرہ موجود ہے۔

سوم : وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعرا کے کلام کا عمدہ اور مفصل ترین انتخاب کرنا ہے۔ ان تذکروں میں شعرا کی بیاضیں اور مجموعے داخل ہیں۔

چہارم : وہ تذکرے جن میں شاعروں کو طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اس تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقا دکھانا ہے۔

پنجم : وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں۔

ششم : وہ تذکرے جو کسی وطن یا کسی ادبی گروہ کے نمائندے ہیں۔

ہفتم : وہ تذکرے جن کا مقصد محض تنقید سخن اور اصلاح سخن ہے۔

اردو کے تذکروں کو ہم صرف دو طبقات میں بھی تقسیم کرسکتے ہیں۔

طبقہ اوّل : قدیم طرز کے تذکرے۔

طبقہ دوم : جدید طرز کے تذکرے۔

قدیم طرز کے تذکرے نکات الشعرا کے تتبع میں لکھے گئے ہیں، مندرجہ ذیل تذکرے تتبع کی مثال ہیں:

(۱) تذکرہ ریختہ گویاں۔ فتح علی گردیزی کا (۲) مخزن نکات قائم چاندپوری (۳) تذکرہ میر حسن (۴) تذکرہ مصحفی۔

موخر الذکر قبیلہ کے تذکرہ میں معیار الشعرا ذکا، مجموعہ نغز قدرت اللہ قاسم، گلشن بے خار نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ گلستان بے خزاں۔ باطن۔

جدید طرز کے تذکرے جو جدید اثرات کے تحت لکھے گئے ہیں ان میں سوانحت کا رنگ غالب ہے۔ شعرا کے حالات اور واقعات حوالوں کے ساتھ مستند تاریخوں کے ساتھ درج ہیں۔

(الف) گلزار ابراہیم مصنفہ نواب ابراہیم خاں، گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف۔

(ب) طبقات الشعرائے ہند مولوی کریم الدین۔ تاریخ ادبیات ہندوستانی گارساں دتاسی۔

نکات الشعرا کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شعرا کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔
اس کی دوسری خوبی اس کی خوبصورت اور سچی سیرت نگاری ہے۔

تذکرہ ریختہ گویاں سنہ ۱۱۶۲ھ فتح علی حسینی گردیزی اس میں اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے میر
کے تذکرہ کا کوئی ذکر نہیں لیکن بہر حال میر کے تذکرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں صرف انٹھانوے
شعرا کے حالات ملتے ہیں، گردیزی ان انٹھانوے میں ہے۔ النسخہ پر ایک آدھ سطر سے زیادہ
نہیں لکھ سکے۔

ڈاکٹر عبدالحق کا یہ خیال ہے کہ کسی بھی جودت طبع کا ثبوت نہیں ملتا تاہم یہ تذکرہ سوانحی اور
تاریخی حیثیت سے اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ گردیزی کا بیان اپنے معاصر شعرا کے بیان کے
سلسلے میں شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) مخزن نکات۔ سنہ ۱۱۶۸ھ قیام الدین قائم۔ قائم نے اس تذکرے کو تین ادوار میں تقسیم کیا
ہے۔ طبقہ اول میں متقدمین کا طبقہ دوم میں متوسطین کا اور طبقہ سوم میں متاخرین کا ذکر ہے اس
میں دکن کے شعرا پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

(۳) تذکرہ حیرت سنہ ۱۱۷۴ھ۔

(۴) تذکرہ شورش سنہ ۱۱۹۳ھ

(۵) تذکرہ خاکسار معشوق علی چہل سالہ محمد یار عرف کلّن باکلو۔

(۶) چمنستان شعرا سنہ ۱۱۷۵ھ شفیق اورنگ آبادی

(۷) مجموعہ نغز سنہ ۱۲۲۱ھ۔ نکات الشعرا کی ضد میں لکھا گیا۔

عیار الشعرا عمدہ منتخبہ کے بعد قدیم تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب
"آب حیات" کا ماخذ اصل یہی ہے۔ بقول محمود شیرانی، ہر شخص کو نیکی کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

(۸) تذکرہ میر حسن سنہ ۱۱۸۸ھ، ۱۱۹۲ھ، یہ تذکرہ تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ
اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ میر حسن نے نہ کسی کی بے حد تعریف کی ہے یا کسی کی تنقیص کی ہے لیکن کلام

کے انتخاب میں انہوں نے بڑی خوش ذوقی اور سخن شناسی کا ثبوت دیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جو نئے طرز کے تذکرے لکھے گئے ہیں انہیں ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور: تاریخی اور تحقیقی رجحانات کے حامل تذکرے۔

دوسرا دور: لسانی تحقیق اور اصناف سخن کے ارتقاء کے اسباب اور فن تذکرہ نویسی کے تنقید پر محمول تذکرے۔

تیسرا دور: تذکرہ نویسی کو ادبی تاریخ کے قالب میں ڈھالنے کا رجحان رکھنے والے تذکرے۔

پہلے دور کے تذکروں میں گلزار ابراہیم مرتبہ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی، موصوف ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اسپرنگر نے گلزار ابراہیم کی درج ذیل خصوصیت بتائی ہے۔

(۱) شعراء کے حالات زندگی اور وفات کی تاریخوں کا تعین۔

(۲) خط و کتاب کے ذریعہ واقعات کی فراہمی۔

(۳) معاصرین کے حالات میں ان کے خطوط کے اقتباسات۔

(۴) کلام کے مفصل نمونے۔

ماسوا اس کے شعراء کے ذکر میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔

علی ابراہیم خاں خود پاکیزہ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے، غرض یہ کہ یہ تذکرہ کئی حیثیت سے اہمیت کا حامل ہے۔ "گلشن ہند" تذکرہ گلزار ابراہیم ایک ترقی یافتہ شکل میں ترجمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا علی لطف نے نہ صرف ترجمہ کا خیال رکھا ہے بلکہ بہت سے اضافے بھی کئے ہیں۔ ایک طرف اردو کے قدیم اسلوب کا نمونہ ملتا ہے تو دوسری طرف شعر و ادب اور تاریخی سوانح کے متعلق مزید معلومات ملتی ہیں۔ جو اس تذکرے کے علاوہ کسی دوسرے تذکرے میں نہیں آتی ہیں۔

دوسرے دور کے تذکروں میں گارساں دتاسی اور صہبائی کے تذکرے ملتے ہیں۔ شیخ امام بخش صہبائی نے ۱۸۴۳ء میں ولی، درد، سودا، میر حسن، نظیر، حسن، ممنون، ناسخ، منشی موتی چند،

ذوقؔ، مومنؔ کے کلام کا انتخاب کیا ہے، اس انتخاب میں انھوں نے تمام اصناف سخن کو ملحوظ رکھا ہے۔

گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوستانی ۱۸۳۹ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

(۱) یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے جس کے مقدمہ میں اردو تذکروں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

(۲) ادب کی تاریخ اور تذکروں پر تنقید کا رجحان دتاسی کے بعد تذکروں میں متعینہ طور پر عام ہو گیا۔

لہ

فرانسیسی خاتون لیلیان نذر نے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی نگرانی میں تنقیدی حواشی و مقدمہ کے ساتھ ان تین جلدوں کا ترجمہ کرکے Ph. D کی ڈگری حاصل کی۔

تذکرہ کریم الدین "طبقات الشعرا ہند" ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا، کریم الدین اور فلین صاحب نے ۱۸۴۸ء میں گارساں دتاسی کے تذکرہ کا اردو میں ترجمہ کیا، کریم الدین کا دیباچہ اور مقدمہ جس میں اردو زبان کی پیدائش و قدامت اور رسم الخط کی بحث ہے تذکرہ کریم الدین اردو شاعری کی تاریخ کی باقاعدہ تدوین کا پہلا قدم ہے۔

تیسرے دور کے تذکروں میں "آب حیات" سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادؔ نے یہ تذکرہ ۱۸۸۰ء میں سپرد قلم کیا۔ 'آب حیات' کی اشاعت کے بعد اردو تذکروں میں ایک انقلاب آیا۔ بقول پروفیسر شیرانی اُردو کیا فارسی میں بھی اس پایہ کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

لہ آب حیات کے بعد اردو شعرا کے متعدد تذکرے لکھے گئے وہ قابل ذکر ہیں۔

۱۔ آثار الشعرا ہنود مولفہ دیبی پرشاد ہنود

۲۔ جلوۂ خضر مؤلفہ صفیر بلگرامی۔

۳۔ یادگار ضیغم مؤلفہ ضیغم

۴۔ آثار الشعرا مؤلفہ ممتاز علی

لہ اردو تذکروں کا تذکرہ نمبر 'نگار' پاکستان ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۳۴

۵۔ آبِ بقا مؤلفہ عبدالرؤف عشرت

۶۔ تذکرہ شعرائے دکن مولانا عبدالجبار خاں ملکاپوری

۷۔ گلِ رعنا مؤلفہ مولوی عبدالحیٔ

۸۔ بہارِ سخن زریں مؤلفہ شیام پرشاد سندر لال

۹۔ انتخاب زریں مؤلفہ سید راس مسعود

۱۰۔ قاموس المشاہیر مؤلفہ نظامی بدایونی

۱۱۔ تذکرہ خندہ گل مؤلفہ عبدالباری آسی

۱۲۔ تذکرہ شاعرات مؤلفہ عبدالباری آسی

۱۳۔ شعر الہند مؤلفہ عبدالسلام ندوی

۱۴۔ تذکرہ ریختی مؤلفہ تمکین کاظمی

۱۵۔ ہندو شعرا مؤلفہ عبدالرؤف عشرت

۱۶۔ خم خانہ جاوید مؤلفہ لالہ سری رام

۱۷۔ جوہرِ سخن مؤلفہ محمد مبین کیفی چڑیا کوٹی

۱۸۔ کاشف الحائق مؤلفہ امداد امام اثر

اس کے علاوہ بہت سے ایسے تذکرے بھی ہیں جن کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔

اردو کے مشہور ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی تصنیف "اردو تنقید پر ایک نظر" میں اردو تذکرہ نگاری پر سخت اعتراض کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

[1] اردو میں تذکرے تو بہت ہیں قدیم و جدید ابھی تک اردو تنقید تذکرہ کی حد سے باہر قدم نہیں رکھتی۔ قدما سیدھے سادے طریقے سے نسبتاً خموشی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے تھے موجودہ زمانہ میں ظاہری صورت مختلف ہے، زور و شور ہنگامہ طمطراق کی کثرت ہے لیکن اندر خلا،

---

[1] اردو تنقید پر ایک نظر مصنف کلیم الدین احمد ص۱

ہی خلا ہے ......"

تذکروں میں مختلف شعرا کا ذکر بہ اعتبار حروف تہجی ہوتا ہے اس لئے پراگندگی لازمی نتیجہ ہے۔
جس طرح غزل میں انتشار ہوتا ہے اور متفرق خیالات و جذبات بے ترتیبی کے ساتھ اکٹھا کر دیئے جاتے ہیں اسی طرح ان تذکروں میں بھی مختلف زمانہ، مختلف رنگ، مختلف پایہ کے شعراء ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

بہار اور اردو تذکرہ نگاری

قبل اس کے کہ ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کی تذکرہ نگاری کا جائزہ لیں، ہم بہار میں اردو تذکرہ نگاری کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دیتے ہیں۔

تذکرۂ شورش : شعرائے اردو کا یہ پہلا تذکرہ نکات الشعرا ہے، یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں قلمبند کیا گیا۔ چنانچہ شورش نے بھی اپنا تذکرہ ۱۱۹۳ھ میں لکھا، شورش کا نام سید غلام حسین عرف بھیا، ان کا آبائی وطن عظیم آباد ہے۔ شورش کے حالات دیگر تذکروں میں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً تذکرہ مسرت افزا، گلشن بے خار، تذکرۂ عشقی اور طبقات الشعرا میں بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

شورش کے معاصر ابوالحسن کے مسرت افزا سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مدت سے شعرا کا کلام اکٹھا کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کا نام "یادگار دوستان روزگار" رکھا اور تاریخ تالیف میں یہ مصرعہ دیا۔ "یادگار دوستان روزگار"۔ اس مصرعہ سے تذکرہ کے مکمل کا سال ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء نکلتا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں موجود ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی نے اس کی عکسی نقل حاصل کی تھی اور کلیم الدین احمد کی سعی سے اس تذکرے کو "تذکرۂ عشقی" کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں شائع کر لیا لیکن اس میں حرف "س" تک شعرا شامل ہیں۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ حالات زندگی زیادہ مفصل نہیں پھر بھی مولف نے شاعر کا نام تخلص، وطن، مولدیت، مشغلہ، تاریخ پیدائش درج کی ہے، شورش نے تذ ما سے لے کر معاصر تک کا ذکر کیا ہے۔ ترتیب میں حروف تہجی کا خیال رکھا گیا ہے۔

تذکرۂ مسرت افزا : تذکرہ مسرت افزا کے مصنف ابوالحسن ہیں، موصوف کا آبائی وطن

الہ آباد تھا لیکن بعد کو وہ عظیم آباد میں مقیم ہوئے، یہ تذکرہ ۱۱۹۳ھ میں مکمل ہوا، گارساں دتاسی کے خیال میں مسٹر ڈبلو اوسلے کے پاس موجود تھا، غالباً وہی نسخہ آکسفورڈ میں موجود ہے، یہ تذکرہ ابوالحسن نے عظیم آباد سے لکھنؤ جاتے وقت لکھا، لکھنؤ کے قیام کے دوران انہوں نے مزید ترمیم و اضافہ کیا، تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔

تذکرہ عشقی: عشقی کا اصل نام شیخ محمد وجیہہ الدین شیخ غلام حسین مجرم کے بیٹے تھے ان کے والد فارسی کے ایک اچھے شاعر تھے، عشقی خود بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔

عشقی نے اپنا مشہور تذکرہ ۱۲۱۵ھ میں مکمل کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آکسفورڈ اور ایک قاضی عبدالودود کے کتب خانہ میں موجود ہے، کلیم الدین احمد نے اس تذکرہ کو تذکرہ شورش کے ساتھ دو تذکرے کے عنوان سے ۱۹۵۹ء میں شائع کرایا لیکن مطبوعہ نسخہ مکمل نہیں۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ حالات زندگی بہت مختصر ہیں، تذکرہ شورش کی طرح اس میں اشعار کی کثرت نہیں ہے

گلزار ابراہیم - مصنف علی ابراہیم خاں خلیل، خلیل عظیم آباد کے باشندہ تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ گلزار ابراہیم کے علاوہ فارسی کے دو تذکرے۔

۱۔ خلاصۃ الکلام

۲۔ صحف ابراہیم

یہ تذکرہ ۱۱۹۸ھ میں لکھا گیا، جان گلکرسٹ کی فرمائش پر مرزا علی لطف نے اس کا ۱۸۰۱ء میں ترجمہ کیا لیکن مرزا لطف نے ترمیم و اضافہ کیا۔ گلزار ابراہیم کو ۱۹۰۶ء میں گلشن ہند کے ساتھ عبداللہ خاں نے حیدر آباد سے شائع کیا، مولوی عبدالحق اور محی الدین زور دونوں کے مقدمے شامل ہیں، مولوی عبدالحق کا مقدمہ گلشن ہند میں اور ڈاکٹر زور کا مقدمہ گلزار ابراہیم میں ہے، ڈاکٹر زور کا یہ خیال ہے۔

لہ "گلزار ابراہیم اردو شاعری کے ان تذکروں میں سے ہے جو معلومات اور وسعت

لہ مقدمہ گلزار ابراہیم، بحوالہ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر صہ ۱۴۲

اور صحت کے لحاظ سے درجہ اول کے تذکرے کہے جا سکتے ہیں۔"

گلزار ابراہیم کی زبان فارسی ہے اس میں تین سو بتیس ۳۳۲ شعرا کا ذکر آیا ہے، اس تذکرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے، اس میں نہ کسی کی بے حد تعریف کی گئی ہے اور نہ ہی تنقیص۔ انہوں نے کسی شاعر کے حالات درج کرنے میں نہ صرف سنی سنائی ہوئی باتوں پر بھروسہ کیا ہے بلکہ چھان بین کے بعد معتبر ذرائع سے مواد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، مزید انہوں نے حوالات بھی دیئے ہیں، غرض یہ تذکرہ کئی اعتبار سے دوسرے تذکرے پر فوقیت رکھتا ہے۔

جلوۂ خضر : مصنفہ صفیر بلگرامی، جلوۂ خضر دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی، دوسری جلد ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔ صفیر بلگرامی کے پوتے وصی بلگرامی کا خیال ہے کہ باقی جلدوں کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی اور کاغذات تلف ہو گئے، صفیر بلگرامی کی بے وقت موت نے جلد سوم کی ترتیب و تکمیل کا موقع نہیں دیا۔

جلوۂ خضر ایک ایسا تذکرہ ہے جس پر اعتراضات ہوئے ہیں، صفیر بلگرامی نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ جلوۂ خضر کی ترتیب میں انہوں نے 'آب حیات' کی تقلید کی ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ہے کہ آزاد کے بعد مصنفوں میں جلوۂ خضر کے مصنف صفیر بلگرامی نے آزاد کے سرچشمہ سے اکتساب کیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر عبدالحق کا خیال ہے کہ شعر الہند کے مؤلف عبدالسلام ندوی نے متروکات کے سلسلہ میں صرف جلوۂ خضر پر اکتفا کر لیا، وہ کہتے ہیں "شعرا اور الفاظ و محاورات کے تغیر و تبدل کے متعلق بھی بہت کچھ جلوۂ خضر مؤلفہ صفیر بلگرامی سے ماخوذ ہے۔

صفیر بلگرامی کا سب سے پہلا تقلیدی اقدام جلوۂ خضر کی ترتیب میں ملتا ہے۔ آزاد نے اپنے تذکرہ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور صفیر نے ادوار کے بجائے اپنے تذکرے میں کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ جلوۂ خضر میں پانچ جلوے ہیں اور پانچوں جلووں میں آٹھ کمیٹیاں بن جاتی ہیں۔ سبھی کمیٹیوں کے چیرمین و لی دکنی بنائے جاتے ہیں۔

---

۵ جلوۂ خضر تلخیص و تنقید مرتبہ ڈاکٹر ظفر اوگانوی ص ۲۵

آزاد نے زبان اردو کی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اُردو زبان بھاشا سے نکلی ہے ۔ آزاد کا یہ خیال گمراہ کن ہے' صفیر نے اس نظریہ کی تردید کی ہے وہ کہتے ہیں :

" اُردو وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے الفاظ عربی، فارسی اور ترکی کے ملنے سے خود بہ خود پیدا ہو گئی "

صفیر کے تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہمیں آب حیات ہی کی طرح صرف مشاہیر شعراء سے واقفیت نہیں ہوتی بلکہ معروف یا غیر معروف کا امتیاز نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اس میں مزید سے مزید شعراء کو جگہ دی گئی ہے ۔

صفیر بلگرامی نے مشاہیر شعراء کے شاگردوں کی فہرست تیار کرنے میں سخت محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے ان میں بعض مشاہیر شعرا کی فہرست اس طرح ہے ۔

سودا	١٢ شاگرداں	ناسخ	٧۴ شاگرداں
میر	١١ رر	میر درد	١٠ رر
مصحفی	۴٧ رر	جرأت	٣٣ رر
ذوق	٢۵ رر	رنگین	٣ رر
آتش	٢٨ رر	شاہ نصیر	١۴ رر
امیر	٢٣ رر	مومن	٢٠ رر

مختصر یہ کہ جلوۂ خضر صفیر کا ایک ایسا تذکرہ ہے جس کو اردو ادب کی تاریخ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی ۔

سخن شعراء : تذکرہ سخن شعرا کے مصنف مولوی عبدالغفور نساخ ہیں۔ سخن شعرا تاریخی نام ہے اس کا سال تصنیف ١٨٦٣-٦۴ء نکلتا ہے۔ سخن شعراء ١٢٩١ھ میں نول کشور پریس سے شائع ہوا یہ تذکرہ ۵٧٢ صفحات پر مشتمل ہے ۔

[2] یہ تذکرہ اُردو میں ہے ۔ اس میں قدما سے لے کر اُنیسویں صدی کے اواخر تک کے تقریباً

---

[1] جلوۂ خضر تلخیص و تنقید مرتبہ ڈاکٹر ظفر اوگانوی ص ٣۵

سارے شعرا کا ذکر ہے۔ آخری دس صفحات شاعرات کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ ۴۵ شاعرات کے حالات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی نے اپنے تحقیقی مقالے میں اپنی لاعلمی کے بنا پر سخن شعرا کے ضمن میں یوں لکھا ہے:

لہ "عبدالغفور نے یہ ضخیم تذکرہ سخن شعراء کے نام سے لکھا ہے جس میں اس دور کے تقریباً سبھی شعرا کو شامل کر لیا ساتھ ہی خواتین شعراء کا بھی ذکر کیا جو اس سے پہلے کسی تذکرہ میں موجود نہ تھا حالانکہ مصحفی نے سب سے قبل تذکرہ ہندی پانچ خواتین شاعرات کے حالات درج کئے ہیں۔"

ڈاکٹر جاوید نہال نے اپنی کتاب "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" میں سخن شعرا کے ضمن میں یوں اظہار خیال کیا ہے:

سے "نساخ کا یہ تذکرہ تشنہ ہے نساخ نے شاعروں کا مختصر حال اور چند اشعار نمونتاً درج کئے ہیں۔ بلاشبہ نساخ کا یہ تذکرہ تشنہ سہی لیکن ادبی دنیا ہندوستان بھر کے شعراء سے متعارف ہوتی ہے خصوصی طور پر اردو کے چند گمنام شعرا کے بھی حالات اس تذکرے میں ہمیں ملتے ہیں۔"

نساخ کا آبائی وطن ضلع فرید پور میں راجہ پور نامی بستی تھا۔ مگر ان کے والد قاضی محمد نقیر کلکتہ میں رہتے تھے۔ چنانچہ نساخ ۱۲۴۹ھ میں کلکتہ میں پیدا ہوئے، نساخ کے چاروں بھائیوں میں نواب عبداللطیف ہی صرف مشہور ہوئے۔ اپنی ملازمت کے سبب نساخ صوبہ بہار کے مختلف ضلع پٹنہ اور بھاگلپور میں مقیم رہے۔ نساخ کے نام اور فرزند شمس کلکتوی مقام بانکے مضافات بھاگلپور میں پیدا ہوئے۔

کاشف الحقائق۔ مصنفہ سید امداد امام اثر۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس میں مشرق اور مغرب کے فلسفہ، مباحث مع تاریخ بیان کئے گئے ہیں، تذکرے کو مستند بنانے کے لئے عربی، فارسی اور انگریزی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ عبارت تصنع سے پاک ہے۔ عربی و فارسی کی

لہ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر صفحہ ۱۶۵
سے انیسویں صدی میں بنگال کا ادب صفحہ ۴۳۶

کی اصلاحیں کثرت سے ملتی ہیں۔

تاریخ شعرائے بہار: مؤلفہ سید عزیز الدین بلخی راز۔ تاریخ ادوار کے بنا پر لکھی گئی ۱۱۵۰ھ سے لے کر ۱۳۰۰ھ تک کے بہاری شعرا کی تاریخ ہے، ہر پچاس سال کا ایک دور متعین کیا گیا ہے، حالات و نمونۂ کلام میں اختصار سے کام لیا گیا ہے اس کی دوسری جلد جو ۱۳۰۰ھ سے لے کر ۱۳۵۰ھ تک ہے ہنوز طباعت و اشاعت سے محروم ہے۔ غالباً اس کا مخطوطہ ان کے منجھلے صاحبزادے سید منظر احمد بلخی مقیم ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کے پاس موجود ہو۔ دوسری جلد پریس میں گئی تھی کہ موصوف کا انتقال ہو گیا۔ فصیح الدین بلخی مرحوم نے راز بلخی مرحوم سے متعلق رسالہ اشارہ پٹنہ فروری ۱۹۵۹ء میں اپنا ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ انہوں نے اس مقالے میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ انہیں ۱۹۴۹ء میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا، عبدالقادر مرحوم نے جلد اول و دوم غیر مطبوعہ کو یکجا کر کے شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن سیاسی فسادات اور تقسیم ملک کے بنا پر یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔

بہار اور اردو شاعری۔ مصنفہ پروفیسر معین الدین دردائی۔ یہ ایک کتابچہ ہے جس میں صوبہ بہار کے قدیم و جدید شعرائے کے حالات اور کلام نمونہ پیش کیا گیا ہے، یہ کتابچہ مختصر ہے۔

علامہ سید علی محمد شاد کی تصنیف نوائے وطن اور حیات فریاد ہے، حیات فریاد جناب سید شاہ الفت حسین فریاد استاد شاد کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں تصانیف میں ضمناً دوسرے بہار کے شعرا کے حالات ملتے ہیں۔

یادگار وطن: علامہ شوق نیموی عظیم آبادی کی تصنیف ہے۔ اس میں اپنے حالات تفصیل سے اور اپنے چند تلامذہ کے حالات اور ہر ایک کے چند اشعار ضمناً لکھے گئے ہیں۔

مرقع فیض: مصنفہ سلطان عظیم آبادی، اس میں حضرت صفیر بلگرامی آروی کے تلامذہ کا ذکر ہے۔

فروغ بزم: معروف بہ تذکرہ شعرائے صوبہ بہار مؤلفہ جناب جگیشر پرشاد خلش گیاوی تلمیذ خواجہ عشرت لکھنوی۔ یہ تذکرہ نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ضلع عظیم آباد کے سوا تمام اضلاع بہار کے اردو شعرا کا تذکرہ ہے، یہ تذکرہ اردو زبان میں لکھا گیا اور شعرا کے تخلص کے حروف تہجی پر مرتب کیا گیا اور صوبہ بہار کے ضلع واری شعرا کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ حالات قدرے تفصیل

سے لکھے گئے ہیں۔

گلشنِ حیات : مصنفہ سید معین الدین قیس تلمیذ حضرت شاد عظیم آبادی، اس میں قیس مرحوم نے حضرت شاد کے تلامذہ کے حالات اور کلام کو تفصیل سے لکھا ہے۔ اور آخر میں حضرت شاد کی سوانح حیات اور کلام کو درج کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۴۶ھ میں سلیمانی پریس شاہ کی املی پٹنہ سے شائع ہوئی۔

تذکرہ مسلم شعرائے بہار : مؤلفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی، یہ تذکرہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے لکھا گیا ہے، جلد اول حرف الف سے ح تک، جلد دوم خ سے ش تک جلد سوم ص سے ف تک، جلد چہارم ق سے م تک، جلد پنجم ن سے ی تک مشتمل ہے۔ جلد ششم ایک مستقل ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تذکرہ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ تذکرہ نگار نے تذکرہ کی ترتیب کے سلسلے میں حد درجہ طوالت سے کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر لگ بھگ بارہ سو شعرا کے نمونۂ کلام اور حالات اس میں ملتے ہیں، پھر بھی موصوف نے کافی محنت اور چھان بین کے بعد یہ تذکرہ لکھا ہے، یہ تذکرہ موصوف کی لگ بھگ ۳۰ سال کی محنت کا ثمرہ ہے اور تذکرہ نگار کا اپنے وطن خصوصی طور پر صوبہ بہار پر ایک عظیم احسان ہے، عزیز الدین بلخی مرحوم کی تصنیف تاریخ شعرائے بہار کے بعد یہ ایک نادر تذکرہ وجود میں آیا۔ تنقیدی حیثیت سے اس تذکرہ کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں لیکن موصوف کی بے جا صلاحیت کی وجہ سے اس تذکرہ میں صوبہ بہار کی اُردو شاعری کی کوئی ارتقائی کیفیت نہیں ملتی پھر بھی یہ کتاب مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف نے جلد اول میں صوبہ بہار کی اُردو شاعری کا ارتقائی جائزہ لیا ہے، جلد ششم کے دیباچہ میں تذکرہ نگار نے اس امر کا اعتراف کیا ہے" ابھی صوبہ بہار کے بہت سے اردو شعرا کے حالات پردۂ خفا میں پڑے ہیں اور ان کو ڈھونڈ نکالنا اور منظرِ عام پر لانا ان نوجوان محققوں کا کام ہے جو اس مادری زبان سے شغف رکھتے ہیں تاکہ جب کبھی اردو زبان کی جامع تاریخ لکھی جائے تو بہاری شعرا کے کلام کا کافی ذخیرہ بھی موجود ہو۔"

ڈاکٹر مظفر اقبال اپنے گرانقدر تحقیقی مقالہ "بہار میں اُردو نثر نگاری کا ارتقا ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک" میں جہاں انہوں نے اس دور کی اردو تذکرہ نگاری کا جائزہ لیا ہے ان کی تعداد۔

تیرہ[۱۳] بتائی ہے۔ چنانچہ اس باب میں موصوف نے صرف دو ادبی تذکرہ اول الذکر کاشف الحقائق کا نام بتایا ہے اور دوم ایک تذکرہ جس کا نام "نعائم البناتین فی تراجم الخواتین" ہے اس کے علاوہ ایسے تذکروں پر روشنی ڈالی ہے جن کی خالص نوعیت مذہبی ہے۔ ایسے تذکروں میں بزرگانِ دین یا صوفیائے کرام کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ان تذکروں پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ **حالاتِ سلاسلِ صوفیہ مولفہ قاضی محمد اسمٰعیل عظیم آبادی، مکتوبہ ۱۸۶۲ء تا ۱۸۷۰ء** قاضی سعید مرحوم نے لکھا ہے کہ حالات سلاسلِ صوفیہ کے سلسلے میں ایک مختصراً رسالہ ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ قاضی عبدالودود صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

۲۔ **عناصر الشہادتین: مؤلفہ حکیم ناصر علی غیاث پوری مطبوعہ ۱۸۷۴ء** ۔ اس کتاب کا نام تاریخی ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب کا جو موضوع رکھا گیا ہے اس میں شہیدانِ کربلا خلفائے راشدین اور اصحاب کرام کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۔ **شجرۃ الیقین فی جنت النعیم فسبح باسم ربک العظیم مؤلفہ شاہ رضا حسین مطبوعہ ۱۸۸۳ء** کتاب کا نام تاریخی ہے۔ پہلے حصہ کا نام شجرۃ الیقین فی جنت نعیم ہے اور دوسرے حصہ کا نام فسبح باسم ربک العظیم ہے۔ پوری کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ اس طرح پوری کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۴۔ **تذکرۃ الکرام مع تکملہ تذکرۂ اولاد و خلفا حضرت شیخ العارفین مخدوم شاہ محمد نعمت اللہ قادری پھلواروی مؤلفہ و مترجمہ ایوب قادری پھلواروی** شریف کے بزرگوں کا تذکرہ موسوم بہ تذکرۃ الکرام بہ زبان فارسی، مصنفہ محمد ابوالحیات قدس سرہٗ کا اردو ترجمہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مترجم نے شاہ محمد نعمت اللہ قادری مجیبی پھلواروی کی اولاد و خلفاء کا تذکرہ لکھ کر شائع کی۔

۵۔ **نسائم البساتین فی تراجم الخواتین مؤلفہ ابو محمد احمد احسن صدیقی** ۔ اس تذکرہ کا واحد قلمی نسخہ ابوالبقا واقع موضع پوریجی بھاگلپور کے پاس محفوظ ہے۔ اس تذکرہ کے دو حصے ہیں پہلے حصہ کا نام طبقات بیگمات ہے اور دوسرے کا طبقات شاعرات ہے۔ تذکرے کو مستند بنانے کے لئے مؤلف نے ماخذ کا سہارا لیا ہے۔

۶۔ **نعمت عظمیٰ سہ جلد مترجمہ عبدالغنی استھانوی مطبوعہ ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۱-۱۲ء** صوفیا اور اولیاء کے احوال پر مشہور عالم امام عبدالوہاب شعرانی کی مشہور مستند کتاب طبقات الکبریٰ عربی کا واحد ترجمہ ہے۔

طبقات الکبریٰ دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور نعمت عظمیٰ کے نام سے چار جلدوں میں شائع کرانے کا ارادہ کیا ہے لیکن اس کی صرف ۳ جلدیں منظر عام پر آسکیں۔

۷۔ مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین ۳ جلد مؤلفہ عبدالستار بیگ سہسرامی مرتومہ ۱۹۰۷ء۔ یہ کتاب تین بار شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تالیف ۱۹۰۵ء میں عمل میں آئی لیکن جلد سوم کی اشاعت مؤلف کے انتقال کے بعد عمل میں آئی۔

۸۔ تاریخ اسلام۔ اس کتاب میں تصوف اور مختلف سلاسل کے صوفیا کی تاریخ کے علاوہ تا عہد عباسیہ بیان کیا گیا ہے۔ تاریخی واقعات کے انواع سے زیادہ اخلاقی و تمدنی حالات پیش کئے گئے ہیں۔ مؤلف نے باتوں کو مستند بنانے کے لئے مختلف کتابوں سے حوالے دیئے ہیں۔ زبان میں صفائی و سادگی ہے۔

۹۔ گنجینۂ سیدی المعروف بہ آئینۂ مبارک مؤلفہ سید حسن بہاری مطبوعہ ۱۹۰۸ء یہ کتاب ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔ یہ سلسلہ قادریہ مجددیہ آبادانیہ علیہ و فریدیہ کے بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ ان حضرات کے احوال کے علاوہ رسول کریم صلعم و اصحاب کے احوال بھی بیان کئے گئے ہیں۔ مؤلف نے ماخذ کا حوالہ بھی دیا ہے۔

۱۰۔ تذکرہ بزرگان پھلواری: مؤلفہ شاہ سلیمان پھلواروی، شاہ صاحب موصوف کے ایک معتقد منظور الحق حکیم قادری نے ۱۹۴۱ء میں آپ کے فارسی و عربی اور اردو کلام کا ایک مجموعہ اعظمات سلیمانی معروف بہ نسخہ حاذق کے نام سے شائع کیا، اس میں آپ کی چند تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے۔

۱۱۔ تاریخ محد ثمین ہند، مؤلفہ عبدالغفور دانا پوری، مصنف کی ایک دوسری کتاب جغرافیہ صوبہ بہار مطبوعہ ۱۹۰۷ء کے سرورق پر اس کتاب کا اشتہار چھپا۔

۱۲۔ گلشن ابرار مؤلفہ عبدالغفور دانا پوری، جغرافیہ صوبہ بہار کے سرورق پر اس کتاب کا نام ملتا ہے۔

۱۳۔ نجات اکبری معروف بہ نذر محبوب مؤلفہ اکبر دانا پوری، یہ ابوالعلائی سلسلہ کے بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔

ذیل میں ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کی تذکرہ نگاری کا جائزہ لے رہے ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم کی

تذکرہ نگاری کے ضمن میں ان کی دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ اول تذکرہ نسوانِ ہند اور دوم تذکرہ ہندو شعرائے بہار۔ اول الذکر کی تصنیف موصوف کی زندگی میں شائع ہوئی اور آخرالذکر ان کی وفات کے بعد۔

تذکرہ نسوانِ ہند: یہ تصنیف جولائی ۱۹۵۶ء میں شمسی پریس پٹنہ سیٹی سے شائع ہوئی۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ہندوستان کی نامور خواتین کے حالات اور کارنامے درج کیے گئے ہیں پوری کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے نیز اول تا آخر ہر حصہ کی الگ الگ سرخی قائم کی گئی ہے، اول حصے میں شاعرات کے تذکرے ہیں اس میں ۲۸۱ شاعرات کے ذکر ہیں۔ حصہ دوم میں جس کی سرخی مصنفات ہے' اس حصہ میں ان خواتین کا ذکر ہے جن کا لگاؤ تصنیف و تالیف سے ہے اس میں ۴۵ خواتین کا ذکر ہے۔ تیسرا حصہ جس کی سرخی کاملات ہے ۱۶ خواتین کے حالات درج ہیں' چوتھا حصہ جس کی سرخی مشہورات ہے ایک سو ایک خواتین کے حالات درج کیے گئے ہیں۔

اس طرح مجموعی طور پر اس کتاب میں لگ بھگ ۵۰۰ خواتین کے حالات درج اور کارناموں کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں کتاب کا مقدمہ ہے جس کو صاحب کتاب نے خود ہی سپرد قلم کیا ہے۔ اس مقدمہ کو پڑھنے سے پہلے تو مشہور خواتین کے حالات زندگی سے صاحب کتاب کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس معاملے میں مرتب کتاب کا بہت گہرا مطالعہ ہے چنانچہ مقدمہ کے اس اقتباس سے اس کا احساس ہوگا۔

[1]"ممالک یورپ میں بھی اس قسم کی پابندیاں نہ ہونے کے باوجود عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل نہ تھا، انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انگلینڈ یورپ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا تھا مگر وہاں بھی عورتوں کو بہت سے ضروری حقوق حاصل نہ تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں اول لندن یونیورسٹی نے عورتوں کو امتحان میں شرکت کی اجازت دی اور اس کے دو برس کے بعد عورتوں کو میونسپل ممبری کی اجازت دی گئی ۱۸۷۰ء کے قبل تک شادی شدہ عورتوں کو ذاتی جائداد رکھنے کے حقوق حاصل نہ تھے۔"

---

[1] مقدمہ تذکرہ نسوانِ ہند

فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ نسوانِ ہند" میں اپنی تصنیف کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یوں لکھا ہے۔

لہ "کسی ملک کے باشندوں کو علمی و ادبی، فنی و سیاسی، تمدنی اور اخلاقی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ معلوم کرنے کے لئے مردوں کے علاوہ عورتوں کے حالات کی واقفیت بھی ضروری ہے، مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے عموماً مردوں کے حالات شد و مد کے ساتھ لکھے ہیں۔

تذکرہ نگار کو اپنے ملک اور وطن کی عظمت کا احساس ہوتا ہے چنانچہ اس نے یہ محسوس کیا کہ

لہ "لیکن تمام قیود اور پابندیوں کے باوجود ملک ہند کی خواتین کے صفات اور کارنامے اس قدر اہم عظیم الشان اور حیرت انگیز ہیں کہ ان کی مثالیں کسی اور ملک کی تاریخ میں کمتر پائی جاتی ہیں۔"

یہ کتاب بلخی صاحب کی ۲۵ سال کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے کتاب کے مقدمہ میں یوں فرمایا ہے۔

لہ "اب سے کوئی ۲۵ سال قبل راقم کو مشاہیر کا ایک تبصرہ مرتب کرنے کا خیال ہوا جس کا ذکر راقم نے تاریخ مگدھ کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ اس زمانے سے متفرق طور پر مشاہیر کے حالات قلم بند کرنا شروع کیا تھا۔ حال میں بعض عزیزوں کے اصرار سے تمام اوراق پریشاں کا جائزہ لیا تو ظاہر ہوا کہ قدیم زمانے سے دور حاضر تک تقریباً ایک ہزار اشخاص کے حالات جمع ہو گئے ہیں جن میں پانچ سو خواتین کے حالات ہیں۔"

تذکرہ نسوانِ ہند ایک مستند اور جامع تذکرہ ہے اس تذکرہ کی ترتیب میں لگ بھگ ۳۵ مستند فارسی اور اردو کی تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کا مقدمہ بھی بہت ہی جامع ہے۔ اس تصنیف کے پانچ حصوں کا جہاں تک تعلق ہے حصہ اول کی سرخی شاعرات ہے۔ لگ بھگ

لہ مقدمہ تذکرہ نسوانِ ہند

لہ ۲ " " " "

لہ ۳ " " " "

۲۸۶ شاعرات کے حالات ملتے ہیں کیونکہ جہاں تک کہ شاعرات کا تعلق ہے تذکرہ نگار کے پیش نظر اصل معیار ہے خواہ وہ شاعر کوئی مغل شہزادی، کوئی پردہ نشین عورت ہو یا کوئی رقاصہ یا کوئی زن خانگی۔

مختصر یہ کہ انہوں نے طبقات سے تعلق رکھنے والی شاعرات کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر بلخی صاحب مرحوم نے اپنے تذکرے میں مغل شہزادی گل بدن بیگم یا نصیب النساء بیگم کا اگر ذکر کیا ہے تو اس کے ساتھ دہلی کی ایک زن خانگی بنّو کا بھی ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ایسی بھی شاعرات کا ذکر کیا ہے جنہیں فن شاعری میں عبور تھا۔ مثال کے طور پر جمیلہ کا ذکر ص۱۳۷ پر جنہوں نے ۸ دواوین بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

دوسرے حصہ کی سرخی مصنفات ہے اس میں ۵۴ خواتین کے حالات ملتے ہیں۔ اس حصہ میں ان خواتین کا ذکر ہے جن کا لگاؤ تصنیف و تالیف سے ہے خواہ وہ خواتین افسانہ نگار ہوں یا ناول نگار یا مضمون نگار یا صحافت۔ افسانہ نگار کے ضمن میں ملک کی مشہور خاتون عصمت چغتائی ص۱۱ ناول نگار کے سلسلے میں رشید النساء عظیم آبادی ص۷ انہوں نے مرأۃ العروس کے طرز پر ایک اصلاح النساء اپنا ناول، موتی بیگم کا بھی نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے جس نے راجپوتانہ گزٹ کی ایڈیٹری بحسن و خوبی انجام دی۔

حصہ سوم جس کی سرخی کاملات ہے اس میں ۱۶ خواتین کے حالات ملتے ہیں جنہوں نے کسی خاص فن میں کمال حاصل کیا، فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ حصہ قابل ذکر ہے۔ بلخی صاحب مرحوم فن کار کی تہہ دل سے قدر کرتے تھے۔ خصوصی طور پر اس حصہ میں انہوں نے سریندر کور ص۱۴ میں جو پنجابی گیتوں کو گانے میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ لتا منگیشکر کا بھی ذکر فاضل تذکرہ نگار نے کیا ہے۔ لتا منگیشکر عہد حاضر کی مشہور گانے والی ہے اور کلاسیکی فن موسیقی میں مہارت رکھتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بلخی صاحب نے گوہر کا بھی ذکر کیا ہے جس کے گانے کی شہرت یورپ تک پہنچی۔ بلخی صاحب نے گوہر کے ضمن میں یوں لکھا ہے۔

"اس کے گانے کی شہرت یورپ تک پہنچ چکی تھی"۔

حصہ چہارم جس کی سرخی شہرات ہے اس میں ایک سو ایک خواتین کے حالات ملتے ہیں جنہوں نے تاریخی، سیاسی، تمدنی یا اخلاقی کارناموں کے سبب شہرت حاصل کی۔ تاریخی شہرت رکھنے والی عورتوں میں رانی واہر ص۲، بدمنی ص۸، تمدنی شہرت رکھنے والی خاتون میں درگاوتی ص۱۹ اور اخلاقی شہرت رکھنے والی خواتین میں پنّا ص۱۲ پر تھال ص۸۴، کرشن کماری ص۵۲ اور زوجہ داؤد خاں ص۴۳ کا نام

خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔

حصہ پنجم جس کی سرخی مقدسات ہے لگ بھگ اہم خواتین کے حالات ملتے ہیں جن کو مذہبی تقدس حاصل ہے۔ اس حصے میں انہوں نے بلا تفریقِ مذہب و ملت سبھی خواتین کا ذکر لکھا جنہیں تقدس حاصل ہے ساتھ ہی ساتھ سبھوں کا احترام بھی کیا مثال کے طور پر ہندؤں کی مقدس عورت سیتاجی کے ضمن میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

لہ مہاراجہ رام چندر جی کی زوجہ تھیں اور ان کے صفات کے بیان سے رامائن کے صفحات بھرے پڑے ہیں، ان کا صبر و استقلال، شوہر پرستی اور وفاداری بے عدیل و بے نظیر ہے، بارہ برس شوہر کی معیت میں جنگلوں میں بسر کی اور طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں لیکن شوہر کی محبت میں کمی آنے نہ دی، انہوں نے بڑی پاکدامنی کے ساتھ راون کے ظلم اور سنگدل حملوں کا مقابلہ کیا۔"

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد بلخی صاحب مرحوم کی وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔

تذکرہ نسوانِ ہند ایک ایسی کتاب ہے جو ہر مذاق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے ساتھ ہی ساتھ مصنف کی فراخدلی اور وسیع النظری کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ عورتوں کے حالات جمع کرنے کے سلسلے میں ان کے کارناموں کو مقدم سمجھا گیا ہے، اس تذکرہ کو مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہد قدیم سے لے کر عہد حاضر تک تمام مشہور خواتین خواہ وہ کسی فن میں بھی ماہر ہوں سبھوں کو یکساں نظر سے دیکھا گیا ہے۔

سید عبد الرؤف ندوی مرحوم نے اپنے گرانقدر مقالہ "فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت" میں تذکرہ نسوانِ ہند کے ضمن میں اپنی یوں رائے پیش کی ہے۔

سلہ نسوانِ ہند کے تذکرے کی ترتیب و تالیف کی طرف بیش رو اور بھی مولفین نے

لہ تذکرہ نسوان ہند حصہ مقدسات ص۲

سلہ فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت مخطوطہ

بھی کبھی توجہ کی تھی مگر کسی نے ایسا جامع اور کامل تذکرہ ترتیب نہیں دیا ہے۔ ہندوستان کی دقیانوسی سوسائٹی میں اس جنس لطیف کو جیسی قدر و منزلت تھی وہ معلوم ہے لہٰذا سوسائٹی کے مذاق میں انقلاب پیدا کرنے اور زاویہ نگاہ بدلنے کی خاطر آج سے بیسوں سال پہلے انہوں نے اس کی طرف توجہ کی، بلا قید مذہب و ملت کے باکمال خواتین کے تذکرے کی تجسس و تلاش کی طرف متوجہ ہوئے نیز ملک و سلطنت کے انقلاب کے ساتھ سوسائٹی کے مذاق میں انقلاب پیدا ہوا مگر غلط روی کے ساتھ، بہرکیف آپ نے تذکرہ نسوانِ ہند ترتیب دے کر ایک طرف گمنامی کے پردہ سے انہیں نکال کر انہیں نکال کر لوگوں کی نظروں کے سامنے لا کھڑا کر دیا تو دوسری طرف ہندوستانی سوسائٹی میں باکمال خواتین کے وقار کو بڑھا دیا۔"

جناب قیوم خضر اپنے گرانقدر مقالہ بعنوان "مرحوم بلخی صاحب" میں تذکرہ نسوانِ ہند کے متعلق اپنی یوں رائے پیش کرتے ہیں:

ؔ"تذکرہ نسوانِ ہند سے متعلق میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر اس قدر جامع کتاب اردو میں کوئی دوسری نہیں لکھی گئی ہے، یہ کتاب اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔"[1]

ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبۂ اردو ٹی۔ان۔بی کالج بھاگلپور نسوانِ ہند کے ضمن میں اپنی قیمتی رائے یوں پیش کرتے ہیں:

"تذکرہ نسوانِ ہند اردو زبان میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد تذکرہ ہے جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستان کی تمام مایہ ناز اور ذی وقار خواتین کا ذکر ملتا ہے۔"[2]

یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوستان کی دقیانوسی سوسائٹی میں ملک ہند کی خواتین کے کارنامے لوگوں کے سامنے پوشیدہ تھے حالانکہ ملک ہند کی مستورات کے کارنامے اس قدر دلچسپ ہیں جو دنیا کے کسی بھی ممالک

---

[1] مرحوم بلخی صاحب، مقالہ قیوم خضر مخطوطہ

[2] فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

میں نہیں پائے جاتے خواہ وہ کسی بھی حیثیت سے ہوں لیکن اس کی حقیقت ہے کہ اپنے ملک کی قابل خواتین کے کارناموں اور حالات سے یکسر نا آشنا تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب میو (Meou) نے بدنام زمانہ کتاب مدر انڈیا (Mother India) لکھی اور ہندوستان کی خواتین کے کارناموں کو دنیا کی نظر میں گرانے کی کوشش کی تو ہم اس کا کوئی مناسب جواب نہ دے سکے۔ یہ صحیح ہے کہ لالہ لاجپت رائے نے اس کے جواب میں فادر انڈیا (Father India) کے نام سے ایک تصنیف قلمبند کی لیکن یہ کوئی مناسب اور سنجیدہ جواب نہ تھا۔ ڈاکٹر مظفر اقبال کا یہ خیال ہے کہ تذکرہ نسوان ہند مدر انڈیا (Mother India) کا مناسب اور سنجیدہ جواب ہے۔ موصوف (ڈاکٹر مظفر اقبال) یوں لکھتے ہیں:

ؔلہ "حقیقت یہ ہے کہ تذکرہ نسوانِ ہند مدر انڈیا کا نہایت ہی مناسب اور سنجیدہ اور وزن دار جواب ہے۔"

اپنے ملک کی خواتین کی تعلیم و تربیت سے بے توجہی برتی گئی ساتھ ہی ان کے کارناموں اور حالات کو منظر عام پر لانے میں بے اعتنائی کا سلوک کیا گیا، اول مصحفی نے اپنے تذکرہ "شعرائے ہند" کے آخر میں بطور ضمیمہ صرف پانچ شاعرات دولہن بیگم، حسینہ بیگم، گنا بیگم، زرینہ اور موتی کا ذکر کیا، مصحفی نے اپنا یہ تذکرہ ۱۲۰۹ھ میں لکھا، عبدالغفور خاں نساخ نے "سخن شعرا" مصحفی کی تقلید کی۔ انہوں نے ۴۸ شاعرات کے حالات اپنے تذکرے میں قلمبند کئے، انیسویں صدی کے آخر ربع میں شاعرات کے تذکرے قلمبند کئے جانے لگے۔ شاعرات کے تذکرے کی اشاعت کا سلسلہ "شمیم سخن" مؤلفہ عبدالحی بدایونی سے ہوتا ہے، یہ تذکرہ ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا، یہ تذکرہ اردو میں ہے فصل اول میں بازاری عورتوں کا ذکر ہے فصل دوم میں پردہ نشیں اور باعصمت خواتین کا حال ہے۔ ۴۴ شاعرات کے ذکر ملتے ہیں۔ ۱۸۸۱ء میں فصیح الدین میرٹھی نے اپنا تذکرہ "بہارستان ناز" لکھا اس میں لگ بھگ ۱۷۴ شاعرات کے حالات ملتے ہیں۔ "تذکرۂ نادر" مؤلفہ درگا پرشاد نادر اور مولوی عبدالباری آسی نے "تذکرۃ الخواتین" لکھا لیکن یہ سب شاعرات کے تذکرے ہیں۔

ؔلہ فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

عورتوں کا عام تذکرہ جس میں شاعرات کے علاوہ مختلف خواتین کے حالات درج کیے گئے ہیں

سنہ ۱۹۰۱ء میں مولوی عباس نے "مشاہیر نسواں" کے عنوان سے ایک تذکرہ قلمبند کیا۔ اس میں ہندوستان، ایران اور عرب کے علاوہ یورپ کی مشہور خواتین کے حالات لکھے گئے ہیں جس میں مختلف طبقات کی خواتین کے حالات پائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ مولوی عباس کا یہ تذکرہ ایک ضخیم اور معلوماتی ہے، بے شک اس تذکرے کے مؤلف نے کافی عرق ریزی کے بعد یہ تذکرہ لکھا۔ تذکرہ "مشاہیر نسواں" لگ بھگ ۶۵۶ صفحات پر محیط ہے۔ تذکرہ حروف تہجی کی بنیاد پر لکھا گیا ہے چنانچہ ہر طبقہ کی خواتین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

مؤلف تذکرہ نسوان ہند کے پیش نظر اپنے ملک کی خواتین کے کارناموں اور ان کی خدمات سے لہٰذا تذکرہ نگار نے اس تذکرہ کو پانچ حصوں میں منقسم کرکے قلمبند کیا، ہر طبقہ کی عورتوں کو ساتھ ہی ساتھ سبھوں کو ایک نظر سے دیکھا چنانچہ مصنف کی فراخدلی اور وسیع النظری کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس کا بھی کہ عورتوں کے حالات جمع کرنے کے سلسلے میں ان کی صلاحیتوں اور کارناموں کو مقدم سمجھا گیا ہے۔ یہی نہیں صرف ان کے ذاتی کرداروں کو مدنظر رکھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی طوائف بھی کسی فن کی ماہر ہے یا کسی خاص اعتبار سے قابل ذکر ہے تو اسے بھی اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مقدس مستورات کے بھی حالات درج کئے گئے ہیں، اس تصنیف کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد قدیم سے لے کر عہد حاضر تک تمام مشہور خواتین خواہ وہ کسی بھی فن میں ماہر ہوں سبھوں کو ایک نظر سے دیکھا گیا ہے یعنی اس کتاب میں اگر ہاجرہ سرور کا حال ہے تو اس کے ساتھ ساتھ لتا منگیشکر کا بھی، اگر بی بی کمالو کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ درگا بائی کا بھی۔

یہ تذکرہ بلخی صاحب مرحوم کا باضابطہ تحقیقی کارنامہ ہے۔ تحقیق و جستجو سے موصوف کو کتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ کتاب کی ترتیب کے بعد اگر کوئی نئی بات انہیں معلوم ہوئی تو پریس (Press) میں جاتے جاتے مقدمہ میں اس کی طرف اشارہ کر دیتے۔ مثال کے طور پر چندا ماہ لقا جن کا ذکر حصہ اول کے صفحہ ۲۰ پر درج ہے اس کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ اس شاعرہ کا دیوان لندن میں ہے اور صفحہ ۲۳ میں لکھا گیا ہے کہ اس دیوان کی کوئی نقل راقم کو دستیاب نہ ہو سکی لیکن اتفاقاً انہی دنوں بلخی صاحب مرحوم کو

حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا اور کتب خانہ آصفیہ میں اس دیوان کا ایک نسخہ سنہ ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ملا۔ چنانچہ موصوف نے اس کا بھی ذکر کر دیا۔

اس کتاب کے مقدمہ میں مرحوم نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ بعض خواتین ایسی بھی ہیں جن سے متعلق مزید تحقیقی ریسرچ اسکالروں کے لئے اچھے خاصے مواد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً جمیلہ جنہوں نے ۸ دواوین یادگار چھوڑے۔ یعنی اگر کوئی ریسرچ اسکالر اپنے تھیسس (Thesis) کا سبجکٹ بنائے تو اس کی طرف بھی گویا بلخی صاحب نے اشارہ کر دیا ہے۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کی تصنیف تذکرہ نسوانِ ہند ایک خالص تذکرہ ہے۔ لیکن بلخی صاحب کا تنقیدی شعور اس تذکرے میں ملتا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ آئندہ باب میں لیا جائے گا جہاں بلخی صاحب کی تنقید نگاری سے متعلق مفصل بحث کی جائے گی یہاں پر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اردو زبان کی مشہور شاعرہ چنداؔ کی شاعری کے متعلق بلخی صاحب نے تذکرہ نسوانِ ہند حصہ شاعرات صفحہ ۲۳ میں اپنی یوں رائے کا اظہار کیا ہے۔

[1] "چنداؔ کی شاعری اس کے ذاتی جذبات واردات کی ترجمان ہے، طرزِ بیان میں سادگی اور زبان میں سلاست پائی جاتی ہے۔"

چنداؔ کی شاعری کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے کتنی مدلل اور ناقدانہ رائے پیش کی۔

تذکرہ نسوانِ ہند صرف ایک تذکرہ ہی نہیں بلکہ اس میں تاریخی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ایک مؤرخ کی حیثیت سے بلخی صاحب مرحوم نے ان خواتین کے ذکر کے ضمن میں بعض غیر تاریخی واقعات کے پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر چتوڑ کے راجہ رتن سنگھ کی بیوی پدمنی کے متعلق جو قصہ عوام میں مشہور ہے وہ قطعی طور پر غلط ہے۔ یہ قصہ ملک محمد جائسی کی کتاب پدماوت میں شد و مد کے ساتھ مشہور ہے، بلخی صاحب مرحوم نے ان بے بنیاد واقعات کو کس دلیل کے ساتھ غلط ثابت کیا ہے (بحوالہ خزائن الفتوح مصنفہ امیر خسرو)

---

[1] تذکرہ نسوانِ ہند صفحہ ۲۳

"تاریخوں میں علاء الدین کا چتوڑ پر چڑھائی کرنا مذکور ہے لیکن عوام میں جو فسانہ مشہور ہے اس کا کوئی ذکر نہیں، یہ قصہ ملک محمد کی کتاب پدماوت میں شدومد کے ساتھ لکھا ہے، پدماوت ۹۴۷ھ کے قریب یعنی علاء الدین خلجی کے دو سو برس بعد لکھی گئی، امیر خسرو سلطان علاء الدین خلجی کے ساتھ فتح چتوڑ کے وقت موجود تھے لیکن انھوں نے خزائن الفتوح میں پدمنی کے متعلق کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے، لہٰذا زمانہ حال کے مورخ پدمنی کے عشق کو محض شاعرانہ تخیل سمجھتے ہیں"[1]

مختصر یہ کہ فصیح الدین بلخی مرحوم تذکرہ نسوانِ ہند کی روشنی میں صرف ایک تذکرہ نگار ہی نظر نہیں آتے بلکہ ایک مورخ، محقق اور ناقد بھی نظر آتے ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار:

ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے بلخی صاحب مرحوم کی دوسری تصنیف "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ہے، یہ تذکرہ ان کی وفات کے لگ بھگ سات ماہ کے بعد نیشنل بک سنٹر ڈالٹن گنج (National Book Centre) سے شائع ہوا۔ یہ کتاب ۱۶۹ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں اردو فارسی کے ہندو شعرائے کے حالات اور نمونۂ کلام ' ادوار کو مدنظر رکھ کر قلمبند کئے گئے ہیں، کتاب کا مقدمہ چار صفحات پر تذکرہ نگار کا سپردِ قلم کیا ہوا ہے اور جس کے آخر میں مصنف کا کتاب کے نام کے ساتھ پتہ ماہ، تاریخ اور سن دیا ہوا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم نے اپنے انتقال سے لگ بھگ ساڑھے سات ماہ قبل یعنی ۳۱ جولائی ۱۹۶۱ء کو سپرد قلم کیا تھا، مقدمہ سے قبل احوال ضروری کے عنوان سے نادم بلخی کی نوشتہ بلخی صاحب مرحوم کی مختصر سوانح حیات مع مرحوم کی مطبوعہ تصنیفات کا ذکر ہے۔

یہ تذکرہ تین ادوار میں منقسم ہے یعنی پہلے دور کے شعرائیں متقدمین ہندو شعرا کا ذکر ہے جو ۱۲۰۰ھ تک سخن طرازی کرتے تھے۔ اس دور کے شعرائیں فارسی یا ریختہ میں مشق سخن کرنے والوں

---

[1] تذکرہ نسوانِ ہند ص۹

کا ذکر ہے۔ اس دور کے شعرا میں نند لال گویا، راجہ رام نرائن موزوں اور اُجاگر چند الفت کا نام خصوصی طور پر لیا جا سکتا ہے، متقدمین دور میں ۲۰ شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا دور متوسطین شعرا بہار کا ہے، یہ دور ۱۲۰۱ھ سے لے کر ۱۳۰۰ھ تک کے وہ شعرا ہیں جو مشق سخن کرتے تھے۔ اس دور میں لگ بھگ ۶۱ شعرا کے حالات ملتے ہیں، اس دور کے ممتاز شعرا میں راجہ پیارے لال الفتی، کنور سنگھ، راجہ بہادر رحمتی اور رائے بیجناتھ پرشاد غنیمت کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔

تیسرا دور ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۸۰ھ تک کا ہے، ظاہرا یہ دور دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، دور کے آخر کے شعرا کے ضمن میں ایک الگ سرخی دور حاضر کے عنوان سے دی گئی ہے۔ دور آخر کے شعرا میں بابو جگیشر پرشاد خلش، اودھ کشور کشتہ گیاوی اور کامتا پرشاد ہوش کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس تذکرہ میں جتنے بھی ہندو شعرا کا ذکر ہے، وہ یا تو فارسی زبان کے ہیں یا اردو زبان کے یا دونوں زبانوں میں مشق سخن کرنے والے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں ان ہندو شعرا کا ذکر ہے جو فارسی یا اردو کے علاوہ کسی اور زبان یعنی میتھلی اور ہندی کے شاعر ہیں۔

اس تذکرے کو ترتیب دینے کا مقصد خود تذکرہ نگار نے اپنی کتاب کے مقدمے کے آخر میں یوں لکھا ہے:

"اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ صرف بہار میں فارسی اور اردو زبان و شاعری کی ترقی میں ہندوؤں نے کس کشادہ دلی سے حصہ لیا ہے اور اب تک لے رہے ہیں۔"

اور مقدمہ کے آخر میں مقدمہ نگار نے راسخ عظیم آبادی کا یہ شعر درج کیا ہے ؎

محو کیا نقش محبت ہو کہ اربابِ وفا
جتنے مٹتے گئے اتنے ہی نمودار ہوئے

اردو زبان و ادب اس دور میں کس کسمپرسی میں مبتلا ہے مرحوم سے بھی تا دم مرگ یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہی۔ شاید اس جذبہ کے تحت بلخی صاحب مرحوم سے یہ راسخ کا شعر لکھوا دیا۔

اس کتاب کے مقدمہ میں سب سے پہلے بلخی صاحب مرحوم نے بہار کے ہندوؤں کی علم دوستی اور

ادب نوازی کو سراہا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ علمی و ادبی حیثیتوں سے صوبہ بہار شروع ہی سے ہندوستان کی تاریخ میں نہایت ہی ممتاز رہا ہے۔

"چندر گپت کے زمانے میں کوشلیا ایک بڑا محقق اور مدبر گذرا ہے جس کو ہندوستان کا ارسطو کہا جاتا ہے اس کی مشہور تصنیف ارتھ شاستر موریہ خاندان کے راجاؤں دستور العمل رہی اور آج تک مورخ اس کو بڑی اہم کتاب جانتے ہیں، پاٹلی پترا کا ایک باشندہ پانیلنی جس کو دو ہزار برس سے زیادہ گذرے زبان کے اصول و قواعد کو منضبط کرنے کا موجد سمجھا جاتا ہے اور اس کی کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے دنیا میں پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے، اس طرح ملک کے مشہور مہندس، منجم آریہ بھٹ نامی نے علم ہندسہ اور نجوم پر ایک کتاب تصنیف کی جو ابتک قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔"

پاٹلی پترا کے راجاؤں میں سمندر گپتا ۳۳۰ء تا ۳۵۰ء فن سپہ گری کے علاوہ شاعری اور موسیقی میں کمال رکھتا تھا۔

"۴۷۰ء کے قریب قصبہ بہار شریف سے پانچ کوس دکھن نالندہ کی مشہور دانش گاہ قائم ہوئی جو ہندوستان سے لے کر چین تک مرکز تھا۔"

بلخی صاحب کا یہ مقدمہ نہایت ہی دلچسپ اور معلوماتی ہے اور اردو دشمنوں کے منہ پر طمانچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقدمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حد درجہ کد و کاوش اور تحقیق و جستجو کے ساتھ بلخی صاحب مرحوم کی وسیع النظری اور گہری علمیت نیز اپنے خاص وطن بہار سے ان کی انتہائی محبت کے نتیجہ میں یہ تذکرہ وجود پذیر ہوا، بلخی صاحب مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

لہ "بارہویں صدی ہجری میں جب فارسی کی جگہ اردو نے لی تو صوبوں کے ہندوؤں نے اردو ہی میں سخن طرازی کی اور ہندو شعراء اور رؤسا اپنے دولت کدوں میں دھوم دھام سے مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ ان میں راے بیجناتھ پرشاد غنیمت اور کنور سکھراج بہادر رحمتی

لہ تذکرہ ہندو شعرائے بہار

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار کو پڑھنے کے بعد اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ صوبہ بہار زبان و ادب کے سلسلے میں ہمیشہ عصبیت سے بالکل پاک رہا ہے کیونکہ اس تذکرے میں مجموعی طور پر ۱۲۹ شعرائے کے حالات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا گیا ہے، خواجہ عبدالرؤف عشرت نے ہندو شعراء کا ایک تذکرہ قلمبند کیا، اس تصنیف میں سارے ہندوستان کے ہندو شعرا کا تذکرہ ہے لیکن تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ فصیح الدین بلخی مرحوم نے ۱۲۹ شعرا بہار کے حالات و کلام مرتب کر دئے ہیں، ماسوا اس کے صاحب کتاب ایک مورخ اور تذکرہ نویس ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کا محقق اور ناقد بھی ہے چنانچہ اس میں صرف حالات و کلام ہی کو درج کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ہندو شعراء جن کی شاعری کے معاملے میں خصوصی حیثیت ہے، مثال کے طور پر نند لال گویا سے متعلق ص ۲۰ پر صاحب کتاب نے اپنی ناقدانہ رائے پیش کی ہے۔

"سارا دیوان عارفانہ کلام سے مملو نظر آتا ہے اور اشعار کی زبان بھی ایسی سلیس ہے کہ حافظ شیرازی کی تقلید معلوم ہوتی ہے"۔

محقق کی حیثیت سے فصیح الدین بلخی مرحوم نے کس قدر جستجو سے اس تذکرہ کی ترتیب میں ایمانداری سے کام لیا ہے اس کا اندازہ خصوصی طور پر قارئین کو پہلے باب میں ہوگا جس میں اجاگر چند الفت ص۱ تا ص۱۲ راجہ رام نرائن موزوں، نند لال گویا ص۱ تا ص۲ میں زیر بحث اور تحقیق طلب مسئلے کو کس طرح پیش کیا ہے اس کا اندازہ پڑھنے ہی سے ہوتا ہے ہر جگہ ماخذ اور حوالے دیئے گئے ہیں۔

اس تصنیف کو پڑھنے کے بعد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مرحوم مزید مواد سے نوازنا چاہتے تھے لیکن خرابی صحت اور موت کے مرض نے انہیں اس کی مہلت نہ دی یہاں تک کہ پوری کتاب کا مسودہ اوراق پر سلسلہ وار یکجا کیا گیا چنانچہ کتاب شائع ہوئی۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ مسلم شعرائے بہار مرتبہ حکیم سید احمد اللہ ندوی جو کراچی (پاکستان) سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی اور تذکرہ ہندو شعرائے بہار کو یکجا کر دیا جائے تو عہد قدیم سے لے کر عہد حاضر تک دونوں کتابیں مل کر صوبہ بہار کی فارسی اور اردو شاعری کی مکمل

تاریخ ہو جائے گی بشرطیکہ تذکرہ مسلم شعرائے بہار کو بھی ٹھیک اسی طرح ادوار پر منقسم کر دیا جائے۔ جس طرح فصیح الدین بلخی نے تذکرہ ہندو شعرائے بہار کو تین ادوار میں منقسم کر کے لکھا۔ لہٰذا یہ دونوں کتابیں ایسی ہیں جو ہر محقق کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار سے قبل خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ نے ایک تذکرہ اردو کے ہندو شعراء لکھا۔ یہ تذکرہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے کہ مؤلف کے پیشِ نظر ان ہندو شعراء کے کلام کو پیش کرنا ہے جو اردو شاعری میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ یہ تصنیف ۳۰×۲۰ کے سائز پر تقریباً ۱۶۰ صفحات پر چھپا ہے جس میں فاضل تذکرہ نگار نے غیر منقسم ہندوستان کے ہندو شعرا کا حال لکھا ہے۔ اس تذکرہ میں شعرا کے حالات زندگی بہت ہی مختصر ہیں۔ جا بجا شعرا کے ایک یا دو اشعار کو نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تذکرہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے لکھا گیا ہے۔ اس تذکرہ میں تقریباً ۵۰۰ شعراء کے حالات ملتے ہیں لہٰذا اس تذکرہ کی خامی یہ ہے کہ اس سے اس امر کا انکشاف نہیں ہوتا کہ کون سا شاعر کا تعلق کس دور سے ہے۔ اس کے برعکس بلخی صاحب مرحوم نے اپنے تذکرہ ہندو شعرائے بہار کو تین ادوار میں منقسم کر کے لکھا ہے یہ تذکرہ بہ نسبت خواجہ صاحب کے تذکرہ سے زیادہ معلوماتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنا تذکرہ ۱۹۳۱ء میں غیر منقسم ہندوستان میں لکھا تھا لیکن ایک اردو زبان و ادب کے سلسلے میں صوبہ بہار کتنا علاقائی عصبیت سے پاک ہے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ نے اپنی تصنیف "ہندو شعراء" کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی اردو زبان کی ترویج و ترقی میں نمایاں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ موصوف نے لکھا ہے:

[1] "آج جس قدر اردو زبان کی خدمت ہندو شعراء اور ہندو نثار مستقل طور سے کر رہے ہیں وہ قابلِ شکر گذاری ہے۔ میرؔ، سوداؔ کے دوش بدوش ہندو شعراء اردو زبان میں اپنے اپنے جوہر کمالات دکھاتے آئے ہیں اور اپنی مذہبی کتابوں کو اردو زبان میں نظم کر کے اردو کو ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ نثاروں نے نثر میں دادِ سخن دی

---

[1] دیباچہ تذکرہ ہندو شعراء

ناظموں نے نظم میں گہر فشانی کی، کیا ہم لالہ ٹیک چند بہار، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت بشن نرائن درد، منشی طوطا رام شایان، لالہ سری رام مصنف خمخانۂ جاوید، منشی جالپا پرشاد سابق اڈیٹر اودھ اخبار، مسٹر برج نرائن چکبست، منشی نوبت رائے نظر، منشی سرور جہان آبادی اور موجودہ دور میں راجہ راجایان، مہاراجہ بہادر کرشن پرشاد وزیر اعظم دکن، مسٹر تیج بہادر سپرو، ایم۔ اے۔ رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مسٹر منوہر لال زتشی، پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ، مسٹر منوہر لال ام۔ اے وزیر تعلیم پنجاب، سردار بھگوان سنگھ ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم پٹیالہ وغیرہ کے احسانات سے سبکدوش ہو سکتے ہیں جنھوں نے نظم و نثر اردو میں چار چاند لگائے اور مختلف زبان کے تراجم سے اردو میں وسعت پیدا کی اور بہت کچھ احسان اردو پر مدیران رسائل کا ہے جو درج ذیل ہے۔

(۱) مسٹر دیا نرائن نگم بی۔ اے اڈیٹر رسالہ زمانہ کانپور

(۲) مسٹر چنتامنی گھوش، سابق اڈیٹر رسالہ ادیب الہ آباد

(۳) منشی دیوان سنگھ مفتون اڈیٹر اخبار ریاست، دہلی

(۴) ماسٹر جگت سنگھ، پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

(۵) ڈاکٹر پورن سنگھ ہنر اڈیٹر رسالہ چمن امرتسر

(۶) مسٹر کنھیا لال ایم۔ اے اڈیٹر رسالہ چاند الہ آباد

(۷) مسٹر مانک چند ناز اڈیٹر پرتاپ لاہور

ناسپاسی ہوگی اگر ہم اس بارے میں منشی نول کشور بیکنٹھ باشی کا نام فراموش کر جائیں جنھوں نے اردو زبان میں تمام علوم کے ترجمے شائع کر کے اُردو کو علمی زبان بنایا، آج تک کسی انجمن کسی پریس، کسی ریاست نے اُردو کی اس قدر خدمت نہیں کی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے جس وقت اس تذکرہ کو ترتیب دینے کا خیال کیا ہوگا شاید ان کا ذہن خواجہ عبدالرؤف عشرت کی طرف مائل ہوگا کیونکہ دونوں تذکرہ نگار کا بنیادی موقف ایک ہی ہے۔

دونوں کا واحد مقصد ہندوؤں کی اردو دوستی اور ادب نوازی کو دکھلانا مقصود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ کے پیش نظر ہندوستان گیر نقطہ ہے اور بلخی صاحب مرحوم کا موقف صرف اپنے صوبہ تک ہے۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے اپنے تذکرہ کے مقدمہ میں یوں لکھا ہے:

[1] "بارہویں صدی ہجری میں جب فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تو صوبہ بہار کے ہندوؤں نے اردو ہی میں سخن طرازی کی اور ہندو شعرا اور رؤسا اپنے دولتکدوں میں دھوم دھام سے مشاعرے منعقد کرتے تھے۔ ان میں رائے بیجناتھ پرشاد اور کنور سکھراج بہادر خصوصی طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ ہندو شعرائے بہار اور خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ کا تذکرہ اردو کے ہندو شعرا کے تقابلی جائزہ کے بعد اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ دونوں تذکرہ نگاروں کا موقف ایک ہی ہے، دونوں کا واحد مقصد ہندوؤں کی اردو دوستی اور ادب نوازی ہے۔

ڈاکٹر منصور عالم اپنی تصنیف "بہار میں تذکرہ نگاری" میں بلخی صاحب مرحوم کے تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں۔

[2] "اس تذکرہ سے فصیح الدین بلخی کے مطالعہ، چھان بین، جستجو کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے دور قدیم و متوسط کے ہندو شعرا کے احوال متعدد تذکروں سے فراہم کئے ہیں اور زیادہ سے زیادہ معلومات دینے کی کوشش کی ہے۔ شعرائے متاخرین جو بلخی مرحوم کے عہد میں باحیات تھے۔ ان کے احوال و کلام خود انہیں سے حاصل کئے ہیں۔ اس لئے اس تذکرہ کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔"

آگے چل کر ڈاکٹر منصور عالم بلخی صاحب مرحوم کے تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

[3] "اپنی ان گوناگوں خصوصیات کی بنا پر تذکرہ ہندو شعرائے بہار شعرائے ریختہ کے تذکروں

---

[1] مقدمہ ہندو شعرائے بہار

[2] ملاحظہ ہو بہار میں تذکرہ نگاری مصنف ڈاکٹر منصور عالم صہ ۱۱۹ تا صہ ۱۲۰

[3] " " " " " صہ ۱۸۳

ہیں اہم مقام کا مستحق ہو جاتا ہے بالخصوص صوبہ بہار میں لکھے گئے تذکروں میں اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔"

مختصر یہ کہ فصیح الدین بلخی مرحوم کا تذکرہ "ہند و شعرائے بہار" ایک اہم اہمیت کا حامل ہے۔
بلخی صاحب مرحوم کے دونوں تذکروں (تذکرہ نسوان ہند اور تذکرہ ہند و شعرائے بہار) کا جائزہ لینے کے بعد اس امر کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے کہ موصوف فن تذکرہ نگاری سے بخوبی واقف تھے چنانچہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے تذکرہ نگار ہونے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

باب ہشتم

فصیح الدین بلخی بحیثیت ناقد

فصیح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی کارناموں کا جہاں تک تعلق ہے اس ضمن میں ان کے مشہور کتابچہ "انشادِ شاد" کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، بحیثیت ناقد بلخی صاحب نے کون سی روش اختیار کی، انہوں نے نو کلاسیکی تنقید کی طرف توجہ کی جس کی داغ بیل آزاد، حالی اور شبلی نے بھی اپنی تصانیف میں بنیادی طور پر زیادہ زور دیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مشرقی تنقیدی اصولوں کو مغرب سے زیادہ قریب تر لانے کی کوشش کی گئی تنقید کے اس دور کو نو کلاسکی کہا جاسکتا ہے' اس گروہ میں مولوی عبدالحق، علامہ سلیمان ندوی، چکبست، حافظ محمود شیرانی، عبدالقادر سروری، حامد حسن قادری وغیرہ جیسے ناقد ہیں، مغربی تنقید اور ادب کے مطالعہ کے باوجود مشرقی حدود کا خیال رکھا' دوسری طرف کچھ ایسے بھی ناقد ہیں جن کی تنقید کچھ حد تک تاثراتی دائرے میں رکھی جاسکتی ہے لیکن اپنے انفرادی نقطۂ نظر کی وجہ سے وہ تنقید کو کسی مخصوص روایات سے منسلک نہیں کرتے، نقادوں کے اس گروہ میں سلیم پانی پتی، امداد امام اثر، جعفر علی خاں اثر، مسعود حسن رضوی ادیب، عبدالقادر سروری، محی الدین قادری، اختر میرٹھی، اختر علی تلہری وغیرہ شامل ہیں، نو کلاسکی نقادوں کے گروہ میں بعض نے تحقیق کی طرف زیادہ توجہ دی لہذا ان کے تنقیدی خیالات یا نظریات کوئی امتیازی رنگ اختیار نہ کرسکے۔ فصیح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی شعور کے ضمن میں ڈاکٹر مظفر اقبال کی یوں رائے ہے۔

ؔ انہیں تنقید سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ اردو کے تنقیدی ادب سے انہیں مکمل واقفیت تھی۔ وہ قدیم طرز تنقید کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ ان کے تنقیدی رسالہ "انشاد شاد" میں بھی تنقید کا قدیم انداز ملتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ "ہماری شاعری" کو "اردو شاعری پر اک نظر" پر ترجیح دیتے تھے۔"

جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم نے فصیح الدین بلخی کی ناقدانہ صلاحیتوں کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

ؔ "نقد شعر و سخن کا انداز آپ کے کتابچہ "انشاد شاد" سے ہو سکتا ہے کہ استاد الشعراء شاد عظیم آبادی کی ظاہری و باطنی، لفظی و معنوی، معائب و محاسن کی جزوی گرفت کی گئی ہے ان کے معیار پر اساتذہ سخن کے کلام بھی نہیں اترتے تھے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی کارناموں میں انشاد شاد کا نام سرفہرست ہے۔ یہ کتابچہ ۳۲ صفحات کا ہے اور $\frac{20 \times 30}{16}$ کی تقطیع پر مشتمل ہے اور ۱۹۳۹ء میں یہ کتابچہ قومی پریس، بانکی پور پٹنہ سے شائع ہوا۔

اس رسالہ میں بلخی صاحب نے شاد کے کلام پر اصولی تنقیدی اور حقیقی تبصرہ کیا ہے اور شاد کے چیدہ اشعار کو زبان و فن کے معیار سے جانچ کر حقیقت کھول دی گئی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاد ایک ممتاز اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی شاعری کا لوہا منوا لیا تھا اور ان کی شاعری کی دھوم سارے ملک میں مچ رہی تھی، خود بلخی صاحب مرحوم کا اعتراف ہے۔

ؔ خاں بہادر سید محمد علی شاد نہ صرف صوبہ بہار کے بلکہ تمام ہندوستان کے شعرائیں شہرت

ؔ فصیح الدین بلخی مرحوم چند یادیں ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

ؔ فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت مقالہ سید عبدالرؤف ندوی مخطوطہ

ؔ ملاحظہ ہو انشاد شاد ص۲

رکھتے تھے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ زبان و بیان کی خامیاں شاؔد کے کلام میں بھری پڑی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاؔد کی زندگی میں ان کے نکتہ چینوں نے ان خامیوں کو خوب اُچھالا، اس ضمن میں شاؔد اور ایپنچ کے جھگڑوں کا نام قابل ذکر ہے۔ شاؔد کی وفات کے بعد جب یہ رسالہ شائع ہوا تو لوگوں نے شاؔد کے مخالفوں میں بلخی صاحب کا نام بھی درج کر لیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کو شاؔد کی ذات سے کوئی کد نہیں تھی۔

ڈاکٹر مظفر اقبال یوں لکھتے ہیں :

[1] "شاؔد کے انتقال کے بعد یہ رسالہ جب شائع ہوا تو لوگوں نے شاؔد کے مخالفوں میں ایک نام مخترمی فصیح الدین بلخی مرحوم کا بھی درج کر لیا۔ حالانکہ اس کو صداقت سے دور کا بھی تعلق نہیں، مرحوم کو شاؔد عظیم آبادی سے کسی قسم کی کد نہیں تھی اور نہ ہی رسالہ انشاد شاد اس جذبہ کے تحت لکھا گیا۔"

بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

[2] "یہاں شاؔد کے کلام پر حقیقی تنقید و تبصرہ منظور ہے، میں نہ ان کا حریف نہ حامی نہ مخالف اور نہ ان کے ذاتی حالات سے بحث کا سروکار رکھتا ہوں۔

کفر است در شریعت ما کینہ داشتن ٭ آئین ما سنت سینہ چوں آئینہ داشتن

دوسری جگہ تحریر فرمایا ہے :

[3] "اس تحریر سے کسی پر اعتراض کرنا مقصود نہیں، میں نے جو کچھ لکھا ہے ابنائے وطن کو زبان کی صحت و فصاحت کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے لکھا ہے۔ شاؔد اب زندہ نہیں اور حقیقتاً ان کے کلام سے کوئی بحث نہیں تھی لیکن غلط زبان کو میر انیؔس کی زبان کہہ کر تحسین و

---

[1] ملاحظہ ہو فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

[2] رسالہ انشاد شاد صفحہ ۲

[3] "سو رہو بھی خموش ہے" مقالہ پروفیسر عبدالمغنی مخطوطہ

داد آفریں کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے اور مشہور اہل زبان اور اساتذہ فن کے کلام کے مقابلہ میں شاد کے کلام کو پیش کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی شاد کو نہیں پہنچا۔

اردو کے مشہور ناقد پروفیسر عبدالمغنی کے مقالہ "سو وہ بھی خموش ہے" سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم شاد کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے ساتھ ہی ساتھ موصوف کی تنقیدی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے وہ لکھتے ہیں :

[۱] "بلخی صاحب مرحوم کی ذات بہار خصوصاً عظیم آباد میں ہونے والے ہر علمی کام کا مرجع تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ بلخی صاحب ایک زمانہ میں شاد کی علمی مخالفت کے سربراہوں میں رہ چکے ہیں چنانچہ فن شاعری میں شاد کے نقائص کو ایک رسالہ "انشاد شاد" میں بیان کر چکے ہیں، اس پس منظر میں میرا گمان تھا شاید وہ مجھ سے تعاون نہ کریں لیکن اس دور کے عظیم آباد میں شاد کے معاملات کی واقفیت بلخی صاحب سے زیادہ کسی کو حاصل نہ تھی لہٰذا ۱۹۵۹ء میں شاد کے رہگذر کا سراغ لگانے کے لئے بلخی صاحب کے در پر ہزار بار جانا پڑا .....
میرے سلام کرنے کے بعد مدعا پوچھا اس کے بعد بغیر کسی تامل اور تکلف کے گھنٹے بھر اس ولولے سے باتیں کرتے رہے جیسے یوم شاد کا انعقاد انہیں کی تجویز پر ہو رہا ہے آپ سمجھتے ہوں کہ شاد کے متعلق ان کے خیالات بدل گئے ہوں لیکن آپ کو سن کے حیرت ہونی چاہیے کہ یوم شاد کے متعلق مذکورہ تمام کرم فرمائیوں کے ساتھ بلخی صاحب نے ساتھ اہتمام کے مجھے اپنا کتابچہ "انشاد شاد" اس تمہید کے ساتھ دیا کہ شاد کی شاعرانہ عظمت مسلم لیکن ان کے نقائص کو بھی پیش کرنا چاہئے تاکہ ان کی پوری شخصیت دیانتداری کے ساتھ سامنے آئے ورنہ علم و تحقیق کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔"

اس طویل اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاد عظیم آبادی کی شاعری سے بلخی صاحب سرے سے منکر نہیں تھے اور ان کی شاعری کی جو خوبیاں تھیں اس کے وہ قائل تھے۔

---

[۱] "سو وہ بھی خموش ہے" مقالہ پروفیسر عبدالمغنی مخطوطہ

اس رسالہ کی تصنیف کے وقت بلخی صاحب کے پیش نظر کلام شاد مطبوعہ ۱۹۲۳ء اور میخانۂ الہام مطبوعہ ۱۹۳۹ء اور وہ اشعار تھے جو شاد کی وفات کے بعد ان کے ایک عزیز شاگرد نے رسالہ "ندیم" گیا میں شائع کرائے تھے۔ "کلام شاد" شاد کی زندگی میں شائع ہوا تھا اس میں رسالہ "الناظر" اگست ۱۹۲۳ء کا تبصرہ موجود تھا بلخی صاحب مرحوم نے 'انشاد شاد' کے ابتدائی اوراق میں اس گرانقدر تبصرہ کا ذکر کیا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے۔

لہ "چونکہ اس دیوان پر ایک اہل زبان کی تنقید موجود ہے اس لیے فی الحال نئی تنقید لکھنا فضول سمجھکر سابق تنقید کے اعادہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس کتابچہ میں حسب ذیل عنوانات کو پیش کر کے شاد کے اشعار کے نقائص کا جائزہ لیا گیا ہے۔ عامیانہ مذاق سوقیانہ انداز بیان: زبان و محاورات کی غلطیاں، تناقص، شتر گربہ، حشو و زوائد، ردیف کا چسپاں نہ ہونا، زبان و فن سے ناآشنا ہونا، سرقہ کلام، عروج کے عوض ہبوط، اصلاح و ترمیم۔

رسالہ "انشاد شاد" کی اشاعت کے بعد شاد کے ایک عزیز شاگرد جناب حمید عظیم آبادی نے اپنے استاد کے کلام کے اعتراض کے جواب میں اپنا ایک کتابچہ "کھلا یہ چیلنج" لکھا، راقم نے عصر فصیح الدین بلخی میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، رسالہ "کھلا یہ چیلنج" "انشاد شاد" کا معقول اور موثر جواب نہیں۔ بلخی صاحب مرحوم کے جو اعتراضات کلام شاد پر رسالہ "انشاد شاد" میں ملتے ہیں وہ اپنی جگہ مناسب اور درست ہیں۔

رسالہ "کھلا یہ چیلنج" میں حمید صاحب نے بلخی صاحب کے اعتراضات کو صرف الفاظ کی اُلٹ پھیر میں گم کر دیا ہے بلکہ اس میں طعن و تشنیع ہر جگہ نظر آتا ہے۔ رسالہ کی ابتدا میں حمید صاحب نے یہ لکھا ہے کہ بلخی صاحب اس رسالہ کی صرف ترتیب دینے والوں میں ہیں، حمید صاحب نے لکھا ہے۔

لہ "کھلا یہ چیلنج" ص۲ تا ص۳

[1] "جب رسالہ فصیح صاحب کے نام سے شائع ہوا تو اس میں نقاب[2] پوش کی شرکت کس دلیل کی بنا پر سمجھی گئی۔ مرتب کا لفظ بتا رہا ہے کہ فصیح صاحب صرف ترتیب دینے والوں میں ہیں اور اس رسالہ کا مصنف یا مؤلف کوئی اور ہی ہے۔"

حمید صاحب نے اپنے رسالہ "کھلا چیلنج" میں یہ لکھا ہے کہ بلخی صاحب اردو زبان سے ناواقف ہیں، نیز فن عروض کا انہیں ذرا بھی علم نہ تھا، انہوں نے لکھا ہے۔

[1] آپ کیا جانیں اردو کیا ہے، عروض کس چڑیا کا نام ہے

اس طرح رسالہ "کھلا چیلنج" جا بجا طعن و نشتر کے الفاظ موجود ہیں۔

بلخی صاحب نے[3] "انشاد شاد" میں لکھا ہے۔

[4] میں فن کے معیار سے جانچ کر دکھانا چاہتا ہوں کہ فنی حیثیت سے شاد کا کلام کیسا ہے۔

بلخی صاحب نے کلام شاد کے نقائص کی کئی سرخیاں قائم کی ہیں۔ انہوں نے حسب ذیل میں عامیانہ مذاق اور سوقیانہ انداز بیان کے نقائص کو ظاہر کیا ہے۔

شاد کا شعر: [5] حیرت زدہ ہوں کیوں نہ جوانی سے چھوٹ کے
سب نقد مال لے گئی کمبخت لوٹ کے

تبصرہ: مصرع ثانی میں ابتذال کا اشتباہ ہے ایسے مصرعے صاحب قران (لکھنو کے فحش گو شاعر) کے دیوان کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

شاد کا شعر: خرام ناز میں کہتا ہے ڈورا ان کی گردن کا
نہیں اٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ گردن کا

---

[1] "کھلا چیلنج" ص ۲ تا ۳

[2] نقاب پوش سے مراد اکبر مبارک عظیم آبادی کی ذات ہے۔

[3] بلخی صاحب کا خود نوشتہ "انشاد شاد" آج بھی محفوظ ہے۔ م۔ ب

[4،5] انشاد شاد ص ۸

تبصرہ: لکھنؤ میں جب ذوقِ شاعری پست ہوا تو شعرا ایسے ہی شعر کہنے لگے تھے۔

زبان و محاورات کی غلطیاں

شاد کا شعر: لکھے ہیں سخت کلامی کے نرم نرم جواب
قلم کی نوک سے ہم نے پہاڑ ٹیلے ہیں

تبصرہ: ٹیلے صحیح نہیں ٹالنے کے عوض ٹیلنا کہہ دیا اور اکیلے اور جھیلے کا قافیہ قرار دیا ہے۔

شاد کا شعر: نکل کے روح ڈنوا ڈول ہو نجائے کہیں
ہزار حیف نہ دنیا کے ہیں نہ دین کے ہم

فصحا کی زبان سے ڈانوا ڈول البتہ سنا گیا ہے، ڈنوا ڈول بحذف اول الف نظر سے نہیں گذرا شاید عالم تذبذب میں نظم ہو گیا ہے" بھٹکتی تم بھی ڈنواں ڈول نیت اپنی رہنے دو" (داغ)

شاد کا شعر: ترے فراق کے صدمے جو بڑھنے لگتے ہیں
نیا خیال نیا دھیان گڑھنے لگتے ہیں

تبصرہ: بڑھنے کا قافیہ گڑھنے غیر فصیح ہے اہل زبان گھڑنا بولتے ہیں اس کا قافیہ لڑنا، اور پڑنا وغیرہ آتا ہے، علاوہ اس کے بات گڑھنا بولتے ہیں۔ خیال اور دھیان گڑھنا مہمل اور خلاف محاورہ ہے۔

تناقص[1]

تناقص، کی سرخی کے تحت بلخی صاحب نے لکھا۔

زبان کی خامی اور طرز ادا کی خرابی سے بعض اشعار کے مضامین میں تناقص کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

شاد کا شعر: بہت سے جام تھے پیر مغاں کے پیش نگاہ
کسی کو نیست کیا اور کسی کو مست کیا

---

[1] "انشاد شاد" ص ۹

تبصرہ: نیست کرنا فنا کرنے کے معنی اور ہست کرنا وجود میں لانے کے معنی میں بولتے ہیں لیکن جو شئے پیش نگاہ ہو اس کا وجود ثابت ہے اس کے لئے ہست کرنا صحیح نہیں کیونکہ ایک ہی شئے کو بیک وقت موجود اور معدوم نہیں کہہ سکتے۔

شتر گربہ

اسی عنوان کے تحت بلخی صاحب نے شاد کے ضمن میں یوں لکھا ہے۔

تبصرہ: ضمائر کی عدم مطابقت کا حال کلام شاد کے تبصرہ میں مذکور ہو چکا ہے، میخانۂ الہام کے دو شعر بھی ملاحظہ ہوں۔

مرے یاران رفتہ کھو گئے اے شاد کچھ ایسے	کہ اب ان مٹنے والوں کی ہمیں تربت نہیں ملتی
مجھی کو اک نہیں سارے جہاں کو ہے یہ گلہ	کہ تیرے ہوتے غم بیشمار ہم دیکھیں

پہلے شعر میں مرے اور ہمیں اور دوسرے شعر میں مجھی کو اور ہم کیوں ہے؟ اور مجھی کو اک نہیں کی جگہ اک تجھی کو نہیں فصیح ہوتا۔

۲؎ حشو و زوائد

حشو و زوائد سے مصرع کا وزن پورا کرنا قادر الکلامی کے کس قدر خلاف ہے، اہل فن کا اس پر اتفاق ہے کہ شاعر کامل کے کلام میں حشو قبیح نہیں ہوتا، شاد کے ہاں یہ عیب کثرت سے پایا جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں، ان میں نشان دادہ الفاظ محض حشو ہیں بلکہ بعض شعر میں حشو الفاظ سے معنی میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔

شاد کا شعر: مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

تبصرہ: ایسے میں اور ابھی دونوں فرمایا ہے ان میں سے ایک حشو ہے۔

۱؎ "انشاد شاد" صفحہ ۱۱

۲؎ " " صفحہ ۱۲

۱ ردیف کا چسپاں نہ ہونا

ایک خوشگو شاعر اپنی ردیف کو اس طرح چمکاتا ہے کہ شعر میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن شادؔ اپنی ردیف کو سنبھال نہیں سکتے۔ کہیں ردیف محض بیکار ہے کہیں غلط ہے کہیں کمزور ہے اور کہیں چسپاں نہیں۔

شادؔ کا شعر: آئے تھے دم نزع وہ اے روز قیامت
اس روز زیارت ہوئی یا آج کی تاریخ

تبصرہ: کی تاریخ حشو قبیح ہے اس سے مصرعہ ثانی مہمل ہو گیا۔

شادؔ کا شعر: اسی کے واسطے جنتا پھروں تنکے زمانے میں
کڑکتی گر پڑے بجلی الٰہی آشیانے میں

تبصرہ: مصرعہ ثانی کی ردیف غلط ہے آشیانے پر بجلی گر پڑے کہنا چاہئے تھا روزمرہ جاننے والا کبھی ایسی غلطی نہیں کرتا۔

شادؔ کا شعر: کیوں کر مٹے گی دل سے کدورت بتائیے
مانا کہ بخش دیں وہ ہمارے قصور تک

تبصرہ: ردیف تک حشو کے طور پر ہے یا نہایت کمزور ہے۔

۲ زبان دانی سے ناآشنا ہونا

بلخی صاحب کا خیال ہے کہ شادؔ کے کلام میں زبان و فن کی بے شمار غلطیاں ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ ان کو زبان کی صفائی کی طرف کوئی رجحان نہ تھا یہی وجہ ہے کہ بالعموم ان کے کلام سے فصاحت کوسوں دور نظر آتی ہے۔

شادؔ کا شعر: کھلا ہے بام پر جوڑا کسی کے جعد مشکیں کا
کہ مجھ تک بوئے گیسو کارواں در کارواں پہنچی

تبصرہ: بام پر جوڑا وجعد و گیسو، کارواں در کارواں محض الفاظ ہیں، الفاظ میں حقیقتاً شاعر نے وحید الٰہ آبادی کے شعر کو غارت کیا ہے، قادر الکلام شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی کے

---

۱ انشاد شاد ص۱۲ ، ۱۳ ۲ افشاد شاد ص۱۴

ساتھ نظم کیا ہے، مقابلہ کرنے سے ناقص و کامل کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

معطر ہے اسی کوچہ کی صورت اپنا صحرا بھی
کہاں کھولی ہیں زلفیں یار نے خوشبو کہاں تک ہے

شاد کا شعر: آنکھوں سے سوجھنا بھی گیا انتظار میں
شیشے خراب ہو گئے اس دوربین کے

تبصرہ: آنکھوں سے سوجھنا بھی گیا کہنے سے بھدا پن ظاہر ہوتا ہے۔ کسی مشاق شاعر نے مصرع اول کو سنکر یوں اصلاح دی۔

پتھرا گئی ہیں آنکھیں مری انتظار میں
شیشے خراب ہو گئے اس دوربین کے

شاد کا شعر: رہے ہر حال میں جو مطمئن جینا اسی کا ہے
پلائے جس کو خود پیر مغاں پینا اسی کا ہے

تبصرہ: مطلع کے دونوں مصرعے دولخت ہیں، ان میں جو ربط ہونا چاہئے وہ مفقود ہے۔

سرقہ کلام[1]

سرقہ کلام کے ضمن میں بلخی صاحب کا خیال ہے کہ شاد کے یہاں یہ عیب نمایاں طور پر ہے، ایسی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

اپنی ہستی کو غم و رنج و مصیبت سمجھو	موت کی قید لگادی۔ ہے غنیمت سمجھو	(شاد)
اتنی سی زیست پہ اللہ مصیبت یہ ہے	موت کی قید لگادی ہے غنیمت یہ ہے	(میر تقی میر)
غضب ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا	زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا	(شاد)
کرے کیا کہ انسان مجبور ہے	زمیں سخت ہے آسماں دور ہے	(مثنوی شوق)

تبصرہ: مضمون اڑا لینے پر بھی شعر مہمل ہو گیا، فلک تو دور ہے اس کے لئے ہو جانا کیا؟

---

[1] انشاد شاد صہ ۱۸

؎ جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا   سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا (شاد)

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا   بیٹھے بیٹھے ہوئے ہنستا ہے دوانہ ترا

(شاہ نور الحق تپاں)

۱؎ عروج کے عوض ہبوط

شاد کے کلام میں جہاں تک زبان کا تعلق ہے بعض ایسے نمونے بھی ملتے ہیں جو ان کے زمانے سے بہت پہلے متروک ہو چکے تھے۔ اس کے متعلق الناظر نے لکھا ہے کہ کہیں کہیں حیدر آباد کی قدیم اردو کا بھی لطف مل جاتا ہے لہٰذا دیوان میخانۂ الہام میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو۔

ہار جن کلیوں پہ تھیں پرچھائیاں   اے صبا پہلے وہی مرجھائیاں

شاد بیماروں کا بچنا ہے محال   ہجر کی راتیں جو ابکے آئیاں

اصلاح و ترمیم

شاد کے ایک لائق شاگرد لکھتے ہیں کہ شاد مرحوم اپنے دیوان کی غزلیات کی ترتیب و تدوین میں عمر بھر منہمک رہے۔ ہر غزل پہ بار بار نظر ثانی فرماتے اور ہر ہر شعر پر وقتاً فوقتاً اصلاح و ترمیم کرتے رہتے تھے۔

اس تحریر کا جواب بلخی صاحب نے یوں دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

۲؎ اصلاح و ترمیم ہر ایک شاعر کا کام نہیں اس کے لئے استادِ فن کا ہونا ضروری ہے اور جس شاعر کے کلام میں زبان کی خامی، بندش کی سُستی، روزمرّہ اور محاورات کی غلطیاں اور ہر قسم کے عیوب موجود ہوں اس کو استادِ فن نہیں کہہ سکتے۔ شاد نے اپنے کلام کی جو اصلاح و ترمیم کی ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عادتاً اکثر یا غلط کہا کرتے تھے' بعض اصلاح و ترمیم کے متعلق تلامذہ بھی معترف

۱؎، ۲؎ انشاد شاد صہ ۱۹، صہ ۲۲

ہیں کہ ان سے شعر میں کوئی ترقی نہ ہوئی.... ولی صاحب نے اپنے استاد کے شعر پہ جو اصلاح دی ہے یقیناً قابل داد ہے۔

شاد کا اصل شعر: بے خودی دل کا پتہ شب سے نہیں پھینک آیا میں کہاں کس کو دیا

اصلاح: دل کی پروا تک نہیں اے بے خودی کیا کیا پھینکا کہاں، کس کو دیا

ترتیب: بے خودی دل کا پتہ شب سے نہیں کیا کیا پھینکا کہاں، کس کو دیا

تبصرہ: غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرعہ اول "شب سے" کہنے کی کوئی حاجت نہیں تھی، یہ ٹکڑا وزن پورا کرنے کے لئے ٹھونس دیا گیا ہے اور اصلاح شدہ مصرعہ آخر میں پہلی کاف کے قاعدے سے جچہ کاف کا التزام ہے جس سے تلفظ میں گرانی پیدا ہوگئی ہے، شاد کو مضمون کی جھلک نظر آئی لیکن طبیعت رو براہ نہ تھی، اور زبان پر قدرت نہ تھی، زبان اُلجھ کر رہ گئی، دیکھئے اسی قسم کے مضمون کو کہنے والا کس صفائی سے نظم کرتا ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں مجھ کو دیر سے انتظار ہے اپنا (میر)

کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے معلوم نہیں کدھر گئے ہم (خواجہ درد)

کچھ بھی یاد ہے کہاں ہوا گم کس سے پوچھیں سراغ دل کا

(عشق عظیم آبادی)

اس رسالہ کی آخری تین سرخیاں، اول سرخی "شاعری کا اشتہار اور شاگردوں کی پکار" دوئم "شاد کا اختراغ و تصرف"، سوئم "مقدمہ نگار کی تلاش" ہے۔

شاعری کا اشتہار اور شاگردوں کی پکار

اول الذکر سرخی کے تحت بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے۔

شاگردوں کا پروپگنڈہ کسی شاعر کو شاعر کامل یا استاد فن نہیں بنا سکتا اس کے برعکس شاد عظیم آبادی نے حلقہ تلامذہ کو وسیع بنانے کی انتھک کوشش کی یہاں تک کہ شاد غزلیں کہہ کر اپنے شاگردوں کو مشاعرے میں پڑھنے کے لئے دیتے تھے جس کا اعتراف حمید صاحب اور دلی کا کوی نے بھی کیا ہے، بعض خوددار اشخاص جو وقتی اثر کے تحت حلقہ تلمذ میں داخل ہوتے تھے اصلاحوں کو دیکھ کر

ہمیشہ کے لئے منحرف ہو جاتے ۔ شائق، موج، اور واعظ کا نام سرفہرست ہے۔ مولوی واعظ الدین عرف بلٹو میاں کے متعلق یہ شعر مشہور ہے۔

سے دفتر سے شاعری کے تیرا نام کٹ گیا شاگرد ہو کے شاد کا بلٹو پلٹ گیا

شاد کا اختراع و تصرف

شاد کے کلام میں زبان وفن کی بے شمار غلطیاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں، ان پر سخت اعتراض ہوئے، ان کی وفات کے بعد بھی ان کے شاگردان جواب دینے سے عاجز رہتے تھے۔ چنانچہ شاد کے عزیز شاگرد حمید عظیم آبادی نے شاد کی متروکات کی جائز الاستعمال کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کی۔

بلخی صاحب کا یہ خیال ہے کہ شاد کو اختراع و تصرف کا کوئی حق حاصل نہ تھا، اردو کا رواج عظیم آباد کے ایک محلہ یا حلقۂ تلامذہ شاد تک محدود نہیں یہ وہ زبان ہے جو ہندوستان کے ہر حصہ میں بولی جاتی ہے۔ اختراع و تصرف ایسے اہل زبان کو زیب دیتا ہے جس کی زبان سارے ملک میں مستند تسلیم کرلی گئی ہو۔ ہر کس وناکس کا اپنے آپ کو اہل زبان اور زبان کا محقق تصور کرنا نادانی نہیں تو کیا ہے۔

مقدمہ نگار کی تلاش

میخانۂ الہام کے مرتب جناب حمید عظیم آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد سے گذارش کی۔ لیکن انہوں نے خط کا جواب تک نہیں دیا۔ پھر سلیمان ندوی سے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے بھی دھیان نہ دیا۔ آخر میں نیاز فتحپوری سے میخانۂ الہام کا مقدمہ سپرد قلم کرنے کی استدعا کی گئی لیکن انہوں نے اس سفارش کو التوا میں ڈال دیا۔

اس رسالہ کے اختتام میں بلخی صاحب نے شاد کی شاعری کے متعلق اپنی رائے یوں پیش کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے

لہ "شاد ایک اوسط درجہ کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کو استاد فن اور میر انیس کا ہمسر کہنا بلاغت میں غالب سے برتر اور سلاست زبان میں داغ سے بہتر قرار دینا سراسر لغو ومضحکہ خیز بات ہے۔"

لہ انشاد شاد ص۱۴۲

مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاد کے کلام میں زبان و فن کی بے شمار غلطیاں موجود ہیں۔ بلخی صاحب کے اعتراضات اپنی جگہ پر بالکل درست ہیں کیونکہ عام نگاہوں سے یہ نقائص پوشیدہ تھے۔ ڈاکٹر مظفر اقبال یوں لکھتے ہیں۔

لے "بلخی صاحب مرحوم کو ژرف نگاہی اور نکتہ آفرینی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان کی باریک بین نگاہ سے یہ عیوب پوشیدہ نہ رہ سکے۔"

اس کے برعکس پروفیسر ابوذر عثمانی کے خیالات رسالہ انشاد شاد کے متعلق اچھے نہیں، ان کا یہ خیال ہے۔

لے "بلخی صاحب نے کوشش کی ہے کہ وہ شاد کے کلام کو فن کے معیار سے جانچیں اور یہ دکھائیں کہ فنی حیثیت سے شاد کا کلام کیا ہے لیکن انھوں نے اپنے معیار فن کو اس قدر محدود کر لیا ہے کہ نہ تو وہ شاد کے کلام کی روح تک پہنچ سکے نہ اس کے محاسن کو ہی دیکھ پائے، ان کی نظر صرف چند الفاظ و محاورات کے دام میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔"

عثمانی صاحب رسالہ "انشاد شاد" کی اہمیت کو کچھ حد تک ضرور دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

سے "یہ کتاب اگرچہ بلخی صاحب کا کوئی وقیع کارنامہ نہیں لیکن ایک بے لاگ پیشکش ضرور ہے اور اس لحاظ سے قابل داد ہے۔"

مختصر یہ کہ شاد کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ساتھ ہی شاد کا صحیح مقام تعین کرنے کے لئے "انشاد شاد" کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ بحیثیت ناقد بلخی صاحب کا تعلق اردو تنقید کے قدیم دبستان سے تھا وہ نو کلاسکی تنقید کے پیرو اور مداح تھے۔

لے فصیح الدین بلخی مرحوم کی چار تصنیفات مخطوط

لے بہار میں اردو تنقید کا ارتقا، رسالہ صنم، بہار نمبر

سے ،، ،، ،، ،، ،، ،،

فصیح الدین بلخی مرحوم کی دیگر تصنیفوں میں "تذکرہ نسوانِ ہند" اور "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" کا نام سرفہرست ہے، ان دونوں تصنیفوں کا جہاں تک تعلق ہے یہ بلخی صاحب کا ایک خالص تحقیقی کارنامہ ہے لیکن ان کی تنقید کا تاثراتی انداز ہر جگہ موجود ہے" تذکرہ نسوان ہند" میں جہاں بلخی صاحب نے کسی معروف شاعرہ کی شاعری کا ذکر کیا ہے وہاں ان کے تنقیدی جملے مل جاتے ہیں، مثال کے طور پر دکن کی مشہور شاعرہ چندا مہ لقا کی شاعری کے متعلق بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے:

لہ "چندا کی شاعری اس کے ذاتی جذبات و واردات کی ترجمانی ہے، طرز بیان میں سادگی اور انداز بیان میں سلاست پائی جاتی ہے۔"

بہار کی مشہور شاعرہ جمیلہ کی شاعری کے ضمن میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

لہ "پُرگوئی اور قادر الکلامی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سات دیوان مرتب کرکے یادگار چھوڑا۔ شاعرات کا کیا ذکر، شاعروں میں بھی کم ایسے ہیں جن کے کلام کی تعداد اس حد تک پہنچی ہو..... ان کے اشعار کی زبان سلیس اور ابتذال سے بالکل پاک ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کا تنقیدی معیار کیا تھا۔ ان کی تنقید میں نہ کسی کی تضحیک ملتی ہے اور نہ کسی کی تعریف، تنقید کا اصل معیار پرکھنا ہوتا ہے اور وہ اپنی تنقید میں تاثراتی انداز ہر جگہ برقرار رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید جدید سے بالکل مطمئن نہ تھے۔ ساتھ ہی ساتھ تنقید کو کسی دبستان سے منسلک کرنے کے بھی قائل نہ تھے۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کا دوسرا تذکرہ "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ہے اس میں فاضل تذکرہ نگار نے تاثراتی تنقید کو برقرار رکھا ہے، جس شاعر کے کلام سے بحث کی گئی ہے وہاں تنقیدی جملے یا فقرے ہمیں مل جاتے ہیں، مثال کے طور پر فارسی زبان کے مشہور شاعر نند لال گویا کی شاعری کے

لہ تذکرہ نسوانِ ہند صـ ۲۳

لہ " " صـ ۱۳۱

متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

سلہ "سارا دیوان عارفانہ کلام سے مملو نظر آتا ہے اور اشعار کی زبان ایسی سلیس ہے کہ حافظ شیرازی کی تقلید معلوم ہوتی ہے"۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کا نثری میدان مقالہ نویسی یا مضمون نگاری بھی ہے۔ اس کی تفصیلی بحث آئندہ کے ابواب میں کی جائے گی۔ سر دست ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کی مقالہ نویسی میں بھی تنقیدی عناصر بدرجۂ اتم موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مقالوں میں تنقیدی جملے مل جاتے ہیں، راسخ عظیم آبادی کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

سلہ "ابتذال مضامین سے ان کا کلام بالکل پاک ہے، کنگھی، چوٹی، بوس و کنار اور اس قسم کے بھدے مضامین سے ان کا کلام بالکل پاک ہے بلکہ حق یہ ہے کہ کلام کی پاکیزگی میں راسخ اپنے استاد میر سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

علامہ شوق نیموی عظیم آبادی کی شاعری کے ضمن میں بلخی صاحب مرحوم کے یہ تاثرات ہیں۔

سلہ "شوق نیموی کی شاعری میں لکھنو کا رنگ غالب تھا۔ وہ شاعر سے زیادہ استاد فن تھے، کلام ہر طرح بے عیب اور نوک پلک سے درست ہوتا تھا اور اس کی طرف ان کی توجہ زیادہ مبذول رہتی تھی۔ شعر میں جذبات کم ہوتے تھے اور خود بھی ان کو احساس تھا۔

ضیا عظیم آبادی کی شاعری کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے اپنا خیال یوں پیش کیا ہے۔

سلہ "ان کا کلام ذاتی جذبات و قلبی واردات کا آئینہ دار ہے۔

راز بلخی کی شاعری کے متعلق بلخی صاحب کے یہ تاثرات ہیں۔

سلہ تذکرہ ہندو شعرائے بہار ص ۳۔

سلہ راسخ عظیم آبادی مقالہ فصیح الدین مرحوم رسالہ صنم بہار نمبر

سلہ شوق نیموی " " رسالہ اشارہ پٹنہ

سلہ عظیم آباد کا ایک جواں مرگ شاعر رسالہ تہذیب پٹنہ

[1] "اردو میں مشکل زمین ایجاد کرتے تھے اور طبع آزمائی کرتے تھے۔"

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم کا شمار نو کلاسکی نقادوں میں ہو سکتا ہے جس کی داغ بیل حالیؔ، شبلیؔ اور آزادؔ نے ڈالی تھی، صوبہ بہار کے ناقدوں کے اس گروہ میں امداد امام اثرؔ، عبدالغفور شہبازؔ، علامہ شوق نیموی، سید سلیمان ندوی، عزیزالدین بلخی مرحوم اور فصیح الدین بلخی کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔

---

[1] تاریخ شعرائے بہار۔

باب نہم

فصیح الدین بلخی مرحوم بہ حیثیت مضمون نگار

فصیح الدین بلخی مرحوم نے مضمون نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے ۔ چنانچہ ان کے مضامین ہند و پاک کے مشہور جرائد میں اکثر شائع ہوتے تھے ، بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نگاری کے ضمن میں ڈاکٹر مظفر اقبال یوں لکھتے ہیں :

[1] " بلخی صاحب مضمون نگاری کے مقابلہ میں کتب نویسی پر زیادہ زور دیتے تھے ۔ ایسی بات نہیں کہ انھوں نے مضامین یا مقالے نہیں لکھے ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے کافی تعداد میں مقالے لکھے ہیں جو ہندوستان کے موثر ادبی جرائد میں شائع ہوئے ہیں لیکن وہ باتوں کو زیادہ تفصیل سے پیش کرنے کے قائل تھے اس لئے ہر کسی موضوع پر مکمل کتاب لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے ۔"

راقم کی تحقیق کے مطابق بلخی صاحب کا پہلا مضمون "میر د بہار میں مسلمانوں کی آمد" رسالہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ، اس مضمون کی اشاعت کے بعد بلخی صاحب مرحوم ہندوستان کے طول و عرض میں مورخ مشہور ہوئے ۔ اس مضمون کو بلخی صاحب مرحوم نے کتبوں اور سکوں کے حوالے سے لکھا تھا ۔ اس مضمون کی اہمیت کے سلسلہ میں سہیل عظیم آبادی مرحوم نے اپنے مقالہ

---

[1] فصیح الدین بلخی مرحوم چند یادیں مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

"بلخی صاحب" میں یوں لکھا ہے۔

لہ "میں سید بلخی صاحب مرحوم کے نام سے اس وقت آشنا ہوا جب ندیم کا پہلا بہار نمبر شائع ہوا۔ ندیم کا یہ بہار نمبر بہت سے بہاری باکمالوں کو متعارف کرانے کا سبب بنا۔ مرحوم نے کتبوں اور سکوں کے حوالوں سے یہ مضمون لکھا تھا۔ مجھے مضمون بے حد پسند آیا۔ میں نے انجم صاحب کو خط لکھا تو اس مضمون کا سب سے پہلے ذکر کیا، اس مضمون میں بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے۔

لہ "منیر کے مخدوم زادوں کے سنگینوں سے پایا جاتا ہے کہ ۵۲۶ھ ۱۱۸۰ء میں حضرت تاج فقیہہ اور قطب سالار نے راجہ منیر کو شکست دے کر منیر پر قبضہ کیا۔ اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے ان میں پچیس آدمیوں کے نام بھی سنگینوں میں مذکور ہیں اور فتح کی تاریخ حسب ذیل ہے۔

یافت چوں برہ راجہ منیر ظفر
داد امام از دیں جہانے را نوی
ہست منقول از بزرگانِ سلف
سال آں دین محمد شد قوی

یہ مضمون اس نوعیت کے اعتبار سے خالص تاریخی ہے، مورخین اس مضمون کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، نیز صوبہ بہار کے کئی محققین نے بھی اپنے تحقیقی مقالے کی ترتیب میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کا دوسرا تاریخی مضمون "قلعہ رہتاس کی تاریخ" رسالہ معاصر پٹنہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا، اس مضمون کو بلخی صاحب مرحوم نے تاریخی حوالوں اور کتبوں کے حوالے سے لکھا

لہ فصیح الدین بلخی مرحوم چند یادیں، مقالہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخطوطہ

لہ "بلخی صاحب" مقالہ سہیل عظیم آبادی۔

ہے۔ یہ ایک کافی ضخیم اور معلوماتی مضمون ہے، عہد قدیم سے لے کر اسلامی سلطنت تک کے واقعات پتہ چلتا ہے۔ بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے۔

لہ "روایتوں کے مطابق اس قلعہ کا بانی رہتا سوا بیر چندر یا خود راجہ ہریش چندر تھا لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں، اس میں شک نہیں کہ قلعہ ہندوؤں کے عہد میں تعمیر ہوا تھا لیکن موجودہ قلعہ اور عمارتیں مسلمانوں کے عہد کی بنی ہوئی ہیں، ہندوؤں کے عہد کے متعلق چند کتبے چٹانوں اور پتھروں پر پائے گئے ہیں جس کا ذکر ڈسٹرکٹ گزیٹیر اور بکانن کی رپورٹ میں مذکور ہے"۔

آگے چل کر بلخی صاحب نے مسلمانوں کے عہد کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے:

"طبقات اکبری اور دوسری تاریخوں کے مطابق ۱۵۳۹ء میں جب ہمایوں قلعہ چنار فتح کر کے بنگال کی طرف روانہ ہوا۔ شیر خاں بنگالہ کا خزانہ لیکر جھار کھنڈ یعنی چھوٹا ناگپور کی راہ سے راہ بنگالہ کی طرف آیا اور چنتامن اس قلعہ کو ایک برہمن کے ذریعہ حرص دلا کر خزانہ اور عورتوں کو قلعہ میں رکھنے کے لئے ڈولیوں میں سپاہیوں کو بھیج کر اچانک اس قلعہ پر قبضہ کر لیا"۔

بلخی صاحب مرحوم نے اس تاریخی مضمون میں مسلم عہد کے دو کتبوں کی نقلیں بھی پیش کی ہیں۔ آخری الذکر کتبے کی نقل یوں ہے۔

ساقی خاں کا مقبرہ ۹۸۶ھ

حبش خاں کی مسجد سے کچھ دور پورب ایک احاطہ کے اندر ساقی کی قبر ہے جس کے قریب ایک چبوترہ فناتی مسجد کے طور پر ہے محراب کے اوپر دو فٹ لانبی اور بیس انچ چوڑی لوح میں یہ اشعار کندہ ہیں۔

فغاں از گردش چرخ ستمگر — کہ نبود با کسی اورا مہربانی
خلف ساقی سلطاں دم دل — کہ گردد مفتخر با سم فانی
قضا را آنچناں رنجور گردید — کہ از صحت نبود اورا نشانی
باو پیک اجل آمد بگفتا — سفر کن زود ازیں دنیائے فانی

لہ "بلخی صاحب" مقالہ سہیل عظیم آبادی

سفر کرد او ازیں عالم سبکدم | ایں باید کرد گاہ لامکانی
جستم از خرد تاریخ فوتش | بگفتا در بہشت جاودانی

۹۸۶ھ

بلخی صاحب مرحوم کا ایک اور تاریخی مضمون "پلاموں کی تاریخی سرگذشت" رسالہ "کوئل" ڈالٹن گنج میں شائع ہوا۔ یہ مضمون بلخی صاحب مرحوم کی وفات سے چند ماہ قبل 'کوئل' کے اول شمارہ ستمبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب نے پلاموں کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے یوں لکھا ہے:

[1] "پلاموں کی وجہ تسمیہ تین طور پر بیان کی جاتی ہے، اول یہ کہ یہ لفظ پلانا سے ماخوذ ہے جس کے معنی استقامت نہ کرنے کی جگہ ہے، دوم یہ کہ پل - ام - او سے ماخوذ ہے جس کے معنی دانت والے قلعہ کے ہیں۔ اس لئے کہ چیرو قوم نے جو قلعہ ندی کے کنارے بنایا اس ندی میں پتھر بڑے بڑے دانتوں کی طرح شکل میں نمایاں ہیں، شاید یہ لفظ ڈراویڈین زبان سے ماخوذ ہے، سوم یہ کہ یہ نام پلاموسے ماخوذ ہے جس کے معنی ٹھنڈا کا مارا ہوا، ان میں سے کونسی نسبت صحیح ہے معلوم نہیں۔"

ڈاکٹر مظفر اقبال نے لکھا ہے کہ بلخی صاحب کے مضامین ہندوستان کے جرائد میں شائع ہوئے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی نے انسائکلوپیڈیا آف اسلام دینے کی ترتیب دی تو یونیورسٹی نے ملا غلام یحییٰ منیری اور نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے حالات آپ ہی سے لکھوائے، جناب ہجور شمسی مرحوم نے اپنے مقدمہ نادم بلخی کے پہلے مجموعہ کلام "آغاز سحر" میں یوں لکھا ہے۔

[2] "حکومت پاکستان کی ایما سے پنجاب یونیورسٹی نے جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

---

[1] پلاموں کی تاریخی سرگذشت مطبوعہ رسالہ کوئل ڈالٹن گنج ستمبر ۱۹۶۱ء

[2] آغاز سحر مجموعہ کلام پروفیسر نادم بلخی مقدمہ ہجور شمسی مرحوم

ترتیب دی ہے۔ اس میں ملا غلام یحییٰ بہاری اور نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے حالات آپ ہی سے لکھوائے ہیں۔ جناب احمد اللہ ندوی نے اپنے تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد سوم میں جناب مہجور شمسی کے مقدمہ کا حوالہ دیا ہے، وہ یوں لکھتے ہیں۔

ل "حکومت پاکستان کی ایما سے پنجاب یونیورسٹی نے جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ترتیب دیا ہے اس میں ملا غلام یحییٰ بہاری اور نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے حالات یونیورسٹی نے آپ ہی سے لکھوائے ہیں۔"

بلخی صاحب مرحوم سے حکومت پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایک عرصہ دراز تک خط وکتابت کا سلسلہ رہا، اس کے چیرمین جناب محمد شفیع نے بلخی صاحب کو کئی خطوط لکھے اور بلخی صاحب نے بھی ان خطوط کا جواب دیا اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب کے سلسلے میں دو مقالے یونیورسٹی کے ارکان کو لکھ کر ارسال کئے۔ ان خطوط کی نقلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

Universil of Panjab
Department of Urdu Encyclopaedia of Islam
University Library Buildings.
Lahore 19/7/1955
K.B.M. Mohammad Shafi
M.A (P.B) M.A. Cantab D.O.L
Chairman Editorial Board
Urdu Encyclopaedia of Islam
University of the Panjab, Lahore
Ref No. 1212/ Contr

ل مسلم شعرائے بہار مؤلفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی جلد سوم

مکرمی!

سلام مسنون، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ صوبہ بہار کے بزرگوں پر اردو دائرہ معارف اسلام کے لیے (جس کو پنجاب یونیورسٹی لاہور مرتب کر رہی ہے) مقالے لکھ سکتے ہیں، مخدوم الملک شرف الدین احمد المنیری...... صاحب لکھ رہے ہیں، ان کے علاوہ اگر آپ صوبہ بہار کے چند نامور اور تاریخی بزرگوں اور تاریخی مقامات کی ایک ایسی فہرست بنا کر بھیج سکیں جن کے تراجم دائرہ معارف میں آنے چاہئیں تو باعث ممنونیت ہوگا، اس فہرست میں جن مقالوں کو آپ خود لکھ سکیں ازراہ کرم ان پر نشان لگا دیں، اگر ممکن ہو تو فہرست مرتب کرتے وقت ان مقالوں کا خیال رکھیں جو پہلے ہی لائیڈن والی انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں موجود ہیں۔

والسلام
ملتمس
محمد شفیع

جناب فصیح الدین بلخی صاحب
ریٹائرڈ
محلہ گدڑی، پٹنہ سیٹی

University of the Panjab
Department of Urdu Encyclopaedia of Islam
University Library
Building
Lahore 13.x.1955

K.B.M. Mohammad Shafi
M.A (P.B) M.A (Cantab.) D.O.L
Chairman Editorial Board
Urdu Encyclopaedia of Islam
University of the Panjanb, Lahore

Ref No. 1558

Dear Fasihuddin Balkhi

I thank you very much for your letter dated 15.9.1955 and 17.9.1955.

Can you undertake to write for us the following articles in Urdu and send the same within about two months.

1. Mulla Gholam Bihari Containing about 800 Urdu words.
2. Nawab Ali Ibrahim Khan containing about 600 words in Urdu.

An early reply is requested.

Yours Sincerely
Mohammad Shafi

Fasihuddin Balkhi
Mahalla-Guzri
Patna City-8

University of the Panjab
Department of Urdu Encyclopaedia of Islam
University Library
Lahore

Lahore 5th Dec. 1955
By airmail

K.B.M. Mohammad Shafi

M.A (P.B) M.A. (Cantab) D.O.L

Chairman Control Board

Urdu Encyclopaedia of Islam.

Ref. No. 1781/contr

Dear Mr. Fasihuddin Balkhi

Thanks for your letter of the 19th October 1955 in which you had informed me that you would send the following articles in Urdu within two months.

1. Mulla Gholam yahya Bihari
2. Nawab Ali Ibrahim Khan

Will you kindly let me know if these articles will reach me by the end of this month.

An early reply would be appreciated.

Yours Sincerely.

Mohammad Shafi

Fasihuddin Balkhi

Mahalla Guzri

Patna City-8

بلخی صاحب کے مضامین صوبہ بہار کے اکثر جرائد میں کثرت سے شائع ہوئے، جناب قیوم خضر ایڈیٹر "اشارہ" نے اس امر کی تفصیل سے وضاحت کی ہے، موصوف لکھتے ہیں۔

[۱] "دسمبر ۱۹۵۳ء کے دوسرے ہفتے میں جب میں نے دوبارہ اشارہ نکالنے کا مشورہ طلب کیا تو خاموش سوچنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا خضر صاحب! میں کسی کو بھی بہار میں رسالہ نکالنے کا مشورہ نہیں دیتا ہوں مگر آپ کہتے ہیں تو ضرور نکالیں، بیسوں سے تو نہیں مگر مضامین سے میں مدد کرتا رہوں گا۔ بلخی صاحب نے اپنا یہ وعدہ مرتے دم تک نبھایا، مجھے فخر ہے کہ بلخی صاحب کے جتنے مضامین اشارہ میں چھپے وہ بہار کے کسی دوسرے رسالے میں نہیں چھپے"۔

جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم ایڈیٹر "تہذیب" نے بلخی صاحب کی مضمون نگاری کے سلسلے میں اپنا یوں تاثر پیش کیا ہے۔

"میں نے ان سے مضمون کی درخواست کی تو انہوں نے فوراً وعدہ فرمایا، پہلے ضیاء عظیم آبادی پر ایک مفصل مضمون لکھا پھر ایک بے حد قیمتی مضمون "ماہ و سال کی تاریخ" پر پھر ایک مضمون "عروض و موسیقی کے تعلق پر، یہ سارے مضامین نہایت ہی عالمانہ تھے، افسوس کہ آخری مضمون کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی اور تہذیب بند ہو گیا اور یہ مضمون کسی دوسرے رسالہ کی زینت بنا۔"

بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نگاری کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان کے مضامین صرف تاریخی اور تحقیقی نوعیت ہی کے نہیں بلکہ انہوں نے دیگر فنون لطیفہ، موسیقی اور نجوم جیسے فنون میں بھی مضامین لکھے ہیں۔ موصوف کا مضمون موسیقی و شاعری کا نام قابل ذکر ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے یہ بتایا ہے کہ موسیقی اور شاعری کا باہمی تعلق کیا ہے۔ فن موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے۔

[۲] "جو شخص موسیقی کی ماہیت سے واقف نہیں اس فن لطیف کو گانے، بجانے اور ناچنے تک محدود سمجھتا ہے، دراصل موسیقی وہ علم ہے جس سے آواز و حرکات و سکنات کا

---

[۱] بلخی صاحب مقالہ قیوم خضر مخطوطہ [۲] مضمون موسیقی و شاعری مطبوعہ رسالہ مصور پٹنہ ماہ جولائی ۱۹۵۶ء۔ مضمون روز و ماہ و سال کی سرگذشت مطبوعہ رسالہ تہذیب پٹنہ دسمبر ۱۹۵۲ء

اصول اور قاعدے کے مطابق ہونا یا نہ ہونا معلوم ہو۔

بلخی صاحب نے موسیقی اور شاعری کے باہمی رشتہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں لکھا ہے۔

لہ" اردو کے شعرا نے اپنے اپنے کلام میں کہیں کہیں موسیقی کی اصطلاحیں نظم کی ہیں چنانچہ ذوق کے ایک قصیدہ میں یہ اشعار پائے جاتے ہیں ؎

مائل موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا	کبھی ہیں بارہ مقام اور کبھی چار دو ست
اس قدر ساز طرب سازکی آواز بلند	پھر بھی گر تار کھرج کا تو ہو پیدا دھیوت
لیکے انگڑائی کہیں بننے لگی رام کلی	اٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنے ملت

اس طرح امانت کے دیوان میں بھی متعدد اشعار ہیں مثال کے طور پر ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔

جنگلا الانیتا ہے مرے دشت میں وہ گل
بلبل ترے ترانے کا کس کو خیال ہے

بلخی صاحب کا ایک مضمون "روز و ماہ و سال کی سرگذشت" رسالہ تہذیب دسمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کو علم نجوم سے کتنی واقفیت تھی۔

لہ" تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ علم نجوم قدیم زمانہ میں ملک چین، مصر اور بابل میں رائج تھا۔ مشہور منجم توبیمی (Plobemy) جو ۱۲۷ تا ۱۵۱ء تک اسکندریہ میں اس کے عقیدے کے مطابق دنیا ثابت اور ساکت تھی۔ توبیمی نے دن کی ابتدا آفتاب کے نصف النہار ہو جانے پر یعنی دوپہر سے شمار کیا اور اس کو نجومیوں نے بھی مان لیا۔ چوبیس گھنٹوں کی گنتی ہپارکس کی ایجاد ہے، سات دنوں کی مدت کو ہفتہ کہتے ہیں۔ یونانیوں کے یہاں ہفتہ کا کوئی شمار نہ تھا اور روم والوں نے تھیوڈسیس کی حکومت کے بعد ہفتہ کی مدت کا شمار کیا لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ چین، بابل اور شاید ہندوستان میں ہفتہ کا شمار تھا، ہفتہ کا ہر ایک دن

لہ مضمون موسیقی و شاعری مطبوعہ رسالہ مصور پٹنہ ماہ جولائی ۱۹۵۶ء

لہ مضمون روز و ماہ و سال کی سرگذشت مطبوعہ رسالہ تہذیب پٹنہ دسمبر ۱۹۵۲ء

ایک سیارے کے نام سے منسوب ہے جیسے سنیچر یا سٹرڈے یعنی یوم زحل، اسی طرح اور دنوں کے نام بھی سیاروں سے منسوب ہیں، اس کا سبب صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں جو سات سیارے انسان کو سب سے زیادہ روشن نظر آئے ان کو قابلِ پرستش سمجھ کر ہر ایک کو ایک دن سے منسوب کیا گیا مگر عربوں میں دنوں کے نام سیاروں سے منسوب نہیں، ان کے یہاں سات دنوں کے نام سبت، احد، اثنین، ثلاثہ، اربعہ، خمیس اور جمعہ ہیں۔ دنیا کی ہر قوم میں سال کی تقسیم بارہ ہی مہینوں پر ہے۔ قرآن میں مذکور ہے أن الشهور عند الله اثنا عشر شهرا یعنی مہینے اللہ کے نزدیک بارہ ہی ہیں۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کی مضمون نگاری کے ضمن میں ان کے تحقیقی مضامین کی نوعیت کافی اہم ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بلخی صاحب ادب میں تحقیق کو کافی اہمیت دیتے تھے۔ ایک محقق اپنی تحقیق میں (Field work) کو کافی مقدم سمجھتا ہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم اپنی تحقیق میں Field work پر کافی اہمیت دیتے تھے۔ اپنے تحقیقی کارناموں کے دوران جہاں انہیں کوئی امر انکشاف ہوتا اسے درست منظرِ عام پر لانے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ بحیثیت محقق بلخی صاحب کے مضامین کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ بلخی صاحب کا مضمون "امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں" رسالہ "صبح نو" مئی ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبروں کے کتبات کی نقلیں شائع کی ہیں۔

قطعہ تاریخ رحلت منشی امیر مینائی لکھنوی ~

۱) امیرِ کشورِ معنی امیر مینائی — خدا کے عاشقِ صادق اور نبی کے فقیر
گئے جو خلدِ بریں تو ان کی تربت پر — جلیل نے یہ لکھا "روضۂ جناب امیر"

۱۳۱۸ھ

۲) داغ دہلوی کی قبر کے کتبہ کی نقل۔

---

(۱) مضمون "امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں" مطبوعہ رسالہ صبح نو مئی ۱۹۵۸ء

رفت از دہر چوں فصیح الملک — لرزہ افتاد در تمامی ہند
اوستادِ نظام آصف جاہ — موردِ لطفِ شاہ جامی ہند
راست بر قامتش قبائے سخن — زیبد بر وی خطاب جامی ہند
سالکِ نظمش بسانِ سلکِ گہر — جوہری سخن نظامی ہند
شد وفاتش بشامِ یوم الحج — دفن شد روز عید سامی ہند
آہ از دل کشید سائل گفت — مدفنِ پاک داغ نامی ہند

بلخی صاحب کا مضمون مولوی شجاع الدین علی رسالہ صبح نو اپریل ۱۹۵۸ء[1] میں شائع ہوا، یہ مضمون بھی بلخی صاحب کا ایک وقیع اور معلوماتی ہے۔ اس مضمون میں بھی انہوں نے مولوی شجاع الدین علی[2] ان کی بیگم گیتی آرا اور ان کے والد حضرت یتیم اللہ کی قبروں کے کتبات کی نقلیں پیش کی ہیں ساتھ ہی ساتھ بلخی صاحب نے ان کتبات کے اقتباس کو بھی اپنی تحریر میں پیش کیا ہے، بلخی صاحب نے لکھا ہے:

لہ "مولانا یتیم اللہ کے کتبۂ مزار سے واضح ہے کہ وہ حسینی نسب تھے اور امام باقر کی اولاد میں تھے۔ سنہ ۱۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۲۱ھ میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے، علوم ظاہری اور باطنی میں یکتائے زمانہ تھے۔ کچھ عرصہ تک بادشاہ کے امراء سے شاہی مقربوں میں شامل رہے پھر تعلقات دنیوی کو ترک کر کے صوفیانِ باصفا کے فیضانِ صحبت سے متمتع ہوئے اور چالیس سال درس و تدریس، عبادت و ریاضت میں بسر کر کے سنہ ۱۲۲۱ھ میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

لہ شجاع الدین علی رضوی کے مزار کے منظوم کتبہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بھی بڑے عالم متبحر تھے، علم طبعی و الٰہی میں کمال حاصل تھا اور حل مسائل وجوب امکان و بقائے نفس انسانی، علم کلام و بحث ادیان وغیرہ میں تیس برس منہمک رہے پھر صوفیائے کرام سے کسب فیض کیا بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک ما و من کو نہ چھوڑیں معرفت الٰہی ممکن نہیں، آخر سطر میں ان کا سن وفات سنہ ۱۲۳۷ھ درج ہے۔

---

[1] لہ مضمون مولوی شجاع الدین مطبوعہ رسالہ صبح نو اپریل سنہ ۱۹۵۸ء

سلہ گیتی آرا بیگم کے مزار کے لوح میں یہ مضمون ہے کہ نواب گیتی آرا بیگم بنت نواب رفعت النساء بیگم بنت شاہ عالم بادشاہ لال قلعہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں پرورش پائی اور سید شجاع الدین علی خاں بہادر کی منکوحہ ہونے کے سبب اس خاندان کے مقبرہ میں مدفون ہوئیں اور ان کا سن وفات ۱۲۵۶ھ درج ہے۔"

بلخی صاحب کا مضمون "مثنوی گوہر جوہری رسالہ معاصر پٹنہ نومبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا، اس تحقیقی مضمون میں مضمون نگار نے مثنوی جوہری اور اس کے مصنف شاہ آیت اللہ جوہری کے مفصل حالات قلمبند کئے ہیں، نیز اردو کی ابتدائی نشوونما سے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

سلہ "یہ سمجھنا کہ اردو کسی خاص مقام میں پیدا ہوئی راقم کے خیال میں محض دھوکا ہے پنجاب سے حدود بنگال تک اور دکن میں جو زبان کچھ لفظی اختلاط کے ساتھ عام طور پر بولی جاتی تھی اس کو مسلمانوں نے فارسی رسم الخط میں رائج کیا، ابتدا میں اس کو زبان ہندی کہتے تھے مصحفی نے اپنے تذکرہ شعرائے اردو کا نام تذکرہ ہندی رکھا۔"

بلخی صاحب مرحوم کا ایک اہم تحقیقی مضمون "ایک ہندو شاعر کا عارفانہ کلام" رسالہ صنم پٹنہ ماہ نومبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا، بلخی صاحب مرحوم نے سکھوں کی مقدس ہستی نندلال گویا کے فارسی دیوان کو حاصل کیا، گویا کا مذہب نانک شاہی تھا لیکن ان کے کلام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ گویا نے اپنی فارسی شاعری میں حافظ شیرازی کے گہرے رنگ کو قبول کیا ہے، بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے۔

سلہ "مجھے تربہت کے ایک فارسی شاعر نندلال گویا کا قلمی دیوان ہاتھ آیا جس کے تمام تر

سلہ مضمون مولوی شجاع الدین مطبوعہ رسالہ صبح نو اپریل ۱۹۵۸ء

سلہ مثنوی گوہر جوہری مقالہ فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ معاصر، پٹنہ نومبر ۱۹۵۵ء

سلہ ایک ہندو شاعر کا عارفانہ کلام مقالہ فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ صنم پٹنہ ماہ نومبر ۱۹۵۸ء

اشعار عارفانہ مضامین سے بھرے ہیں۔ سلاست زبان اور تخییل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاعر بلبل شیراز کا مقلد ہے۔"

داغ دہلوی کے عظیم آباد آنے کے حال سے صوبہ بہار کے شعرا اور ادبا اچھی طرح واقف ہیں، چنانچہ وہ غزل جو انہوں نے عظیم آباد میں کہی اس میں عظیم آباد کا ذکر موجود ہے، غزل کا مقطع یہ ہے۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں   عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

لیکن امیر مینائی کے عظیم آباد آنے کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے سب سے قبل ادبی دنیا کو یہ روشناس کرایا کہ امیر مینائی بھی داغ دہلوی کی طرح عظیم آباد تشریف لائے تھے۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

[1] "واقعہ یوں ہے کہ حکیم محمد حسن ہادی خاں مرحوم نایاب خلف، حاجی امیر حسن خاں بن دیوان مولا بخش خاں سی۔ آئی۔ اے رئیس اعظم رسول پور ضلع ترہت، ابتدا میں عبد الواحد سیماب کے شاگرد ہوئے، میر وزیر علی لکھنوی سے مشورہ سخن کرتے تھے، پھر منشی منظر علی امیر شاگرد مصحفی کو غزلیں دکھائیں ۱۲۹۲ھ میں ان کے انتقال کرنے پر مفتی امیر احمد نے امیر مینائی سے رجوع کیا لیکن ہنوز ان کے حلقہ تلمذ میں داخل نہ ہوئے کہ ۱۳۰۱ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی رحلت کے بعد ان کا دیوان برائے اصلاح امیر مینائی کے پاس بھیجا گیا اور بعد اصلاح اس کو مولوی اعجاز حسن خاں خلف نایاب مرحوم نے طبع کرایا۔ بعد میں نایاب مرحوم کے چھوٹے بھائی مولوی مہدی حسن خاں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۳۰۵ھ میں انہوں نے امیر مینائی کو عظیم آباد آنے کی دعوت دی۔ امیر مینائی اپنے ارشد تلامذہ ریاض و کوثر کے ساتھ تشریف لا کر لال کوٹھی عظیم آباد میں شاداب کے مہمان رہے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کا کافی چرچہ تھا، عظیم آباد کے بعض شعرا نے بھی ان سے ملاقات کی۔"

فصیح الدین بلخی کی مضمون نگاری میں ان کی تذکرہ نویسی کی بھی خصوصیتیں ملتی ہیں، اس سلسلہ

---

[1] امیر مینائی عظیم آباد میں مقالہ فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ اشارہ نمبر ۱۹۵۹ء

ہیں ان کے کئی مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق کسی معروف شاعر کی زندگی کے گمنام گوشوں کو منظر عام پر لانا مقصود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جن بزرگوں کو انہوں نے اپنی زندگی میں دیکھا تھا ان کے حلیہ کو بھی بلخی صاحب بیان کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کی طرز رہائش پر بھی مختصر روشنی ڈالتے ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم کا ایک قیمتی مضمون "عظیم آباد کا ایک جواں مرگ شاعر" رسالہ تہذیب، پٹنہ اگست ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے ضیا مرحوم کے برادر نسبتی حافظ عبد الغنی مرحوم کی وہ تقریظ جو ضیا کے دیوان کے ساتھ شائع ہو چکی ہے نیز تاریخ شعرائے بہار جلد دوم کے قلمی مسودہ کی بھی نقل پیش کی ہے۔ ضیا کی شاعرانہ خصوصیت کے سلسلہ میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

[1] "متقدمین شعرائے اردو سے لے کر متاخرین تک آپ جن جن شعرا کا نام لیں گے ان سبھوں نے مشق سخن میں عمریں گذارنے کے بعد ایک امتیازی حیثیت اور عام مقبولیت حاصل کی، میں آپ کو ایک ایسے شاعر کا حال سناتا ہوں جس نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور اکیس سال کی عمر میں صرف چھ برس کے بعد انتقال کے وقت ایک دیوان اس کے ساتھ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں قدر دانوں کے دلوں میں اپنی خوش گوئی کا نقش پائیدار چھوڑا۔"

اس کے بعد بلخی صاحب مرحوم نے ضیا مرحوم کے حلیہ کو یوں بیان کیا ہے۔

[2] "ان کی رنگت بہت گوری بدن چھریرا چہرہ بیضاوی کسی قدر لانبا آنکھیں بڑی بڑی بڑی ناک بلند اور داہنی جانب گال پر چوٹ یا زخم کا نشان جو بدنما معلوم ہوتا تھا۔"

ضیا مرحوم کی طرز رہائش پر یوں لکھا ہے۔

[3] "اکثر انگرکھا اور چوڑی دار پاجامہ اور لکھنؤ کے پلہ کی ٹوپی پہنتے تھے۔ کپڑے ہمیشہ صاف پہنتے تھے۔ چال ڈھال اور گفتگو میں متانت اور شائستگی کا بہت خیال رکھتے تھے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کا ایک وقیع مضمون "علامہ شوق نیموی" رسالہ اشارہ، پٹنہ دسمبر ۱۹۵۸ء

---

[1] [2] [3] رسالہ تہذیب ص ۱۸، ۲۱ اگست ۱۹۵۳ء

میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے علامہ شوق نیموی کی ادبی حیثیت، ان کے خاندانی حالات اور ان کی خاندانی ادب نوازی، ان کی تصانیف اور ان کی ادبی معرکہ آرائیوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی وضع قطع اور ان کی ہندوستان گیر شہرت سے تفصیلی بحث کی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے ان کی شخصیت کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

[1] "شوق نیموی عظیم آبادی ایک خوشگو شاعر کے علاوہ بڑے محقق زبان، کامل الفن اور عالم متبحر بھی تھے اور اپنے معاصرین میں اساتذہ دہلی و لکھنؤ سے کم نہ تھے۔"

ان کی وضع قطع کے بارے میں یوں لکھا ہے:

[1] "ان کی وضع قطع میں کوئی نمائش نہ تھی، طبیعت میں بہت سادگی تھی، علماء کی وضع پر معمولی قسم کے کپڑے، زیب تن ہوتے تھے، رنگ سانولا قد میانہ اور داڑھی معمولی وضع کی تھی، گفتگو میں متانت بہت تھی۔ اشعار پر تاثیر لہجہ میں پڑھتے تھے اور فرط جوش میں اکثر اٹھ اٹھ جاتے تھے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کا وہ مضمون قابل قدر ہے جس میں انہوں نے اپنے بھائی مولوی عزیز الدین بلخی مرحوم کے حالات لکھے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ایسا احساس ہوتا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم اپنے منجھلے بھائی کے حالات اور ان کی ادبی خدمات کے ضمن میں انہوں نے بغیر جانبداری کا سہارا لیا ہے بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے ایسی روش اختیار نہیں کی جس سے ان پر مدحت سرائی کا الزام عائد ہو نیز ذاتی عقیدت یا لگاؤ کو دخل دیا ہو۔ اس مضمون کے آخر میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

[2] "آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مولوی عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی راقم کے حقیقی منجھلے بھائی تھے، مجھے یقین ہے کہ ناظرین خود فیصلہ کریں گے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ذاتی عقیدت یا لگاؤ کو کوئی دخل نہیں، جس طرح میں نے عظیم آباد کے مشاہیر

---

[1] علامہ شوق نیموی مصنف فصیح الدین بلخی مقالہ شائع شدہ رسالہ 'اشارہ' صفحہ ۶ دسمبر ۱۹۵۸ء

[2] تاریخ شعرائے بہار کا مؤلف مقالہ فصیح الدین بلخی شائع شدہ " " فروری ۱۹۵۹ء

کا تذکرہ قلمبند کیا ہے اسی طرح یہ بھی محض حقیقت اور واقعی حالات پر مبنی ہے۔"

اس مضمون کی ابتدا میں بلخی صاحب مرحوم نے رازؔ بلخی کی شخصیت پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے خاندان بلخیہ کے حالات کو لکھا ہے۔ اس کے بعد رازؔ بلخی کی وضع قطع اور طرز معاشرت کو بیان کرتے ہوئے ان کے علمی مشاغل اور تصنیف و تالیف کا جائزہ لیا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

"شعر و شاعری کا مذاق فطری تھا، اردو کے بہترین نثار میں تھے۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے ایک ماہنامہ رسالہ "رفتار زمانہ" نامی جاری کیا تھا، تصنیف و تالیف کا سلسلہ تادم مرگ جاری رہا، انہوں نے اول ایک ضخیم کتاب دین و دنیا لکھی جس میں مذہب اور انسان کے عقائد اور زندگی کے مختلف پہلو پر بحث کی تھی، یہ کتاب طبع ہونے نہ پائی تھی، ان کی دوسری کتاب "انسان کی پرواز" ہے اس میں فن غبارہ بازی اور ہوائی جہاز کی ایجاد کی تاریخ اور سائنٹفک تحقیقات کو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔"

ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب "تاریخ شعرائے بہار" ہے، یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شعرائے ریختہ کا سب سے پہلا تذکرہ غلام حسین شورش عظیم آبادی متوفی ۱۱۹۵ھ نے لکھا تھا۔ دوسرا تذکرہ عشقی ۱۲۰۰ھ میں وجیہہ الدین عشقی نے مرتب کیا تھا۔ تذکرہ میر حسن کے مطابق جوشش عظیم آبادی نے بھی ایک تذکرہ لکھا تھا لیکن اب تک کسی کو دریافت نہ ہوا، بہر کیف ان تذکروں کے بعد صوبہ بہار میں "تاریخ شعرائے بہار" ہی ایک قابل قدر تذکرہ ہے۔"

بلخی صاحب مرحوم کا ایک گرانقدر مضمون حضرت یاسؔ بہاری کی شخصیت اور شاعری سے متعلق رسالہ سہیل گیا مارچ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں انہوں نے قصبہ بہار شریف کی ادبی اہمیت اور یاسؔ بہاری کے خاندانی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری سے بحث کی ہے۔ یاسؔ بہاری کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

[1] "ان کو زبان اور تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے، غزلوں کے علاوہ مثنوی،

---

[1] مضمون یاس بہاری مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم شائع شدہ رسالہ سہیل گیا مارچ ۱۹۵۶ء

قصیدہ، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس اور قومی نظمیں خوب کہی ہیں، جدت طرازی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کے ایسے مضامین بھی کافی قابل قدر ہیں جو خود شعرائے کے خود نوشتہ حالات پر مبنی ہیں، بلخی صاحب مرحوم نے ان شعراء کے خود نوشتہ حالات بڑی کد وکاوش سے حاصل کیا تھا، رسالہ کوئل سہ ماہی ڈالٹن گنج نے ستمبر ۱۹۶۱ء میں ایک گمنام مضمون "داغ کا ایک بہاری شاگرد" کے عنوان سے شائع کیا تھا، اس مضمون میں ادارہ کا ایک فٹ نوٹ بھی شامل ہے، اس فوٹ نوٹ کی عبارت یہ ہے۔

لہ "ذیل کا مضمون داغ کے ایک بہاری شاگرد سید عبدالحی ہاتف ولد سید ولایت حسین بچنہ ضلع مونگیر کے خود نوشتہ حالات سے ماخوذ ہے، انہوں نے داغ دہلوی سے بذریعہ مراسلت اصلاح لی تھی اور ۱۹۰۳ء میں دہلی دربار کے موقع پر داغ کے پاس حاضر ہو کر ان کے مشاہیر شاگردوں کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے اور دہلی کے بعض مشاعروں میں بھی شرکت کی تھی، ناظرین کے لئے یہ مضمون خاص طور پر دلچسپی کا حامل ہے (ادارہ)"

تعجب کی بات ہے کہ رسالہ "کوئل" ڈالٹن گنج نے اس مضمون کو کیوں گمنام شائع کیا، دوسری بات یہ ہے کہ مضمون بلخی صاحب کی زندگی میں شائع ہوا، بلخی صاحب نے ادارہ کو ممانعت کی ہوگی کہ ان کے نام سے شائع نہ کیا جائے، بہرحال ہاتف بچنوی کی شخصیت کو پردۂ خفا سے منظر عام پر لانے کے لئے بلخی صاحب مرحوم کی ذات ہے۔[۲] اس مضمون کی عبارت یہ ہے:

"شاعری کا باقاعدہ آغاز روز افزوں ترقی کے ساتھ دہلی میں ہوا، منشی قربان علی بسمل سے جو اس زمانہ میں "نسیم" نامی ماہوار کے اڈیٹر تھے اصلاح لینا شروع کیا، کچھ دنوں بعد حکیم ضامن علی مرحوم جلال لکھنوی کی شاگردی اختیار کی، پھر فصیح الملک استاد داغ دہلوی

لہ داغ کا ایک بہاری شاگرد مضمون رسالہ کوئل ڈالٹن گنج ستمبر ۱۹۶۱ء

ٰ بقیہ صفحہ ۳۳۵ کا فوٹ نوٹ دیکھئے۔

کے ساتھ تلمذ میں داخل ہوا اور ان سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینے لگا۔ جب استاد مرحوم حضور نظام کے ساتھ ۱۹۰۳ء کے دہلی دربار میں تشریف لائے تو بارہا بالمشافہ بھی اصلاح کا شرف حاصل ہوا۔"

بلخی صاحب مرحوم کا ایک مضمون "حضرت شوق قدوائی اور علامہ شوق نیموی کا ایک شاگرد" رسالہ کونیل ڈالٹن گنج اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون حضرت حافظ شک پوری کا خود نوشتہ ہے (جو شوق قدوائی اور شوق نیموی کے شاگرد تھے) یہ مضمون بلخی صاحب کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ رسالہ کونپل نے اپنے فٹ نوٹ کے ساتھ اس مضمون کو شائع کیا، عبارت یہ ہے۔

[1] "حضرت حافظ شک پوری کا خود نوشتہ تذکرہ تقریباً چالیس سال سے فصیح الدین بلخی صاحب کے پاس موجود تھا لیکن سوء اتفاق اب تک منظر عام پر نہ آسکا تھا، ادارہ کی درخواست پر بلخی صاحب نے اصل مسودہ اس رسالہ میں شائع کرنے کے لئے عنایت کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔"

مرحوم حافظ شک پوری نے طویل عمر پاکر ۱۹۴۷ء کے بعد رحلت کی ان کے خود نوشتہ حالات میں ذاتی واقعات کے علاوہ ان کے بعض معاصرین کا بھی ضمناً ذکر آگیا ہے جس سے اس تذکرہ کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے (ادارہ)

اس مضمون کی عبارت یہ ہے:

[1] "الغرض فن شاعری میں مجھے دونوں کامل الفن استاد شوق نیموی مرحوم و شوق قدوائی مرحوم سے شرف تلمذ ہے اور میں دونوں شوق مرحومین کا بعنایت شکر گذار ہوں اور ان کے لئے دعا خواں ہوں۔"

بلخی صاحب مرحوم کا ایک مضمون "راجہ رام نرائن موزوں" رسالہ اشارہ پٹنہ میں شائع ہوا۔ اس مضمون

---

[1] فصیح الدین بلخی مرحوم کا مضمون شوق قدوائی اور علامہ شوق نیموی کا شاگرد مطبوعہ رسالہ کونپل، ڈالٹن گنج ماہ اپریل ۱۹۶۲ء

میں بھی ان کی تذکرہ نگاری کی جھلکیاں بدرجہ اتم موجود ہیں نیز یہ مضمون ان کی تحقیق نگاری کا ضامن ہے، 'راجہ رام نرائن موزوں کی شخصیت اگرچہ ایک تاریخی ہے نیز ان کا ادبی مقام کافی رفیع ہے، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

"مہاراجہ رام نرائن موزوں نائب ناظم صوبہ بہار فارسی کے صاحب دیوان اور خوشگو شاعر تھے، شیخ علی حزیں متوفی ۱۱۸۰ھ کے شاگردوں میں تھے۔ موزوں کا مطبوعہ دیوان ۴۰۳ صفحوں کا محیط ہے ان کے علاوہ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ موسوم بہ دستور الانشا بھی ان کے وارث رائے متھرا پرشاد صاحب کے پاس ہے جن میں سیکڑوں مکتوبات ہیں جو اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں، سفینہ خوشگو میں بھی ان کا ذکر ہے۔"

بلخی صاحب مرحوم نے موزوں کے شاعرانہ مقام کے ضمن میں یوں لکھا ہے۔

"مشہور صاحب دیوان شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کا ذکر اکثر تذکروں میں پایا جاتا ہے 'سفینہ خوشگو' میں بھی ان کا ذکر موجود ہے، 'تذکرہ عمدہ نسخہ مملوکہ انڈیا آفس لائبریری لندن اور سخن شعرا مؤلفہ نساخ میں بھی ان کا ذکر راقم کی نظر سے گذرا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کا مضمون "اجاگر چند الفت" رسالہ "اشارہ" میں شائع ہوا، اس مضمون میں مضمون نگار نے الفت کے ادبی مقام کا جائزہ لیا ہے، نیز ان کی شاعرانہ خصوصیت سے بھی بحث کی ہے، بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے:

"[1] اجاگر چند الفت عظیم آباد کے متقدمین ہندو شعرا میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے، شاعری کے علاوہ انشا پردازی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، آغا حسین عاشق مؤلف تذکرہ نشتر عشق بندہ بن خوشگو مؤلف سفینہ خوشگو ار ڈاکٹر عبداللہ مصنف ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ اور مولوی عزیز الدین بلخی مؤلف تاریخ شعرائے بہار نے

---

[1] مضمون اجاگر چند الفت مطبوعہ رسالہ اشارہ جنوری ۱۹۶۰ء

ان کا ذکر کیا ہے۔"

فصیح الدین بلخی مرحوم کو بزرگان دین سے والہانہ لگاؤ تھا، جس خاندان کے فرد تھے اس کا تقاضہ بھی یہی تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی خاندان بلخیہ کے بزرگان دین نے کیا کیا خدمتیں انجام دیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کا ایک اہم مضمون "اطراف پورنیہ کے بعض صوفیائے کرام" رسالہ الانسان پورنیہ نمبر جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ چنانچہ اس مضمون میں بلخی صاحب نے پورنیہ کے صوفیائے کرام کی دینی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ ان بزرگانِ دین نے اپنے اخلاق محسنہ سے دینی تبلیغ و اشاعت کی چنانچہ بلخی صاحب نے یوں لکھا ہے:

"جن لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ ہنوز نہیں کیا ہے وہ اکثر غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی تہذیب و تعلیم مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اشاعت دین سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ انہوں نے مذہبی معاملہ میں کوئی دست اندازی نہ کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا رسوخ قائم ہونے سے پہلے اکثر دور دست مقاموں کو صوفیائے کرام نے اپنی ریاضت گاہ قرار دیا تھا ان کی بے لوث، بے تعصب اور بے طمع زندگی اور خدمتِ خلق لوگوں کو مائل کرتی تھی، راہ کی دشواریوں اور سفر کی صعوبتوں کے باوجود صوفی درویشوں نے ساتویں صدی ہجری سے اطراف پورنیہ کو اپنی ریاضت اور خدمت خلق کے لئے منتخب کیا تھا، مناقب الاصفیا مؤلفہ حضرت مخدوم شعیب فردوسی شیخپوری متوفی ۸۲۴ھ اور مونس القلوب ملفوظات حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخی متوفی ۸۹۱ھ اور بعض تذکروں سے پایا جاتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں اطراف پورنیہ میں سہروردیہ سلسلہ حضرت شیخ تقی الدین سہروردی سے جاری ہوا۔

فصیح الدین بلخی کا ایک اہم مضمون "شبلی نعمانی" رسالہ صبح نو اگست ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ شبلی نعمانی کے متعلق بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

"مولانا شبلی نعمانی اپنے زمانے کے قابل قدر اور مشہور ترین بزرگوں میں تھے، ان کی ذات میں اتنی خوبیاں تھیں کہ ایک شخص میں کم تر پائی جاتی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو زبان کے محقق ہونے کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کے مورخ، تذکرہ نگار، شاعر، ادیب، فلسفی، محدث، ناقد، ماہر تعلیم اور ریفارمر بھی تھے۔ ہندوستان کے علاوہ بلادِ اسلامی میں بھی شہرت رکھتے تھے اور براؤن نے Literary History of Persia میں ان کی مشہور کتاب شعر العجم کا صرف ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔"

بلخی صاحب مرحوم کا مضمون "عظیم آباد کا اک خوش نویس شاعر" رسالہ صدائے عام خاص نمبر میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے عظیم آباد کا مشہور و معروف شاعر باقر عظیم آبادی کی شخصیت و شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ باقر عظیم آبادی وحید الٰہ آبادی کے ارشد تلامذہ میں تھے نیز ان کی شخصیت اس طور پر بھی نمایاں ہے کہ داغ دہلوی ۱۲۹۹ھ میں عظیم آباد تشریف لائے تھے تو انہوں نے جناب باقر کے گھر ہی پر قیام کیا تھا اور جناب باقر عظیم آبادی کے اصرار پر داغ نے اپنی مشہور غزل کہی تھی جس کا مقطع یوں ہے؎

عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں

اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

[۱] "جن لوگوں کو داغ کے عظیم آباد آنے کا حال معلوم ہے یا جنہوں نے داغ کی مثنوی فریاد داغ پڑھی ہے ان کے لئے باقر عظیم آبادی کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ ۱۲۹۹ھ میں جناب داغ عظیم آباد آئے تو میر باقر ہی کے مکان میں مقیم ہوئے چنانچہ فریاد داغ میں خود فرمایا ہے؎

خوب دعوت کا اہتمام ہوا
میر باقر کے گھر قیام ہوا

اس شعر کے ساتھ میر باقر اور اہل عظیم آباد کی تعریف میں داغ نے یوں کہا ہے۔

یہ مروت کہیں نہیں دیکھی
یہ شرافت کبھی نہیں دیکھی

---

[۱] بلخی صاحب کی خودنوشتہ تحریر راقم کو جناب کے رشتہ سے حاصل ہوئی جس کے لئے راقم ممدوح کا ممنون ہے۔

دیں یہ جہاں کو جس قدر پائیں　　بخش دیں گھر کا گھر اگر چاہیں

مذکورہ بالا مضامین کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نویسی میں تذکرہ نویسی کی خوبیاں موجود ہیں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم علم کے سمندر تھے لہٰذا ان کے مضامین صرف ایک دائرے ہی تک محدود نہیں انہیں اُردو زبان و قواعد اور فن عروض پر مہارت تھی اس ضمن میں ان کی ایک اہم غیر مطبوعہ تصنیف "دستورِ سخن" اس سلسلے کی اہم کڑی ہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کا ایک اہم مضمون "اردو کے قواعد و لغات کی تدوین" رسالہ تہذیب اپریل ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یہ لکھا ہے کہ اردو زبان میں کتنی قواعد اور لغت ترتیب دی گئی ہے، نیز اس مضمون کو پڑھ کر ایسا احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان جس کس مپرسی میں مبتلا ہے اس امر سے بلخی صاحب مرحوم بھی اچھی طرح واقف تھے، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

"جن لوگوں نے اردو زبان کے ارتقا پر تاریخ کی روشنی میں غور نہیں کیا ہے ان کو یہ سن کر تعجب سا ہوتا ہے کہ اردو کی سب سے پہلی گرامر ملک پرد شیا جرمن کے رہنے والے نے لکھی۔"

اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے اردو زبان میں جتنی گرامر مرتب ہوئی اس کا سلسلہ وار طریقہ انہوں نے بحث کی ہے، مضمون کے آخر میں انہوں نے اردو اور ہندی کے جھگڑے کے متعلق اپنی گرانقدر رائے پیش کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"موجودہ زمانہ میں ہندوستان اور پاکستان میں جو زبان کا جھگڑا ہے اس کو میں سراسر فرقہ وارانہ تنگ نظری سمجھتا ہوں، جن میں کئی زبانوں نے مستقل ادبی زبان کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے، میں ان میں سے کسی کا مخالف نہیں بلکہ ہر ایک زبان کی ترقی کے مساوی موقع دیئے جانے کا حامی ہوں مگر اس جھگڑے نے اردو کی ماہیت کے متعلق چند غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اردو ہندی ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس کے تمام افعال مثلاً آرہا ہے، جارہا ہے دیکھتا ہے وغیرہ سب ہند الاصل ہیں۔"

بلخی صاحب کا مضمون "مخالفت قیاس" رسالہ اشارہ مارچ اپریل ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اس مضمون

میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے :

"جو عیوب کلام کی فصاحت میں مخل ہوتے ہیں ان میں ایک وہ ہے جس کو اہل فن کی اصطلاح میں مخالفت قیاس کہتے ہیں، لفظ قیاس لغوی یا قواعد صرف نحو کے خلاف استعمال کرنا اور فک اضافت یا بلاضرورت اضافت دینا اس عیب میں داخل ہے، شعرائے اردو کے کلام میں یہ عیب مفصلہ ذیل صورتوں میں پایا جاتا ہے، لیکن یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مثالوں میں جو مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام پیش کئے گئے ہیں اس سے اعتراض مقصود نہیں اور نہ ان غلطیوں سے ان کے رتبہ میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے، ان کے زمانے میں اکثر الفاظ اس طرح متداول تھے یا وہ خود ان کو اسی طرح استعمال کرتے تھے بعد میں جوں جوں زبان نے ترقی کی فصحا نے بعض کو متروک اور بعض کو مروج کیا، بہر کیف مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ کسی لفظ میں حرف ساکن کو متحرک یا متحرک کو ساکن استعمال کرنا۔

ع تو تو کہتا تھا نہیں تجھ بن آرام و چین	اب جدائی میں مری کیونکر صبر پیدا ہوا	(مومن)

صبر میں بائے موحدہ ساکن ہونا چاہئے۔ شاعر نے متحرک مفتوح استعمال کیا ہے۔

۲۔ شرط پنجم ہے کہ کارد نہ دکھاؤ اس کو	ذبح کے پہلے قضا سے نہ ڈراؤ اس کو	(دبیر)

لفظ کارد میں حرف رائے مہملہ دراصل ساکن ہے لیکن شاعر نے متحرک استعمال کیا ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نویسی کا جائزہ لیا گیا ہے، ان مضامین کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلخی صاحب مرحوم میں ایک مورخ، محقق اور تذکرہ نگار کی جو خوبیاں ان میں موجود ہیں ان کے علاوہ انہیں فنون لطیفہ میں بھی خاص مہارت تھی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے کئی کتابوں کے مقدمے بھی سپرد قلم کئے ہیں، ان مقدموں کو بھی مضامین کے زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے، چھان بین کی روشنی میں بلخی صاحب مرحوم نے تین کتابوں کے مقدمے سپرد قلم کئے ہیں۔ اول الذکر ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کے کلام "جلوۂ داغ"

لے اردو کے قواعد و لغت کی تدوین مقالہ فصیح الدین بلخی شائع شدہ رسالہ تہذیب، پٹنہ اپریل ۱۹۵۲ء

کا مقدمہ، دوم وفا براہی کے مجموعۂ کلام "نکہت گل" کا مقدمہ اور آخر الذکر تذکرہ شعرائے صاحب گنج کا "نقوش کارواں" کا مقدمہ بھی بلخی صاحب نے لکھا تھا۔

"جلوۂ داغ" کا مقدمہ بلخی صاحب مرحوم نے ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کے اصرار پر لکھا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر مبارک مرحوم نے بلخی صاحب مرحوم کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کی نقل پیش کی جاتی ہے۔

P.O. Begum pur
Patna
19 12/45

بلخی صاحب سلمہٗ تعالیٰ

سلام و دعائے خیر، کل آپ کا کارڈ ملا، آج اصل مسودہ جاتا ہے، آپ میری شاعری کے متعلق جو فلسفیانہ مقدمہ لکھنا چاہتے ہیں ضرور لکھئے زوردار لکھئے اور ضرور لکھئے۔ میرے خاندانی حالات مسودہ مرسلہ میں ہیں مگر ترمیم کی ضرورت ہے، پٹنہ میں آپ کا قیام ہوگا۔ مسودہ کی ابتدا بھی مجھے پسند نہیں یہ سب مضمون نکال دیا جائے گا۔ غرضکہ یہ ترمیم اور اضافہ آپ کے دوران قیام عظیم آباد میں ہوگا، اللہ اللہ آپ وہاں سے روانہ ہوں تو مجھے اس مضمون کا کارڈ لکھ دیجئے گا تاکہ فلاں تاریخ پٹنہ میں پہنچیں گے۔ یہ فرمائش ہماری نوٹ کر لیجئے، ہمیں آپ سے اس مخصوص میں ملنے کی ضرورت ہے۔ والسلام

دعاگو
مبارک

چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے "جلوۂ داغ" کا مقدمہ لکھا، یہ مقدمہ کافی وقیع ہے اس مقدمہ میں بلخی صاحب مرحوم نے ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کے خاندانی حالات کے علاوہ ان کے طرز کلام سے بھی خصوصی طور پر بحث کی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

[1] "آپ نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی شعر یا کوئی مصرعہ بھی ایسا نہیں کہے جس میں استاد کی

---

[1] "جلوۂ داغ" کلام ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی ص ۱۷

زبان اور استاد کا رنگ اور طرز ادا نمایاں نہ ہو، یوں تو داغ دہلوی کے شاگردوں میں بہتیرے نامور اور مشاہیر شعرا ہوئے جن کے کلام اُردو شاعری کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ لیکن مبارک عظیم آبادی نے اتباع کلام کو اس حد کمال تک پہنچایا ہے کہ ان کے بیشتر اشعار داغ ہی کے اشعار معلوم ہوتے ہیں اور داغ کے اشعار کے ساتھ پڑھے جائیں تو کوئی فرق محسوس نہ ہو، دراصل ان کے کلام کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس نے ان کو داغ کے شاگردوں میں ایک امتیازی حیثیت کا تنہا وارث بنایا۔

"جلوۂ داغ" کی اشاعت کے بعد جناب عطا کاکوی نے مبارک صاحب کے کلام پر سخت اعتراض کیا دراصل یہ دبی ہوئی چنگاری ایک بار پھر سُلگی، چنانچہ عطا صاحب کے جتنے اعتراضات تھے انکا جواب ایک مضمون کی صورت میں رسالہ اشارہ پٹنہ ۱۹۵۴ء میں قسط وار شائع ہوا، یہ مقالہ جناب یاس بہاری کے نام سے شائع ہوا، دراصل یہ مقالہ بلخی صاحب مرحوم نے لکھا تھا۔ چنانچہ بلخی صاحب مرحوم کی خود نوشتہ تحریر راقم کے پاس محفوظ ہے۔ عطا صاحب کے جتنے اعتراضات تھے وہ سب بالکل بے جا تھے، اس امر کی شہادت کے لئے جناب محمود علی خاں صبا تلمذ شاد عظیم آبادی اور جناب قیوم خضر کا نام لینا کافی ہے۔ راقم نے اس موضوع پر عصر فصیح الدین میں تفصیلی طور پر بحث کی ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا سطور میں بلخی صاحب کے جتنے مضامین کا جائزہ لیا گیا ان سبھوں کو کتابی شکل میں "مقالات فصیح" حصہ اول اور "باقیات فصیح" حصہ دوم کے نام سے شائع کیا جا سکتا ہے، آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ چھان بین کے بعد بھی بلخی صاحب کے دو مضامین "عظیم آباد میں شعراء کے مزارات" شائع شدہ "معاصر" پٹنہ اور "صوبہ بہار میں غالب کی مقبولیت" شائع شدہ رسالہ نگار لکھنؤ مئی ۱۹۵۳ء دستیاب نہ ہو سکے۔ ذیل میں ہم بلخی صاحب مرحوم کے ان مضامین کی فہرست پیش کر رہے ہیں۔

(۱) منیر اور بہار میں مسلمانوں کی آمد رسالہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء

(۲) قلعہ رہتاس کی تاریخی سرگذشت شائع شدہ رسالہ معاصر پٹنہ ستمبر ۱۹۴۹ء

(۳) پلاموں کی تاریخی سرگذشت " رسالہ کوئل سہ ماہی ڈالٹن گنج ۱۹۶۱ء

مضمون	شائع شدہ
(۴) عظیم آباد کا ایک خوش نویس شاعر	شائع شدہ رسالہ صدائے عام پٹنہ خاص نمبر
(۵) مثنوی گوہر جوہری	" رسالہ مصور پٹنہ ماہ نومبر ۱۹۵۵ء
(۶) عظیم آباد کا ایک جوانمرگ شاعر	" رسالہ تہذیب پٹنہ اگست ۱۹۵۳ء
(۷) روز و ماہ و سال کی سرگذشت	" " " " " دسمبر ۱۹۵۲ء
(۸) اردو قواعد و لغت کی تدوین	" " " " اپریل ۱۹۵۳ء
(۹) اطراف پورنیہ کے بزرگوں کا حال	" " الانسان پورنیہ نمبر ۱۹۵۵ء
(۱۰) موسیقی اور شاعری	" " مصور پٹنہ جولائی ۱۹۵۶ء
(۱۱) راسخ عظیم آبادی	" " صنم پٹنہ بہار نمبر ۱۹۵۹ء ماہ نومبر
(۱۲) ایک ہندو شاعر کا عارفانہ کلام	" " " " نومبر ۱۹۵۸ء
(۱۳) تاریخ شعرائے بہار کا مؤلف	" " اشارہ فروری ۱۹۵۹ء
(۱۴) عظیم آباد میں امیر مینائی کی آمد	" " " ستمبر ۱۹۵۹ء
(۱۵) موزوں عظیم آبادی	" " " " جنوری ۱۹۵۹ء
(۱۶) اجاگر چند الفت	" " جنوری و فروری سنہ ۱۹۶۰ء
(۱۷) مولوی شجاع الدین رضوی	" " صبح نو اپریل ۱۹۵۸ء
(۱۸) امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں	" " " " مئی ۱۹۵۸ء
(۱۹) امیر مینائی	
(۲۰) شبلی نعمانی	" " " " اگست ۱۹۶۱ء
(۲۱) شوق نیموی	" " اشارہ دسمبر ۱۹۵۸ء
(۲۲) مخالفت قیاس	" " " اپریل ۱۹۵۴ء
(۲۳) سرقہ و توارد	" " " ۱۹۵۴ء
(۲۴) قدوی کا ایک مسدس	" " معاصر جلد ۲ حصہ ۷ ۱۹۵۴ء
(۲۵) شوق نیموی اور شوق قدوائی کا ایک شاگرد	" کو کی ڈالٹن گنج اپریل ۱۹۶۲ء

(۲۶) یاس بہاری — شائع شدہ رسالہ سہیل گیا مارچ ۱۹۵۹ء

(۲۷) عظیم آباد میں شعرائے کے مزارات — " " معاصر، پٹنہ

(۲۸) صوبہ بہار میں غالب کی مقبولیت — " " نگار لکھنو مئی ۱۹۵۳ء

(۲۹) نواب علی ابراہیم خاں خلیل — شائع شدہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۵۶ء

(۳۰) ملا غلام یحییٰ منیری — " " " " " " "

ریڈیائی مضامین

(۱) تاریخ کے لئے قلمی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ نشر شدہ ۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء

(۲) درگوں کی کہانی اور رہتاس گڑھ " ۴ اگست ۱۹۵۸ء

(۳) بہار شریف کا میلہ اور عرس " ۱۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

(۴) بھارت کا جہان گشت محمود گاواں " ۹ نومبر ۱۹۵۳ء

(۵) اکبر کے نورتن ابوالفضل اور فیضی " ۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء

(۶) جانسی کی پدماوت " ۱۲ دسمبر ۱۹۵۳ء

بلخی صاحب مرحوم کے چند مضامین ریڈیو اسٹیشن سے بھی نشر ہوئے، بلخی صاحب کا آخری ریڈیائی مضمون" امداد امام اثر کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات سے متعلق ہے، یہ مضمون ۱۷ جولائی ۱۹۶۱ء کو نشر ہوا، گویا یہ مضمون بلخی صاحب کا آخری ریڈیائی مضمون تھا۔

چھان بین کے بعد بلخی صاحب مرحوم کے جو ریڈیائی چند مضامین دستیاب ہوئے ان سارے مضامین کی نوعیت تاریخی ہے۔ ذیل میں ان مضامین کا سرسری طور پر جائزہ لیا جاتا ہے جو گاہے گاہے آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہوئے۔

بلخی صاحب مرحوم کا ایک ریڈیائی مضمون بعنوان" تاریخ کے لئے قلمی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ" مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو نشر ہوا، جیسا کہ پرانے کاغذات سے پتہ چلتا ہے۔ طوالت کے پیش نظر ان دستاویز کی نقل نہ پیش کر سکے، اصل مضمون کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

تاریخی کتابوں میں شاہ عالم اول کی حکومت کی تاریخ کا قلمی نسخہ موجود ہے اور شاید ہندوستان میں اس کے چند نسخے پائے گئے ہوں، ظفر نامہ تیموری کے قلمی نسخے بھی چند ہی جگہ پائے گئے ہیں۔ ایک نادر اور قابل ذکر چیز راجہ منگل کیشور کا وہ خود نوشتہ بھی ہے جس میں اُس نے نادر شاہ کے حملہ اور محمد شاہ کے دربار کی کارروائیوں کا حال شجاع الدین محمد خاں ناظم بنگال کو لکھا تھا، ایران کے صفوی بادشاہوں کی تاریخ "فوائد صفویہ" سلطان محمد صفوی کی لکھی ہوئی ہے۔ سفر نامہ کی بعض کتاب بھی بہت نادر ہے، سلطنت مغلیہ کے آخری زمانہ میں ملّا احمد سبحانی اس ملک میں آئے انہوں نے یہاں کے سماجی، تاریخی اور عام حالات کئی سو صفحوں میں لکھے تھے، اس کتاب کا قلمی نسخہ پایا جاتا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کا ایک تاریخی مضمون "درگوں کی کہانی اور رہتاس گڑھ" آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے مورخہ ۴ اگست ۱۹۵۸ء کو دوپہر لگ بھگ دو بجے نشر ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

رہتاس گڑھ راجہ ہرش چندر کے بیٹے رہتاسو کا بنایا ہوا ہے مگر چھوٹا ناگپور کے اراؤں لوگ کہتے ہیں جب کرناٹک سے آکر بسے تو انہوں نے رہتاس گڑھ بنایا مگر ان باتوں سے رہتاس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ گڑھ کسی ہندو کا بنایا ہوا ہے مگر اس وقت جو گڑھ کے دروازے اور دیواریں اور مکانات پائے جاتے ہیں وہ مغلوں کے ہیں، آئین اکبری اور تاریخ بدایوں کے مطابق ۱۵۳۸ء میں جب ہمایوں نے چنار گڑھ پر قبضہ کرکے بنگال پر چڑھائی کی تو شیر خاں نے چتاس داس کو لالچ دلاکر اپنی عورتوں اور خزانوں کو رہتاس گڑھ میں رکھنے کے بہانے سے ڈولیوں کے اندر سپاہیوں کو بھیج کر گڑھ پر قبضہ کرلیا۔

بلخی صاحب کا ایک مضمون "بہار شریف کا میلہ اور عرس" مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۳ء کو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے دن میں لگ بھگ دو بجے نشر ہوا اس مضمون میں بلخی صاحب نے حضرت شیخ مخدوم شرف الدین بہاریؒ کی سیرت اور ان کے اخلاق حسنہ پر یوں روشنی ڈالی ہے، موصوف نے یوں لکھا ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں بہار میں مخدوم شرف الدین احمد ایک بڑے نامی صوفی گذرے ہیں جو

یہ کہتے تھے کہ اصل دھرم اور مذہب اپنے پیدا کرنے والے یعنی خدا کی محبت اور پریم اور جنتا کی سیوا ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ سچے دل سے ملتے تھے اور کسی سے کینہ کپٹ نہ رکھتے تھے، ان کو دنیا کی کسی چیز کا لوبھ اور لالچ نہ تھا یہاں تک کہ سامراج تغلق شاہ نے راجگیر کا پرگنہ ان کی جاگیر مقرر کردیا تو انہوں نے اس کو نہ لیا اور واپس کردیا، یہ اپنے وقت کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی بھی تھے۔ عربی فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی ان کے بہت سے دوہے اب تک لوگوں کو یاد ہیں۔

بلخی صاحب کا ایک تاریخی مضمون "بھارت کا مہان کوت محمود گاواں" مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۳ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ بھارت کے تیرہویں صدی عیسوی میں دکنی علاقہ میں بہمن بادشاہوں نے حکومت کی تھی۔ دکنی بادشاہوں کے زمانہ میں ۱۴۶۷ء سے ۱۴۸۱ء تک محمود گاواں نے راج کی ترقی کے لئے بڑے بڑے کام کئے۔

آگے چل کر محمود گاواں کی سیرت پر بلخی صاحب مرحوم نے یوں روشنی ڈالی ہے۔

محمود گاواں بہت بڑا عالم تھا، ملا عبدالرحمٰن جامی سے اس کے خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا اور جامی نے بھی اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے، خود محمود گاواں کی تصنیف سے روضہ انشا اور دیوان اشعار یادگار بھی ہے، خط لکھنے کا خاص ڈھنگ رکھتا تھا۔

بلخی صاحب مرحوم کا ایک اور تاریخی مضمون "اکبر کے نورتن ابوالفضل اور فیضی" مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے دن کے لگ بھگ دو بجے نشر ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے دربار اکبری سے تعلق رکھنے والی دو بھاری بھرکم ادبی شخصیت فیضی اور ابوالفضل کے حالات لکھے ہیں۔ نیز ان لوگوں کے ادبی کارناموں کو بھی اجاگر کیا ہے، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے سب سے قبل فیضی کے حالات لکھے ہیں اور اس کے بعد ابوالفضل کے، اس مضمون کی ابتدا بلخی صاحب نے یوں کی ہے۔

اکبر بادشاہ کے نورتن مشہور ہیں، اس نورتن سے اس کے دربار کے ایسے نو اشخاص مراد ہیں جو اپنے آپ میں غیر معمولی قابلیتیں اور صلاحیتیں رکھتے تھے۔ انہیں کی ذات سے دربار کی خاص رونق رہتی تھی اور آج تقریباً چار سو برس کے بعد بھی یہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن میں اس وقت آپ کو ان میں سے صرف دو کے حالات سناتا ہوں، ایک ملک الشعراء فیضی دوسرے علامہ ابوالفضل۔

اس کے بعد بلخی صاحب مرحوم نے فیضی کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے لکھا ہے۔

فیضی شیخ مبارک کا بیٹا تھا جو اپنے زمانہ کا مشہور عالم فاضل تھا۔ فیضی ۱۵۴۷ء / ۹۵۴ھ میں آگرہ میں پیدا ہوا اس کا نام ابوالفیض تھا، شاعری میں کچھ دن اپنا تخلص مشہور رکھا پھر فیضی تخلص اختیار کیا، اس نام سے اس کی شہرت ہوئی۔ بچپن سے جوانی تک بلکہ یوں کہئے کہ اکبر کے دربار آنے کے قبل تک اس کی زندگی نہایت غربت میں گذری، علم و ادب اور شاعری میں یکتائے زمانہ ہوا۔ ۱۵۶۶ء / ۹۷۴ھ میں اس کی شاعری کا چرچہ سن کر اکبر نے اس کو دربار میں طلب کیا، فیضی کی اصل قابلیتوں کا پتہ اس کی تصانیف سے ملتا ہے، شاعری میں اس کا ایک دیوان تباشیر صبح ہے، غزلوں کے علاوہ اس کے نادر قصیدے ہیں جو بادشاہ کی تعریف میں لکھے گئے ہیں، اکبر کی فرمائش پر فیضی نے مخزن اسرار کے طور پر "مرکز ردایت" لکھی، لیلیٰ مجنوں کے طرز پر نل دمن لکھی جو کالی داس کی اصل تصنیف کی طرح فصیح و بلیغ ہے، کتاب ہفت پیکر کے جواب میں ہفت کشور اور سکندر نامہ کے جواب میں اکبر نامہ بھی لکھا تھا لیکن غالباً ناتمام رہ گئی اس لئے کہ اس کا مکمل نسخہ دریافت نہ ہوا، لیلاوتی سنسکرت میں حساب کی نامی کتاب ہے۔ فیضی نے اس کا بھی ترجمہ کیا، کہا جاتا ہے کہ اس نے بھاگوت اتھروید کا بھی ترجمہ کیا تھا لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

ابوالفضل کے حالات کے سلسلے میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے۔

اپنے بڑے بھائی فیضی سے بھی زیادہ مشہور ہوا۔ ۱۵۵۱ء / ۹۵۸ھ میں پیدا ہوا۔ بچپن سے

جوانی تک فیضی کی طرح اس کی زندگی بھی مصیبتوں اور پریشانیوں میں گذری، ابوالفضل ۱۵۷۳ء ۹۸۱ھ میں فیضی کی سفارش سے اکبر کے دربار میں آیا۔

ابوالفضل انشاپردازی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا، ہر مطلب کو جس طرح چاہتا تھا نہایت آسانی سے مناسب الفاظ میں ادا کرنے پر قادر تھا، اس کی تاریخی تصانیف میں اکبرنامہ اور آئین اکبری بہت مشہور ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم کا ایک اور مضمون " جائسی کی پدماوت " مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے پونے آٹھ بجے شب میں نشر ہوا، اس مضمون میں بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

پندرہویں صدی عیسوی میں ملک محمد جائسی ہندی کا بہت بڑا کوی گذرا ہے، اس کی لکھی ہوئی کتابوں میں پدماوت اور اکھراوٹ زیادہ مشہور ہیں، اس کا تھوڑا حال گریرسن نے بھی لکھا ہے۔

مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کی مضمون نگاری کا جائزہ لینے کے بعد ان کی بھرپور علمی و ادبی شخصیت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

لہ (فوٹ نوٹ صہ ۳۲۱ کا) اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ رانچی وومینس کالج کی شعبۂ اردو کی ریڈر محترمہ ڈاکٹر رفعت سجاد نے ہاتف بجنوی کی شاعری پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ہاتف مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام ان کی پوتی مقیم نواده (بہار) سے حاصل کیا۔ نیز ہاتف مرحوم کی دوسری اہلیہ سے ملاقات کی اس وقت ان کی عمر لگ بھگ نوے سال تھی۔

لہ بلخی صاحب مرحوم کا یہ خیال ہے کہ زیبدوے کی جگہ زیبدادر اصحیح ہونا چاہیئے۔ کتبہ کندہ کرنے والے نے غلطی سے زیبدوے کندہ کر دیا۔ اس موضوع پر جناب اختر مظفرپوری اور جناب ضبط مرتہاری اور بلخی صاحب کے مابین رسالۂ صبح نو میں ادبی بحث چلی۔

باب دہم

فصیح الدین بلخی بہ حیثیت شاعر

فصیح الدین بلخی مرحوم نے ادبی دنیا میں شاعری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے ادب میں شعری صنف سے زیادہ نثری صنف کی طرف توجہ کی بلکہ یوں کہیے کہ انہوں نے دنیائے ادب میں ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شخصیت کو منظر عام پر لانے کی کوشش نہیں کی لیکن بلخی صاحب مرحوم نقد شعر و سخن کا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ شاعری کے تمام رموز و نکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ فنی عروض اور فن بلاغت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہیں خود بھی شعرا کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کے تینوں بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم، جناب عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی مرحوم اور جناب نظام الدین بلخی مرحوم داغ دہلوی کے اچھے شاگردوں میں تھے۔

آج کے مرحوم عظیم آباد میں کل کا بخشی محلہ علم و ادب کا گہوارہ تھا، بخشی محلہ میں شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں، غالب دہلوی کے شاگرد جناب فخر الدین سخن ثم دہلوی عظیم آبادی یہاں آکر اس طرح مقیم ہوئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ راقم الحروف نے گذشتہ ابواب میں اس کی تفصیلی بحث کی ہے۔ سر دست دہرانے کی ضرورت نہیں۔ گویا اس ادبی ماحول میں بلخی صاحب مرحوم نے آنکھ کھولی جناب عبد الرؤف ندوی مرحوم نے بلخی صاحب مرحوم کی شاعری سے متعلق اپنا یوں اظہار خیال کیا ہے۔

”آپ کو شعر گوئی سے بھی مذاق تھا اور پاکیزہ مذاق تھا مگر اصناف شاعری میں

قطعات اور تاریخی قطعات پر طبع آزمائی کرتے ہیں نے پایا ہے ...... آپ کے مذاق شاعری اور نقد شعر و سخن کا اندازہ آپ کے کتابچہ 'انشاد شاد' سے ہو سکتا ہے کہ استاد الشعرا شاد عظیم آبادی کی ظاہری و باطنی، معنوی معائب و محاسن کی جزدی گرفت کی گئی ہے۔ اس کے معیار پر اساتذہ سخن کے کلام بھی نہیں اترتے ہیں"۔ [1]

اس کے علاوہ بلخی صاحب مرحوم نے عظیم آباد کی شعری محفلیں دیکھیں۔ انہوں نے شاد عظیم آبادی اور ابلیغ کے جھگڑے دیکھے۔ شعرا کی معاصرانہ چشمکیں دیکھیں، عظیم آباد کے نامی گرامی مشاعروں میں شرکت کرنے کے مواقع انہیں ملے، چنانچہ یہ شاعرانہ فضا بلخی صاحب مرحوم کو شاعر کی حیثیت سے ابھرنے میں کارآمد اور کارساز ثابت ہوئی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے شاعری میں اپنے ابتدائی دور میں کس سے اصلاح لی یہ کہنا مشکل ہے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں کسی سے بھی اصلاح نہ لی ہو۔ بہرکیف ان کے کلام میں داغ دہلوی اور میر انیس کی گہری چھاپ ہے۔ بلخی صاحب مرحوم کے بڑے بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم غالب کے رنگ میں شعر کہتے تھے اور منجھلے بھائی راز بلخی تاسخ کے رنگ میں شعر کہا کرتے تھے، جہاں تک ان کے منجھلے بھائی کا تعلق ہے جناب نظام الدین بلخی مرحوم باضابطہ طور پر داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔

بلخی صاحب مرحوم کا کلام بہت ہی مختصر ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا۔ تلف ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی بیاض محلہ گدڑی پٹنہ سیٹی کے مکان سے چوری ہو گئی۔ ان کا کلام جو کچھ بچا ہے وہ ان کی یادداشت کا نتیجہ ہے۔

جناب ہجور شمسی اور جناب کیول کرشن شرما کی بدولت ان کا کلام تھوڑا بہت محفوظ ہو سکا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم اپنی وفات سے ایک سال بیشتر اپنے صاحبزادے کے یہاں ڈالٹن گنج تشریف لائے تھے چنانچہ ان دونوں حضرات کے بارہا اصرار پر ان کی یادداشت میں جو کچھ محفوظ تھا وہ کلام آج موجود ہے۔ بہرحال بلخی صاحب مرحوم کے مختصر سے کلام کی روشنی میں ان کے

---

[1] فصیح الدین بلخی مرحوم کی عظیم شخصیت مقالہ سید عبدالرؤف ندوی مرحوم اورنگ آبادی مخطوطہ

کلام کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کے کلام کی جہاں تک خصوصیت ہے ان کا کلام ابتذال مضامین اور سوقیانہ پن سے بالکل پاک ہے۔ جہاں تک ان کے کلام کا تعلق ہے ان کے کلام میں میر انیس اور داغ کی فصاحت نمایاں طور پر موجود ہے یعنی بلخی صاحب مرحوم کی غزلوں کا ہر شعر فصاحت کا بہترین نمونہ ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی تیری تیغ تیز　　پابند وہ بھی حلقۂ جوہر میں رہ گئی

اب تک ہے نقش دل پہ ترے غیر کا سخن　　مٹتی نہیں لکیر جو پتھر میں رہ گئی

دل پہ ستم جو کم ہے اثر میں زیادہ ہے　　تھوڑا بھی لطف ہے تو نظر میں زیادہ ہے

بہتر ہے صاحبی سے قناعت کی زندگی　　گوشہ میں چھپ کے عمر ہم اپنی بسر کریں

شعرائے عظیم آباد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے میر کے رنگ و آہنگ کو بھی اپنے کلام میں برتا ہے۔ راسخ، جوشش، تپاں اور سجاد ان شعرائے میر کے کلام کے گہرے رنگ کو قبول کیا۔ ضیا عظیم آبادی تو بالکل میر ثانی ہیں اور آج بھی ان کے مشہور شعر کو میر کے شعر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے

ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں　　جب سارا عالم سوتا ہے

یہاں تک کہ شعرائے متاخرین کے کلام میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر ملتی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم کا جس دور سے تعلق ہے اس دور کے بھی شعرائے میر ہی کے رنگ کو اپنے کلام میں نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر شاد عظیم آبادی، ضیا عظیم آبادی، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، مشرقی میری، باقر عظیم آبادی، اکبر داناپوری، مرزا یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ شعراء کے کلام میں میر کا رنگ موجود ہے۔ راقم نے گذشتہ ابواب میں عظیم آباد کے ادبی پس منظر میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ بہر حال بلخی صاحب مرحوم نے بھی میر کے رنگ کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یوں دل کی آرزو دلِ مضطر میں رہ گئی　　آندھی سی اٹھ کے گنبد بے در میں رہ گئی

حکمت میں گرچہ ہم بھی فلاطوں سے کم نہیں ٭ کیا کیجئے کمی جو مقدر میں رہ گئی

یہاں تک کہ شاعر کی یہ بھی خواہش ہے کہ مرنے کے بعد اس کا نام و نمود دنیا میں برقرار نہ رہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے کس قدر سلیس شعر کے ڈھانچے میں ڈھالا ہے۔

اس کی کسے ہوس ہے کہ نام و نشاں رہے ٭ دنیا میں میں رہوں نہ میری داستان رہے

انسان کو مرنے ہی کے بعد چین و سکون نصیب ہوتا ہے کیونکہ اس دنیا میں راحت نصیب نہیں ہوتی اور مرنے کے بعد انسان کو دو گز زمین بھی بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ اس مضمون کو بلخی صاحب مرحوم نے یوں پیش کیا ہے۔

راحت ہمیں کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی ٭ دو گز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی

بلخی صاحب مرحوم کے کلام میں بے ثباتی عالم کا بھی حال ملتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کا شاعر بے ثباتی عالم کا رونا روتا ہے چنانچہ اردو شاعری میں میرؔ یا غالبؔ یا آتشؔ یا اقبالؔ جیسے شعرا کے کلام میں بے ثباتی عالم کا حال ملتا ہے۔ بہر حال بلخی صاحب مرحوم کی بھی نگاہ اس حقیقت سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اس خاک نے بڑے بڑے شاہان نامور کو اپنی آغوش میں سلا دیا۔ آج نہ شہنشاہ اکبر کی سطوت ہے نہ شاہجہاں کی امارت بہر حال شاعر اس مضمون کو یوں پیش کرتا ہے۔

کیا کیا ملے ہیں خاک میں شاہان نامور ٭ اکبر رہے جہاں میں نہ شاہجہاں رہے

چنانچہ مرنے کے بعد لحد میں کسی انسان کا استخواں بھی باقی نہیں رہتا خواہ کسی کا مقبرہ تاج محل جیسا کیوں نہ ہو بقول شاعر ؎

روئے زمیں پہ تاج محل بھی بنا تو کیا ٭ باقی نہ جب لحد میں کوئی استخواں رہے

موت کے سامنے رستم جیسے مشہور پہلوان کا بھی زور نہیں چلتا۔ لہٰذ بہتر یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو بہت عاجزی و انکساری کی زندگی گذارنی چاہئے ؎

پیک اجل کے سامنے رستم کا زور کیا ٭ میں یوں رہوں کہ جیسے کوئی ناتواں رہے

اس دنیا میں انسان بہت کچھ کمال حاصل کرتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا زوال بھی ہوتا ہے چنانچہ شاعر اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

دورِ فلک میں کیجئے حاصل کمال کیا ؎ ہوتا نہیں کمال کو آخر زوال کیا

بلخی صاحب مرحوم کی بعض غزلوں کے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں نظم و نثر کا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ؎

دنیا میں دوست ہی نظر آتے ہیں ہر طرف ؎ دشمن ہمارے کر گئے کب انتقال کیا

پیری میں کیا کروں ہوس عشق دعا شقی ؎ بجھتے ہوئے چراغ کو دوں اشتعال کیا

رہ رہ کے دیکھتے ہیں جو ترچھی نگاہ سے ؎ اُلٹی چھری سے ہم کو کریں گے حلال کیا

خواہاں جو خیر کا ہو وہ دنیا میں یوں رہے ؎ آقا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو

بلخی صاحب مرحوم اپنے دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھی مشاعروں میں بھی اپنی غزلیں سنایا کرتے تھے۔ اس کی دو مثالیں پیش کرتے تھے۔

محمڈن اسکول کے ہڈ ماسٹر جناب سید انوار کریم مرحوم ایک علم دوست انسان تھے۔ ان کی علم دوستی کا حال یہ تھا کہ محمڈن اسکول پٹنہ سیٹی میں برابر عظیم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی لہٰذا بلخی صاحب مرحوم نے اپنی ایک طرحی غزل جو اس مشاعرہ میں پڑھی تھی اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

طول شب فراق کا شکوہ اگر کریں ؎ اک رات ہی میں عمر ہم اپنی بسر کریں

اور اس غزل کا مقطع یہ ہے

دعویٰ سخن کا ہم کو گوارا نہیں فصیحؔ ؎ پیشِ نظر ہو عیب تو عرضِ ہنر کریں

دوسری مثال یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم اپنی وفات کے ایک سال بیشتر اپنے صاحبزادے پروفیسر نادم بلخی کے یہاں تشریف لائے تھے چنانچہ حلقۂ شعر سخن ڈالٹن گنج کے پچیسواں طرحی مشاعرہ کی دو طرحی غزلیں بلخی صاحب موصوف نے مشاعرہ میں پڑھی تھیں اور یہ دونوں غزلیں بلخی صاحب مرحوم کی آخری غزلیں ہیں، یہ مشاعرہ بلخی صاحب مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا اور یہ دونوں طرحی غزلیں بلخی صاحب مرحوم نے جناب مہجور شمسی کے اصرار پر کہی تھیں پہلی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

بے حکم کچھ کرے یہ کسی کی مجال کیا ؎ اپنے کئے پہ پھر ہو مجھے انفعال کیا

اور اس غزل کا مقطع یہ ہے ؎

دورِ فلک میں عیش میسّر ہو گر فصیحؔ ٭ اک روز بھی بہت ہے مجھے ماہ و سال کیا

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے ؎

دنیا سرا ہے اس میں یہی اہتمام ہو ٭ پیہم کسی کا کوچ کسی کا مقام ہو

اس غزل کا مقطع یہ ہے ؎

اپنی زباں پہ حرف نہ آئے کبھی فصیحؔ ٭ روح القدس بھی ہم سے اگر ہمکلام ہو

بلخی صاحب مرحوم فن شاعری کے رموز و نکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شادؔ عظیم آبادی جیسے مشہور شاعر کے کلام کی فنی خامیاں اپنے کتابچہ انشاد شادؔ میں پیش کی ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم سے اکثر معتقدین شعرا مشورہ سخن کرتے تھے چنانچہ دور جدید کے مشہور شاعر جناب حسن نعیم کا خود قول ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں بلخی صاحب مرحوم سے مشورہ سخن کیا تھا اور حسن نعیم کا یہ بھی قول ہے کہ آج اردو شاعری میں جو انہوں نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے وہ بلخی صاحب کی دین ہے۔

جناب وفاؔ براہی بھی اکثر ان سے مشورہ سخن کرتے تھے، مثال کے طور پر داغؔ دہلوی کے نامور شاگرد جناب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی اپنی کوئی غزل بھی بغیر بلخی صاحب مرحوم کو دکھائے ہوئے نہیں پڑھتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی صحبت کے باعث بلخی صاحب مرحوم نے داغؔ کی شاعری کا گہرا رنگ قبول کیا اور بلخی صاحب مرحوم کا ہر شعر بالکل داغؔ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اردو شاعری میں میر انیسؔ اور داغؔ دہلوی فصاحت کے بادشاہ ہیں، بلخی صاحب کی غزلوں کا ہر شعر فصاحت کا اعلیٰ نمونہ ہے، بہر حال بلخی صاحب مرحوم نے اپنی شاعری میں میر انیسؔ اور داغؔ دہلوی کے رنگ کو قبول کیا۔

بلخی صاحب مرحوم فن شاعری میں تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے، جہاں تک کہ صوبہ بہار میں فن شاعری میں تاریخ گوئی کا سوال ہے اس فن میں جناب بسملؔ سنسہاروی مرحوم اور نواب محمد نقی جان قمرؔ گیاوی مرحوم اس فن میں کمال رکھتے تھے لہٰذا بلخی صاحب مرحوم کے کچھ حاصل شدہ تاریخی قطعات درج کئے جاتے ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنے بڑے بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم کے لوح مزار کے کتبہ کا تاریخی قطعہ کہا تھا، یہ تاریخی قطعہ فارسی زبان میں ہے جو درج ذیل ہے۔

قطعہ تاریخ وفات برائے لوح مزار حضرت حفیظ الدین بلخی مرحوم

سرہانہ: کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

جان بجاں آفریں سپرد آخر   آں کریمے کہ بود مرد سخی
رونق خانداں حفیظ الدین   صاحب فضل بلخی نامی
زآنکہ از نسل ابراہیم بود   نسب ظاہر شرافت نسبی
کان احسان معدن اخلاص   شمع فیض و مجمع خوبی
ذی مروت، خلیق دریا دل   صاحب جود ہمت عالی
نکتہ داں و ادیب دانشمند   ماہر علم و فن فہیم و ذکی
قائل لا الٰہ الا اللہ   پیروی دین حق محب نبی
مسجد کہنہ در وطن نو کرد   از برائے رضائے رب قوی
رفت از مرگ او سرور عالم   گم شد از دل نشان زندہ دلی
زور بازو من اجل بشکست   دور ماندم ز بے پر و بالی

سال فوتش دل حزیں فصیح
گفت فردوس آشیاں بلخی

۱۲۵۴ھ

قطعہ تاریخ وفات برائے لوح مزار جناب سید جمال الدین بلخی وکیل

عزیز ما جمال الدین بلخی   لئیق و حق شناس و فیض گستر
حلیم نیکخو، پاک طینت   فہیم و صاحب ادراک جوہر
پئے گلگشت جنت رفت ازیں جا   بفردوس بریں از دار شش در
ز مرگ در دل احباب پژمرد   چو گل در گلستاں از باد صرصر

بجست از دل چو تاریخ وفاتش	فصیح عاجز و غمگین و مضطر
بقصر الخلد شد گفتا سن فوت	غم ایں مرگ ہم تاریخ دیگر

۱۳۶۱ھ

جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم نے اپنے مقالہ "فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت" میں بلخی صاحب مرحوم کے دو تاریخی قطعات کو درج کیا ہے اول الذکر تاریخی قطعہ ان کے برادر اکبر سید حفیظ الدین بلخی مرحوم کا اور دوم قطعہ تاریخ جامع مسجد اورنگ آباد کا ہے۔

سرنامہ قطعہ ان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا

در زماں سید حامی دیں	شاہ اورنگ زیب عالمگیر
خان والا گہر فدائی خاں	از برائے رضائے رب قدیر
بر سر راہ مسجد جامع	ساخت بہر نمازیاں کثیر
دل عبادت گہ خدا گفتا	بہر سال بنائے ایں تعمیر

۱۱۰۷ھ

جناب مولوی احمد اللہ ندوی مصنف تذکرہ مسلم شعرائے بہار نے جلد سوم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کا ذکر شد و مد کے ساتھ کیا ہے۔ موصوف نے نادم بلخی کے مجموعہ کلام آغاز سحر کے مقدمہ کے حوالے سے کیا ہے، اس مقدمہ کو حضرت مہجور شمسی مرحوم نے سپرد قلم کیا ہے۔ احمد اللہ ندوی نے بلخی صاحب مرحوم کے ضمن میں یوں لکھا ہے۔

[1] فصیح الدین نام فصیح تخلص بلخی نسبی نسبت ہے، والد ماجد کا نام ڈاکٹر غیاث الدین

نوٹ: عبدالرؤف ندوی نے اپنے مقالہ کے حاشیہ میں یوں لکھا ہے جو درج ذیل ہے:۔
شاہ راہ شیر شاہی پر چوک بازار میں یہ کتبہ اورنگ زیب مسجد جامع مسجد کے نام سے زبان زد ہے۔ کہا جاتا ہے یہ مسجد عہدی عالمگیری کی یادگار ہے مگر کوئی کتبہ نہیں ہے، راقم نے تعمیر نو کے لئے اس کے تاریخی قطعہ کی فرمائش کی کہ سنگ مرمر پر کندہ کرا کر نصب کردوں تاکہ اس کی تاریخی حیثیت معلوم ہو جائے۔

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ مسلم شعرائے بہار مصنفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی جلد سوم ص ۲۲۷ تا ص ۲۲۸

بلخی ہے، عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے اور اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

"۱۸۸۵ء سال ولادت ہے اور ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء بعمر ۷۷ سال داعی اجل کو لبیک کہا۔"

جناب فصیح الدین بلخی مرحوم تاریخ نگاری، تذکرہ نویسی اور تحقیق زبان وادب کے کمال کی بدولت نہ صرف صوبہ بہار بلکہ پورے پاک و ہند میں متعارف تھے۔

موصوف کی تصنیفات میں تاریخ مگدھ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہے ۶۴۲ء ق م سے ۱۹۴۳ء تک کی کامل تاریخ ہے، دوسری کتاب تذکرہ نسوان ہند ہے جس میں متحدہ ہندوستان کی پانچ سو خواتین یعنی شاعرات مصنفات، کاملات، شہرات اور مقدسات کا تذکرہ ہے۔ تذکرہ[1] ہندو شعرائے بہار اس کے علاوہ بعض کتابیں موسوم بہ دستور سخن اور رسالہ تذکیر و تانیث کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عنقریب شائع ہونے والی ہیں، ایک تنقیدی رسالہ النشاد شاد بھی شائع ہو چکا ہے، حکومت پاکستان کے ایما سے پنجاب یونیورسیٹی نے جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ترتیب دیا ہے اس میں غلام یحییٰ بہاری اور نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے حالات یونیورسیٹی نے آپ ہی سے لکھوائے ہیں۔

اس کے بعد مولوی احمد اللہ ندوی نے بلخی صاحب مرحوم کی غزلوں کے اشعار بطور نمونہ پیش کئے ہیں مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کے کلام کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک روایتی شاعر تھے اور اساتذہ کی قدیم روایت کو اپنے کلام میں بحسن و خوبی پیش کیا کرتے تھے۔

غزل (۱)

یوں دل کی آرزو دل مضطر میں رہ گئی — آندھی سی اُٹھ کے گنبد بے در میں رہ گئی
مجھ کو ملی شراب وہ، دور اخیر میں — جو تہ کسی کی پی کے جو ساغر میں رہ گئی
مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی تیری تیغ تیز — پابند وہ بھی حلقۂ جوہر میں رہ گئی
مثل حباب غرق ہوئے بحر عشق میں — پانی کی بوند مل کے سمندر میں رہ گئی

---

[1] اس تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے شائع ہونے کا علم مؤلف تذکرہ مسلم شعرائے بہار کو نہ تھا۔

حکمت میں گرچہ ہم بھی فلاطوں سے کم نہیں
کیا کیجیے کمی جو مقدر میں رہ گئی

اُس فتنہ گر سے بڑھ کے قیامت نہ چل سکی
اُٹھ اُٹھ کے وہ بھی ایک ہی ٹھوکر میں رہ گئی

دل امتحانِ بوئے وفا میں تو جل گیا
خوشبو کسی کی زلف معنبر میں رہ گئی

گل ہائے رنگ رنگ کو سمجھے تھے لاجواب
دیکھا تو اک نہ ایک کمی ہر میں رہ گئی

اب تک ہے نقش دل پہ ترے غیر کا سخن
مٹتی نہیں لکیر جو پتھر میں رہ گئی

کھلتی نہیں فصیح حقیقت جہان کی
مانند چرخ عقل بھی چکر میں رہ گئی

(۲)

وہ بے وفا کہیں کے کوئی مر ہی کیوں نہ جائے
الفت جتائے جائیں گے ہم سر ہی کیوں نہ جائے

جاتی ہے جان مال کے جانے کا ذکر کیا
لعل و زمرد و زر و گوہر ہی کیوں نہ جائے

معراج ہے اسیرِ قفس کے لئے یہ سیر
صحنِ چمن میں اُڑ کے کوئی پر ہی کیوں نہ جائے

نقلِ مکاں نہیں یہ قیامت کا ہے سفر
اس گھر کو چھوڑ کر کوئی اس گھر ہی کیوں نہ جائے

چھٹتا ہے کوئی عالمِ بالا سے واسطہ
خاکی نژاد خاک کے اندر ہی کیوں نہ جائے

واعظ کو ذکرِ کوثر و تسنیم سے ہے کام
ہر چند آبرو سرِ محشر ہی کیوں نہ جائے

سنتا ہے کون سحر بیانی وہاں فصیح
ہر چند سیکھ کر کوئی منتر ہی کیوں نہ جائے

(۳)

راحت مجھے کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی
دو گز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی

میں شوقِ جبہ سائی میں در تک پہنچ تو لوں
اُس سنگِ آستاں سے جبیں مل ہی جائے گی

یوں خاک میں جو چاند سی ملتی ہیں صورتیں
اک روز آسماں سے زمیں مل ہی جائے گی

کس کس طرح سے ہم نے چھپایا ہے رازِ عشق
داد اس کی تجھ سے پردہ نشیں مل ہی جائے گی

ہاں اپنے دل میں حوصلۂ عشق چاہیے
صورت کوئی حسین سے حسیں مل ہی جائے گی

راحت ملی نہ روئے زمیں پر کہیں فصیح
کیوں کر کہیں کہ زیرِ زمیں مل ہی جائے گی

(۴)

دل پر ستم جو کم ہے اثر میں زیادہ ہے
تھوڑا بھی لطف ہے تو نظر میں زیادہ ہے

کیا کم یہ فائدہ تھا کہ دشمن نہ تھا کوئی
نقصان عیب سے بھی ہنر میں زیادہ ہے

راحت کبھی میرے حق میں جراحت سے کم نہیں
جب دل میں درد کم ہے جگر میں زیادہ ہے

اچھے رہے جو عشق میں بے خانماں ہوئے
ایسوں کی قدر آپ کے گھر میں زیادہ ہے

گھر سے اُٹھا کے لاتے ہیں احباب دوش پر
منزل سے چین راہ گذر میں زیادہ ہے

عمر گذشتہ کو ہمیں رونا ہے عمر بھر
آنسو ابھی سے دیدۂ تر میں زیادہ ہے

انسان اس جہاں میں برابر ہیں سب فصیح
کم ہے نہ کوئی اپنی نظر میں زیادہ ہے

(۵)

طول شب فراق کا شکوہ اگر کریں
اک رات ہی میں عمر ہم اپنی بسر کریں

بہتر ہے صاحبی سے قناعت کی زندگی
گوشے میں چھپ کے عمر ہم اپنی بسر کریں

کٹوائیں سر کہ دل کو کریں نذر امتحاں
گردن کو ہم جھکائیں کہ سینہ سپر کریں

میں بھی نگاہ شوق کا آئینہ دار ہوں
میری طرف بھی اہل نظر اک نظر کریں

دیکھا ادھر تو شکر کیا اس نگاہ کا
کس منہ سے ہم شکایت درد جگر کریں

دل خوش نہ ہو تو سیر جہاں اک وبال ہے
گذریں ہزار رنج جہاں ہم گذر کریں

قائل ہیں یوں تو ہم بھی کہ واعظ ہے خوش بیاں
باتیں وہ کام کی ہیں جو دل پر اثر کریں

مشق فنا سرشت میں اپنی ازل سے ہے
عمر ابد بھی ہو تو یہی عمر بھر کریں

دو دن کی زندگی بھی ہمیں تو وبال ہے
کیا عمر جاوداں کی تمنا خضر کریں

تیری گلی کی سیر بھی ہے لامکاں کی سیر
رستہ کھلا ہوا ہے جہاں تک سفر کریں

دعویٰ سخن کا ہم کو گوارا نہیں فصیح
پیش نظر ہو عیب جو عرض ہنر کریں

(۶)

اس کی کسے ہوس ہے کہ نام و نشاں رہے
دنیا میں میں رہوں نہ مری داستاں رہے

دو دن کی زندگی پہ بھروسہ ہو کس طرح
دل مطمئن ہو عیش اگر جاوداں رہے

کیوں آرزوئے منصب و مال و منال ہو
کیوں دل میں خواہش حشم عزوجاں رہے

کیوں آبرو ہو اپنی کسی کی نگاہ میں
کیوں خوبیوں کا اپنی کوئی قدرداں رہے

پستی میں ہے زمیں بلندی پہ آسماں
بہتر یہ ہے کہ اپنا قدم درمیاں رہے

تھوڑی سی زندگی ہے وفا کیا وفات کیا
یکساں ہے اعتماد ہو یا امتحاں رہے

کیا کیا ملے ہیں خاک میں شاہانِ نامور
اکبر رہے جہاں میں نہ شاہ جہاں رہے

روئے زمیں پہ تاج محل بھی بنا تو کیا
باقی نہ جب لحد میں کوئی استخواں رہے

پیک اجل کے سامنے رستم کا زور کیا
میں یوں رہوں کہ جیسے کوئی ناتواں رہے

ہاں خوگر ستم کی تسلی اسی میں ہے
جب تک کہ یہ زمیں ہے یہی آسماں رہے

آئی تو ہوں جہاں میں خانہ خرابیاں
باقی بتوں کا گھر نہ خدا کا مکاں رہے

کس طرح آئے رازِ حقیقت زبان پہ
پردے کی بات دل ہی کے اندر نہاں رہے

نخوت ہے آسماں میں کدورت زمین میں
دل میں جگہ نہ دوں تو محبت کہاں رہے

ارباب دل کو چاہیے تھوڑی سی بیخودی
کوچے میں اپنے پیر مغاں کی دکاں رہے

سیری نہ ہوگی عالم ہستی کی سیر سے
اپنا سفر مکاں سے تا لامکاں رہے

تھوڑی بھی ہو تو کم نہیں فرصت نشاط کی
اتنی خوشی بہت ہے کہ دل میں نہاں رہے

صہبا ہو اور صحبت احباب زندہ دل
پیری میں بھی فصیح طبیعت جواں رہے

(۷)

مانا کہ زہد و طاعت و تقویٰ بھی چاہیے
دنیا میں کچھ تو لذت دنیا بھی چاہیے

کیا لطف زندگی کا کوئی آرزو نہ ہو
پہلو میں دل تو دل میں تمنا بھی چاہیے

زندہ ہیں سے نام ہیں فرہاد و قیس کے
اب ان کے بعد ذکر ہمارا بھی چاہیے

کیا قدر حسن کی ہے اگر جلوہ عام ہو
بے مثل ہے جمال تو پردہ بھی چاہیے

اجڑے ہوئے چمن میں بنے کیونکر آشیاں
ملتا نہیں اگر کوئی تنکا بھی چاہیے

سیدھی طرح نہ مانیں گے ہرگز دغا شعار ۔۔۔ کچھ مکر بھی فریب بھی دھوکا بھی چاہیے
نرگس کو کیا ہو سوئے گل و لالہ التفات ۔۔۔ ذوقِ نظر کو دیدۂ بینا بھی چاہیے
یوں کس طرح کہوں مجھے مد نظر ہے کیا ۔۔۔ کچھ آپ کی طرف سے اشارا بھی چاہیے

(۸)

بے حکم کچھ کرے یہ کسی کی مجال کیا ۔۔۔ اپنے کئے پہ پھر ہو مجھے انفعال کیا
ابرو و روئے یار کی ان سے مثال کیا ۔۔۔ رتبہ میں بدر کیا بھلا اور ہلال کیا
دورِ فلک میں کیجئے حاصل کمال کیا ۔۔۔ ہوتا نہیں کمال کو آخر زوال کیا
دنیا میں دوست ہی نظر آتے ہیں ہر طرف ۔۔۔ دشمن ہمارے کر گئے سب انتقال کیا
فرقت میں ایک روز بھی جینا محال ہے ۔۔۔ گذریں گے اس طرح سے مرے ماہ و سال کیا
ہم ان کو دوست وہ ہمیں دشمن سمجھتے ہیں ۔۔۔ ان کا گمان کیا ہے ہمارا خیال کیا
صرصر کا خوف، برق کا دھڑکا، خزاں کا ڈر ۔۔۔ باغِ جہاں میں آکے کوئی ہو نہال کیا
بھٹی کی ہوش یاب کہ جامِ مئے طہور ۔۔۔ رندوں کو امتیازِ حرام و حلال کیا
پیری میں کیا کروں ہوسِ عشق و عاشقی ۔۔۔ بجھتے ہوئے چراغ کو دوں اشتعال کیا
افسردہ خاطری کو بیاباں کی ہے تلاش ۔۔۔ سیرِ چمن سے ہو گی طبیعت بحال کیا
بیمار ہو جو نرگسِ بیمار کی طرح ۔۔۔ کوئی طبیب اس کی کرے دیکھ بھال کیا
مرہم کی جستجو ہے عبث تجھ کو چارہ گر ۔۔۔ زخمِ جگر کو ہو گا مرے اندمال کیا
رہ رہ کے دیکھتے ہیں جو ترچھی نگاہ سے ۔۔۔ اُلٹی چھری سے ہم کو کریں گے حلال کیا
کیوں جائیں کوہ طور پہ دیدار کے لئے ۔۔۔ دل میں نہ دیکھ لیں گے ہم اس کا جمال کیا
اللہ نے مجھے دلِ بے مدعا دیا ۔۔۔ آئے مری زبان پہ حرفِ سوال کیا
آتا نہیں جو رحم کبھی حالِ زار پر ۔۔۔ دل کو مرے وہ مفت کا سمجھے ہیں مال کیا
اک کشمکش ہے دونوں طرف ہمنشیں نہ پوچھ ۔۔۔ ان کا خیال کیا ہے ہمارا خیال کیا
سودائے خام اور طمعِ خام جانئے ۔۔۔ دعویٰ عشق کیا ہے امید وصال کیا

جنت کو بھول جائے جو کوئی صنم ملے ÷ زاہد ہے سبز باغ سے دل میں نہال کیا
دورِ فلک میں عیش میسر ہو گر فصیح ÷ اک روز بھی بہت ہے مجھے ماہ و سال کیا

(۹)

دنیا سرا ہے اس میں یہی اہتمام ہو ÷ پیہم کسی کا کوچ کسی کا مقام ہو
جبتک نگاہِ شوق کو لپکا ہے دید کا ÷ ممکن نہیں کہ دل کی کوئی روک تھام ہو
دنیا ہے رہگذر یہ ٹھہرنے کی جا نہیں ÷ گھر کی طرح کسی کا یہاں کیا قیام ہو
اس عالمِ خراب کو جنت بنائیے ÷ دنیا میں جو کبھی نہ ہوا ہو وہ کام ہو
آشفتہ سر ہوں مجھ کو غرض بوئے گل سے کیا ÷ ہو زلف مشک بو تو معطر مشام ہو
میں انجمن میں شمع کا پروانہ کیا بنوں ÷ کیوں اس سے لو لگاؤں جو صورت حرام ہو
موقوف حشر پہ نہیں کچھ بھی ہجوم خلق ÷ تو جلوہ گر جہاں ہو وہیں اژدہام ہو
خواہاں جو خیر کا ہو وہ دنیا میں یوں رہے ÷ آقا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو
دل پرسشِ گناہ سے گھبرائے کس لئے ÷ اس کی رضا ہے عفو ہو یا انتقام ہو
کیا فاقہ مستیوں میں ملے لطف زندگی ÷ یکساں ہے روز عید کہ ماہ صیام ہو
اپنی زباں پہ حرف نہ آئے کبھی فصیح ÷ روح القدس بھی ہم سے اگر ہمکلام ہو

اس کے علاوہ چند غزلوں کے متفرق اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

ہیبت قضا کی دل میں سمائی ہوئی بھی ہے ÷ آئی نہیں اجل مگر آئی ہوئی بھی ہے

دیکھ کر بھر دیدہ آنکھوں کو ارماں رہ گیا ÷ شوق پیدا ہو کے میرے دل میں پنہاں رہ گیا
عشق میں اس بت کے آخر لو لگی اللہ سے ÷ شوق بن کر اک چراغ زیر داماں رہ گیا
رہنے والا تھا کوئی چکر مری تقدیر میں ÷ بن کے تیرا حلقہ وہ زلف پریشاں رہ گیا
قتل ہو کر بھی مجھے حاصل سبکدوشی نہیں ÷ سر کے بدلے تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا

اُس نے اگر کرم بھی کیا تو غضب ہوا   کھینچا ستم سے ہاتھ تو بھی جاں بلب ہوا
شکوہ بتوں کے جور کا بے جا ہے اے فصیحؔ   تجھ پہ خدا کا قہر خدا کا غضب ہوا

جو بات چاہیے بنی چاہی نہ جائے گی   اہلِ ہوس سے چاہ نباہی نہ جائے گی
بدلے ہزار رنگ زمانہ مگر فصیحؔ   بختِ سیہ کی اپنے سیاہی نہ جائے گی

پوچھے کوئی تو عشق کا انجام کیا کہوں   تو ہی بتا دے اے دلِ ناکام کیا کہوں
دعویٰ عشق اور تمنا وصال کیا   سودائے خام یا طمعِ خام کیا کہوں
شمعِ فجر کی طرح نہ کیونکر خموش ہوں   میں بھی ہوں آفتاب لبِ بام کیا کہوں
طوفِ حرم کے واسطے تقویٰ لباس ہے   دو چادروں کو جامۂ احرام کیا کہوں

وردِ اک صنم کا نام کیے جا رہا ہوں میں   اک عمر سے یہ کام کیے جا رہا ہوں میں
دنیا کا انتظام کیے جا رہا ہوں میں   یہ کارِ ناتمام کیے جا رہا ہوں میں
ناصح کی گفتگو کا خموشی جواب ہے   تقریرِ بے کلام کیے جا رہا ہوں میں
ناکامیوں سے عشق میں دل کامیاب ہے   کرنا نہ تھا جو کام کیے جا رہا ہوں میں

---

[1] تری یاد میں زندگانی کا حاصل   کوئی لمحہ دل اس سے غافل نہیں ہے
مجھے کب ہے سجدہ سے انکار لیکن   جبیں آستانے کے قابل نہیں ہے
مروں کس لئے میں کسی فتنہ گر پر   مری زندگی اس کے قابل نہیں ہے
وہ کیا جانے سیرِ چمن کی حقیقت   جسے لطفِ صحرا بھی حاصل نہیں ہے

---

[1] یہ اشعار جناب کیول کرشن شرما سے راقم کو حاصل ہوئے۔

باب یازدھم

فصیح الدین بلخی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کا جائزہ

فصیح الدین بلخی مرحوم کی کئی غیر مطبوعہ تصنیفات ہیں جو ہنوز طباعت و اشاعت سے محروم ہیں کاش وہ دن قریب آئے کہ یہ تصنیفات جلد از جلد منظر عام پر آئیں۔ سطور ذیل میں ان تصنیفات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

آثار قدیمہ : بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف تاریخ مگدھ کے مقدمہ کے آخری حصے میں اپنی دو مزید زیر ترتیب کتابوں کا ذکر کیا ہے جو تاریخ مگدھ کی کڑیاں ہیں۔ ان میں ایک کتاب "آثار قدیمہ" ہے، دوسری کتاب موصوف مکمل نہ کر سکے تھے جس کا ذکر "تذکرہ نسوان ہند" میں ان کے تحریر کردہ مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم نے ایک ہزار مشاہیر کے حالات تحقیق و جستجو کے نتیجہ میں حاصل کئے تھے جن میں الگ بھگ پانچ سو خواتین کے حالات درج تھے جن کو موصوف نے ایک باضابطہ اور علیحدہ کتاب "تذکرہ نسوان ہند" کے نام سے شائع کی۔ بہت ممکن ہے کہ چھان بین کے بعد ان اوراق کا جائزہ لے کر اور مرتب کر کے کوئی صاحب صلاحیت اس نادر تحفہ کو مشاہیر کے نام سے ترتیب دے کر شائع کرے۔

"آثار قدیمہ" بلخی صاحب مرحوم کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے کیونکہ بلخی صاحب مرحوم کی فطرت میں تحقیق و جستجو داخل تھی۔

"آثار قدیمہ" مخطوطہ کی شکل میں "۸×"۱۲ کے سائز پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو موصوف اپنی

زندگی میں مرتب کر چکے تھے۔ اس کے مسودے کو موصوف نے خوش نویس کاتب سے قلمبند کروا کر اس کی جلد سازی کرادی تھی۔ اس کتاب کے کچھ علٰحدہ عنوانات ملتے ہیں جن کا تعلق قصبہ بہار شریف، اورنگ آباد اور سہسرام سے ہے۔ پوری کتاب ۲۲۳ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی فہرست موصوف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اس کتاب میں ۲۶۰ سرخیاں ہیں اور وہ اس طرح ہیں۔ عظیم آباد کے جغرافیائی حالات، گنگا، سون ندی، پن پن، مورہر، دوہا ندی، پھلگو، سٹھواٹن، پنچانہ اور سکری ندی، پہاڑ، عام کیفیت، زمین، فصلیں، نباتات اور اثمار، فصل ربیع، کوبی، آلو کی کاشت، اشجار، ثمرہ یعنی پھل دار درخت وغیرہ۔

قصبہ منیر کا حال: ۷۹۸ھ کی مسجد، لنگر قلی خاں کی قبر ۹۹۳ھ، بڑی درگاہ اور سدھور کا ذکر، بڑی درگاہ کی مسجد ۱۰۱۱ھ، چھوٹی درگاہ، مخدوم دولت کا مقبرہ ۱۰۳۲ھ، مقبرے کا کتبہ ۱۰۳۹ھ، چھوٹی درگاہ کی مسجد ۱۰۲۸ھ، شاہ دولت کی وفات کا کتبہ ۱۰۱۷ھ، مقبرہ کی تعمیر کا کتبہ ۱۰۲۵ھ، قصبہ منیر کی مسجد ۱۱۰۳ھ، دوسری مسجد کا کتبہ ۱۰۸۲ھ، بعض مشاہیر کا ذکر، شیر پور کی مسجد ۱۱۵۷ھ۔

قصبہ دانا پور کی بی بی گنج کی مسجد ۱۱۹۷ھ شاہ محمد اکبر ابو العلائی قدس سرہٗ کی خانقاہ، کھگول کی مسجد ۱۳۳۴ھ (لان سے شاہ درگاہ ارزاں تک) باقر گنج کی مسجد ۱۲۵۷ھ، تبارک علی کی مسجد ۱۲۵۷ھ، قبرستان میں ایک مسجد کا کتبہ جو قبر پر لگا ہوا ہے ۱۰۴۰ھ یہ محمد شاہ جہاں کے عہد کی ہے۔ اصالت خاں کی مسجد ۱۲۲۴ھ، مسماۃ نورن کی مسجد ۱۲۳۳ھ۔ بھکنا پہاڑی درگاہ شاہ ارزاں کے مزار کا کتبہ ۱۰۲۸ھ درگاہ کا کتبہ ۱۰۵۲ھ، شاہ بہاول کا مزار ۱۰۶۳ھ، شاہ شہباز کا مزار ۱۱۲۳ھ، شاہ بسنت کا مزار ۱۱۵۰ھ، شاہ کرم اللہ کا مزار ۱۱۶۱ھ، شاہ غلام حسن کا مزار ۱۲۱۱ھ، شاہ کرم بخش کا مزار ۱۲۵۲ھ، عباد اللہ شاہ کا مزار ۱۲۶۰ھ، کتبہ عیدگاہ ۱۲۵۸ھ، درگاہ کی مسجد ۱۰۷۰ھ، شاہ غلام علی کا مزار ۱۳۰۸ھ۔

نمونیہ سے پچھم دروازہ تک پختہ سڑک (انگلش روڈ کے اطراف کا حال) شاہ رستم کی قبر ۱۲۳۰ھ، بغیر نام کا کتبہ ۱۱۲۷ھ، ایک نامعلوم شخص کی قبر اور گنبد ڈنکے کی اصلی مسجد ۱۱۹۶ھ ایک اور مسجد ایک لامعلوم قبر، مدارو مہترانی کی مسجد ۱۲۲۷ھ، شاہ باقر کا تکیہ، شاہ حمزہ علی کا تکیہ اور مزار

سنہ ۱۲۲۶ھ، عیدگاہ سیف خاں سنہ ۱۰۳۸ھ اور چند قبریں، شاہ کالے خاں کا مقبرہ سنہ ۱۱۴۲ھ، لالن کی مسجد
سنہ ۱۲۵۸ھ، عدالت کے احاطہ میں میجر فرلک نوکس (Furlic Knox) کی قبر سنہ ۱۷۶۴ء، ماں
بی بی کی مسجد سنہ ۱۲۱۶ھ، ماں بی بی کی قبر سنہ ۱۲۲۵ھ مرادپور، خدابخش لائبریری سنہ ۱۸۹۱ء، مرادپور کی مسجد
سنہ ۱۲۳۳ھ، حمام کا کتبہ سنہ ۱۲۴۹ھ، پٹنہ کالج، پٹنہ یونیورسٹی کے مکانات، مدرسہ شمس الہدیٰ کی مسجد
سنہ ۱۳۳۰ھ، انجینیرنگ کالج، گوکل پور کی مسجد سنہ ۱۲۴۸ھ، خادم علی کی مسجد سنہ ۱۲۵۸ھ، تاجو کی مسجد سنہ ۱۲۱۴ھ
سنہ ۱۲۸۲ھ کی ایک مسجد، پتھر کی مسجد سنہ ۱۰۳۶ھ، موہی دفالی کی مسجد سنہ ۱۲۶۳ھ، ایک انگریز کی قبر سنہ ۱۸۲۰ء
صلابت خاں کی قبر کا کتبہ سنہ ۱۲۲۶ھ، حاجی چاند کی مسجد سنہ ۱۰۵۶ھ، بی بی نُطفا کی قبر کا کتبہ سنہ ۱۲۷۶ھ۔
گلزار باغ میں اثنا عشریہ کی مسجد سنہ ۱۲۶۱ھ، شیخ تیغ علی کی مسجد سنہ ۱۲۵۵ھ، بی بی ممار بخش کی قبر سنہ ۱۲۵۸ھ
شاہ عالم بادشاہ کی جلوس گاہ، پیر بخش کی مسجد سنہ ۱۲۶۵ھ۔

لودی کٹرہ سے خواجہ کلاں گھاٹ تک:

تکیہ شاہ کی قبر کا کتبہ سنہ ۱۲۵۷ھ، حسینی بیگم کی قبر، مسماۃ جعفری کی قبر سنہ ۱۹۰۳ء، دولی گھاٹ
میں بی بی مخدومن کی مسجد سنہ ۱۳۰۶ھ، امین الدولہ عزیز الملک علی ابراہیم خاں بہادر نصیر جنگ کی مسجد سنہ ۱۲۰۸ھ
شیش محل کی مسجد سنہ ۱۱۹۰ھ، بانی مسجد میر ابراہیم کی قبر سنہ ۱۱۹۹ھ، شیش محل کی دوسری مسجد سنہ ۱۲۶۴ھ،
دلندیزہ کا پشتہ، متین گھاٹ کی مسجد اور حضرت منعم پاک کا مزار، حضرت شاہ عشق کا تکیہ حاجی تقی کی مسجد
اور مقبرہ، محمد کریم شاہ کی قبر سنہ ۱۳۳۳ھ، قطعہ سال وفات سعید جہاں شہزادہ محمد کریم سنہ ۱۳۳۳ھ، بخشی گھاٹ
اور ڈاکٹر فلرٹن کا مکان رائے صاحب کا پشتہ حویلی بیگمان۔

پچھم دروازے سے پورب دروازے تک عمارتوں کا حال:

محلہ گذری کی عمارتیں، مرزا معصوم کی مسجد سنہ ۱۰۲۳ھ، مرزا علی کی قبر سنہ ۱۲۶۵ھ، شیخ رضا کی
مسجد اور ایک قبر، بادشاہ محل اور بادشاہ نواب مارکٹ، نواب لطف علی خاں روڈ، بادا کی مسجد سنہ ۱۲۹۰ھ
نواب منیر الدولہ رضا علی خاں کا مقبرہ سنہ ۱۱۹۸ھ، سیٹی ہسپتال اور رحیم النسا کی قبر سنہ ۱۱۶۰ھ انگریزوں
کا گورستان اور مقتل سنہ ۱۷۶۳ء، گرہٹہ کی بڑی مسجد سنہ ۱۱۹۱ھ، گرہٹہ کی چھوٹی مسجد سنہ ۱۲۱۴ھ، پادری
کی حویلی سنہ ۱۷۱۳ء، پادری بینڈکٹس (Benedictus) کی قبر سنہ ۱۷۲۷ء، بخشی محلہ

نواب جعفر قلی خاں کے خاندان کا گورستان، اشرف النساء بیگم کی قبر سنہ ۱۳۳۰ھ، نواب تصدق حسین خاں کی قبر سنہ ۱۳۴۰ھ، مولوی اکرام الحق کی مسجد سنہ ۱۲۳۷ھ جو (بلخی صاحب کی مسجد کہلاتی ہے) ارشاد علی عرف چھٹن کی قبر سنہ ۱۳۴۳ھ، مہدی علی عرف بنن کی قبر سنہ ۱۳۴۴ھ، محمدی جان کی مسجد سنہ ۱۳۰۵ھ کوچہ کمنگر کی مسجد سنہ ۱۲۶۱ھ، مخدوم حسن علی کا مزار سنہ ۱۲۲۴ھ، طہارت حسین کی قبر سنہ ۱۳۲۲ھ محلہ خواجہ کلاں ڈاکٹر صادق خاں کی مسجد سنہ ۱۲۹۹ھ، جعفر خاں کی عدالت سنہ ۱۰۷۴ھ، حسن علی کا دار العدل سنہ ۱۱۴۲ھ، مسجد بیگو حجام جو حقیقتاً حسین شاہ کی بنوائی ہوئی ہے سنہ ۹۱۶ھ، بیگو حجام والا کتبہ سنہ ۱۰۵۶ھ اورنگ کی مسجد سنہ ۱۰۷۸ھ، فخر الدولہ کی مسجد سنہ ۱۲۰۲ھ، گدام کی مسجد متصل کٹرہ شائستہ خاں سنہ ۱۲۶۳ھ چوک کی مسجد سنہ ۱۲۵۱ھ، خواجہ عنبر کی مسجد سنہ ۱۱۰۰ھ، مدرسہ سیف خاں سنہ ۱۰۳۸ھ، مدرسہ کی مسجد سنہ ۱۰۳۸ھ، عمارت چہل ستون، قلعہ عظیم آباد، قلعہ کی مسجد سنہ ۱۲۲۵ھ، شاہ معروف کی قبر محلہ مغلپورہ، جنوری بیگم کی قبر سنہ ۱۳۱۳ھ، اصغری فاطمہ کی قبر سنہ ۱۳۳۴ھ، سید کرامت حسین کی قبر سنہ ۱۳۲۲ھ، شیخ احمد عربی کی مسجد سنہ ۱۲۵۲ھ، شیخ بہاری کی مسجد سنہ ۱۲۴۰ھ، خواجہ عطاء اللہ کی قبر سنہ ۱۲۶۴ھ، شیخ محمد بدھن کی قبر، مولوی نوروز علی کی قبر سنہ ۱۲۳۳ھ مولوی نور علی کی قبر سنہ ۱۲۶۴ھ، علی حسین ولد بجو کی قبر سنہ ۱۳۲۰ھ حاجی عباس کی قبر سنہ ۱۳۴۷ھ، مظہر حسین کی مسجد سنہ ۱۳۰۴ھ، میاں جان کی قبر سنہ ۱۲۷۱ھ، جگی چورابہ گلشن حیدری کنگھیا ٹولہ سونار ٹولی شاہ کی املی لودی کٹرہ، دوندی بازار کا حال، بام صاحب کی مسجد سنہ ۱۲۴۳ھ، بلاقی کی مسجد سنہ ۱۲۰۵ھ، میر قطب الدین کی قبر سنہ ۱۱۸۳ھ، رس بٹے کی گلی کا گورستان، سید علی عظیم کی قبر سنہ ۱۳۳۴ھ سید نظام الدین کی قبر سنہ ۱۳۰۵ھ، گھسو بی بی کی قبر سنہ ۱۳۴۱ھ، گلشن حیدری، گلشن حیدری کی مسجد سنہ ۱۲۵۴ھ، امام باڑے میں منبر کا کتبہ سنہ ۱۳۱۵ھ، سید نجف علی کی قبر سنہ ۱۲۶۱ھ، نواب یوسف علی خاں کی قبر سنہ ۱۳۱۴ھ، عبد الحسین خاں کی قبر سنہ ۱۳۱۰ھ، کلثوم بیگم کی قبر سنہ ۱۳۲۳ھ، بشارت حسین کی قبر سنہ ۱۳۰۴ھ، محمد ذاکر کی قبر سنہ ۱۳۲۲ھ، سونار ٹولی میں ڈاکٹر معشوق علی کی قبر سنہ ۱۳۴۶ھ، مغلپورہ میں بنت سید محفوظ کی قبر سنہ ۱۲۰۱ھ، کشمیری باغ میں ایک قبر سنہ ۱۲۱۳ھ، کشمیری باغ میں مسجد سنہ ۱۲۱۹ھ، محلہ پیر کلامی شاہ وارث علی کی قبر سنہ ۱۲۲۱ھ، محلہ شاہ کی املی میں مقبرہ سنہ ۱۲۱۲ھ، محلہ کشمیری کوٹھی میں فضل علی کی مسجد سنہ ۱۲۵۷ھ، محلہ کنگھیا ٹولہ شیخ قادر بخش کی مسجد سنہ ۱۲۴۹ھ، شاہ غلام یحییٰ کی مسجد سنہ ۱۲۰۸ھ

شاہ غلام یحییٰ کی قبر، مراد النساء کی مسجد ۱۲۳۳ھ، لودی کٹرہ میں دوسری مسجد ۱۲۲۳ھ، حکیم احمد
حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ، دوندی بازار میں ایک گنبد کی مسجد ۱۰۶۱ھ، میدانِ قصاب میں قبر کا
کتبہ ۱۰۵۹ھ۔

منگلس ٹیننگ روڈ پیار النساء کی قبر ۱۱۹۹ھ، منگل تالاب چوک تسکار پور کی مسجد
۱۲۸۷ھ، چوک تسکار پور کی دوسری مسجد ۱۳۰۲ھ، حاجی تاتار کی مسجد ۷۰۰ھ، منشی کاظم علی
کی مسجد ۱۲۴۱ھ، منشی کاظم علی کی قبر کا کتبہ ۱۲۴۸ھ، حاجی منظور علی خاں کی مسجد ۱۲۱۷ھ،
محلہ دول پوری شیر شاہی مسجد، محمد مراد شہید صوفی کی قبر کا کتبہ ۹۴۹ھ، ظریف الملک اشرف علی
خاں فغاں کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۶ھ، مرزا عزیز کی قبر ۱۲۲۳ھ، شیخ عنایت حسین ذاکر امام کی قبر
۱۲۴۹ھ، مسماۃ نصیبن کی قبر ۱۲۸۶ھ، حسینی بیگم کی مسجد ۱۲۴۲ھ، قبر سید اقبال علی رضوی
بن سید حیدر علی رضوی المعروف بہ شاہ جمال حسین ۱۲۲۹ھ، فیض النساء بیگم کی قبر ۱۲۶۷ھ
ڈھائی کنگرہ کی مسجد ۱۰۷۲ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد کا دوسرا کتبہ ۱۲۷۲ھ، مقبرہ سعادت خاں کچی باغ،
کمیدان کی مسجد ۱۲۱۱ھ، میر اشرف کی مسجد ۱۱۸۷ھ، مسماۃ فاطمہ کی قبر ۱۱۸۹ھ، میر افضل کا مقبرہ ۱۱۸۳ھ
میر اشرف کی وفات کا قطعہ ۱۱۸۹ھ، میر فرحت حسین کی مسجد ۱۲۹۳ھ، افضل راج کی مسجد ۱۳۰۵ھ
شاہ منصور کی قبر ۱۲۵۰ھ، ہیبت جنگ کا مقبرہ و مسجد ۱۷۴۸ء، افضل حسین کی قبر ۱۹۲۶ء، حاجی
علی بخش کی مسجد ۱۳۲۲ھ، کلثوم النساء کی مسجد ۱۲۷۰ھ، شاہ کمک کی مسجد، شاہ کرمک کی مسجد
۱۲۵۳ھ، شاہ کرمک کی قبر، سرائے کی مسجد ۱۲۱۹ھ، عبدالرحمن سجاد کی مسجد ۱۱۵۰ھ، تھانہ مالسلامی
میں بغیر نام کا کتبہ، ڈینس کوٹھی اور بربر کی قبر ۱۷۹۰ء، مسجد پیر دمڑیا کے پاس قبر کا کتبہ ۱۲۱۹ھ، مسجد
پیر دمڑیا، منجھلی بیگم کی قبر ۱۳۸۲ھ، شاہ دمڑیا کا مزار، محلہ نون گولے میں مسجد اور مزارات،
شاہ قاسم علی کا مقبرہ، شاہ لٹھی کا مقبرہ، شاہ علیم اللہ کی قبر، محمد حسن ولد سید غلام حسین مؤلف
سیر المتاخرین کی قبر ۱۱۹۸ھ، باڑے کی مسجد ۱۲۷۱ھ، عالی نساء بیگم کی مسجد ۱۲۴۴ھ، بزرگ
اسید خاں کی مسجد ۱۱۰۰ھ، شاہ غلام حسین کی مسجد ۱۲۵۵ھ، مولوی نہال حسین کی قبر ۱۳۴۰ھ،
میر فرزند علی کا امام باڑہ ۱۲۳۰ھ، اکنگن کا مقبرہ کٹرہ مالسلامی میں ایک مسجد، کٹرہ مالسلامی میں

ایک مندر، باغ جعفر خاں، قدم رسول کی مسجد، محمد علی خاں کی قبر ۱۱۷۸ھ، نوری چور کا مقبرہ، بیواجی کی باؤلی، مخدوم شہاب الدین پیر جگجوت، مخدوم آدم صوفی، اللہ جلائی کی قبر ۱۲۳۷ھ، جبھولی کی مسجد ۱۳۱۰ھ۔

اس کے علاوہ مخطوطہ مذکورہ کے سائز پر خوشخط حروف میں قصبہ سہسرام کا حال درج ہے اس میں حسب ذیل سرخیاں ملتی ہیں:

قصبہ سہسرام وعالمگیری مسجد، آثار قدیمہ سہسرام تارا چنڈی دیوی کا مندر، حسن سور کا مقبرہ، حسن سور کے مقبرے کی مسجد، شیر شاہ کا مقبرہ ایک عجیب صنعت، عید گاہ کے کتبے، اتر جانب والا کتبہ، درمیانی کتبہ، دکھن جانب والا کتبہ، سرمست خاں کا روضہ، علاول خاں کا روضہ، صفدر جنگ کا قلعہ، حمام، چندن پہاڑی کے قریب مسجد ۱۰۲۲ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۱۹۳ھ، مہدی حسن کی قبر ۱۲۰۱ھ، امام باڑے کا کتبہ ۱۱۹۱ھ، جانی کے بازار میں ایک مسجد ۱۱۰۵ھ، جانی کے بازار میں امام باڑہ ۱۲۰۰ھ، کرن سرائے کی مسجد ۱۰۹۸ھ، ۱۲۹۷ھ کا عجیب کتبہ۔

اس کے بعد کاپی کی شکل میں آٹھ صفحات پر مشتمل کاغذات پر قصبہ اورنگ آباد کا حال ہے جس میں حسب ذیل سرخیاں ہیں۔

قصبہ اورنگ آباد عبدالواحد خاں نزاہی کی مسجد ۱۱۳۰ھ، موضع سرس شمس الدین محمد کی مسجد ۱۰۱۷ھ، غلام مصطفٰی کی قبر ۱۲۹۵ھ، نواب غلام حسین خاں کی لڑکی کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۳ھ قصبہ داؤد نگر مسماۃ فراست النساء کی قبر ۱۲۶۶ھ۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے جو کتبات مزارات اور دیگر تاریخی مقامات کے جمع کر کے رکھے ہیں ان سبھوں کی حیثیت آثار قدیمہ کی ہے ان میں بہت سارے آج عالم میں موجود نہیں ہیں لیکن مخطوطہ کے اوراق پریشاں پر اب بھی اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ عہد ماضی کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

آثار بلخیہ: مرحوم کی دوسری غیر مطبوعہ تصنیف آثار بلخیہ ہے، یہ تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۴۹ھ نکلتا ہے، اس کا مخطوطہ نہایت ہی خستہ حالت میں ہے "۱۰/۳۰ × ۲۰" سائز

پر ہے' اس کتاب کی ابتدا میں مرحوم نے منشار اور سبب تالیف کتاب "آثار بلخیہ" کو ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے خلقکم من نفس واحدۃ تا رجالا کثیرا ونساء پ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ تمام نوع انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں لہٰذا کسی انسان کا اپنے خاندان پر فخر کرنا محض نادانی ہے۔ آیت کریمہ کی روشنی میں یہ فرمایا ہے کہ خاندان کا محض تعارف کرانا اس لئے مدنظر ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم بلخی اور ان کی اولادوں میں بعض بزرگوں کے حالات ہماری نصیحت اور عبرت کے لئے فائدہ مند ہیں اس لئے اس کام کو ضروری سمجھا گیا۔

کتاب کے شروع میں جو مرحوم کی تحریر ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشہور و معروف اولیاء اللہ حضرت ابراہیم ادھم بلخی، حضرت مظفر شمس بلخی، حضرت نوشہ توحید بلخی اور ان کے خاندان کا مکمل تذکرہ زمانہ حال تک اس خاندان کے تمام واقعات مع نسب نامہ کتب تواریخ اور تذکروں سے اخذ کر کے اصل ماخذوں کے حوالوں کے ساتھ تفصیل وار اس کتاب میں درج ہو جائے۔

اس کے بعد وہ باب ہے جس میں شہر بلخ کے حالات ہیں اور اس کے بعد کے باب کی سرخی حضرت ابراہیم ادھم بلخی ہے جن کے حالات تواریخ کے حوالوں سے پیش کئے گئے ہیں پہلی کتاب کتاب ا ہے جس کے بزبان عربی اقتباسات مع ترجمہ پیش کئے گئے ہیں، دوسری کتاب تاریخ کبیر کے بیان کو نقل کیا گیا ہے' اس کے بعد طرائق الحقائق نامی کتاب کا نام درج ہے، اس کے بعد فصاحت البلخی کا اصل بیان درج ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم ادھم بلخی کے توکل اور ایثار کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک باب قائم کیا گیا ہے' اس سلسلہ میں کتاب وسیلہ شرف کا بیان و تذکرہ صادقہ کا بیان درج ہے۔

اس کے بعد تیسرا باب شروع ہوتا ہے جس کی سرخی بلخیوں کی ہندوستان و صوبہ بہار میں آمد ہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹی سی سرخی بلخی شہزادے کا باغ ہے' اس باب کے آخر میں خاندان بلخیہ کا نسب نامہ ہے جو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب سے شروع ہو کر ملانا مظفر بلخی مولانا معز الدین بلخی پر ختم ہوتا ہے۔

اس باب کے بعد چوتھا باب شروع ہوتا ہے جس کی سرخی مولانا شمس الدین بلخی ابن علی بلخی ہے۔

اس کے بعد کے باب کی سرخی مولانا مظفر برہان الدین شمس بلخی ہے یہ اس کتاب کا پانچواں باب ہے۔
چھٹے باب کی سرخی مولانا شمس الدین بلخی و مولانا قمرالدین شمس بلخی ہے، ساتویں باب کی سرخی حضرت حسین بلخی بملقب نوشہ توحید بلخی ہے اس کے بعد آٹھویں باب کی سرخی مولانا حسن بلخی ہے اور اس باب کے بعد نواں باب ہے جس کی سرخی مخدوم احمد بملقب لنگر دریا بلخی ہے اور اس کے بعد دسواں باب ہے جس کی سرخی مخدوم ابراہیم بلخی المعروف بہ سلطان بلخی ہے، اس باب میں مخدوم محمود بلخی اور مخدوم ابراہیم بلخی کا بھی ذکر ہے اور لکھا گیا ہے کہ مخدوم حافظ بلخی مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی کے منجھلے بیٹے تھے آپ ہی کی اولاد سے خانقاہ فتوحہ میں رشد وہدایت کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے بعد مخدوم شاہین بلخی مخدوم محمود بلخی، ابن مخدوم ابراہیم بلخی کا مختصر ذکر ہے اور اس کے بعد کتاب کا گیارہواں باب ہے جس کی سرخی مخدوم درویش بلخی ہے، اس کے بعد دو چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں جن کی سرخیاں مولوی محمد واجد بلخی ابن قاضی طہارت التوحید بلخی و مولوی ضمیر الدین احمد بلخی تخلص بہ اوج ہے گویا یہیں پر اس کتاب کا خاتمہ ہے اس مخطوطہ میں کچھ سادہ کاغذات چھوڑ دیئے گئے ہیں اس کے بعد قطعہ تاریخ وفات مولوی حفیظ الدین بلخی ہے جو بزبان فارسی ہے اور جس کے نتیجے میں فارسی زبان میں ہے اس سے ان کی فارسی انشا پردازی کا اچھا خاصا علم ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم اس کتاب کو اپنے بعد یعنی اپنے منجھلے بھائی عزیزالدین بلخی مرحوم تک لے جانا چاہتے تھے شاید اس کا موقع نہ ملا، اس پورے مسودے کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب کتابت میں دماغ سوزی اور جانفشانی کا کام ہے جو حد درجہ مشکل ہے کاش یہ بھی کسی کے ہاتھوں انجام پائے۔

دستور سخن : فصیح الدین بلخی مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیفات کے سلسلے میں دستور سخن کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، یہ تصنیف موصوف کی تیسری غیر مطبوعہ تصنیف ہے جس کا ایک حصہ وہ صاف کر چکے تھے اور باقی حصہ اوراق پریشاں کی شکل میں محفوظ ہے۔

اس کتاب میں اردو کی ماہیت، وجہ تسمیہ، اردو کا ارتقا، حروف ہجی، حروف ہجی کی قسمیں، حروف تازی کی قسمیں، اعراب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد ایک سرخی اصطلاحات کی قائم کی گئی ہے، جس میں حذف و ترمیم، تخفیف مقدمہ، اشباع و امالہ، تحریک و تمکین، قلت و ثقل، ابواب مترادف،

مشترک و توابع، قیاسی و سماعی اور استقاق۔

اس کے بعد کی سرخی فصاحت ہے اس حصے میں سب سے پہلے فصاحت کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کے بعد تنافر، اثقال، قوافی، اضافت، ضعف تالیف، مخالفت، قیاس، فک اضافت، استقاق کا بیان ملتا ہے، اس کے بعد تکرار و حشو کی سرخیاں ملتی ہیں، تکرار و حشو و غرابت و تکلف و تنفرد تناقص، تعقید لفظی، تعقید معنوی، تقدیم و تاخیر اشتر گربہ، ابتذال، سرقہ کو سمجھا کر لکھا گیا ہے، اس کے بعد ایک سرخی فصاحت و بلاغت کا فرق ملتی ہے۔

غرضکہ اس کتاب میں قواعد و زبان سے بحث کی گئی ہے، حروف تہجی سے بھی اور اردو زبان کے ارتقا کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ اردو شاعری کی بحث کے سلسلے میں فن فصاحت و فن بلاغت کا عالمانہ بیان ملتا ہے اور آخری حصے میں فن عروض کی تعریف کرتے ہوئے تمام طور کے بیانات ملتے ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اردو شاعری کے لئے کون کون سی معقول بحریں ہیں اور کون کون سی بحریں اس شاعری کے لئے مناسب ہیں غرضکہ واقعی یہ کتاب اردو زبان و ادب اور خصوصی طور پر شاعری کا دستور العمل ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا نام "دستور سخن" رکھا گیا۔

علم نجوم: سوانح حیات کے سلسلے میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم ایک ماہر نجوم بھی تھے لیکن پیشہ ور نجومیوں کی طرح کبھی بھی انہوں نے اپنی اس صلاحیت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا بہت کم لوگ مرحوم کی اس صلاحیت سے واقف تھے اور واقف ہیں یہاں تک کہ گھر والوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ مرحوم نے اپنے عہد شباب میں اس علم سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جس کی اشاعت نہیں ہو سکی تھی چنانچہ ان کے لڑکے نے اس کتاب کی اشاعت کی طرف رجحان دلایا تھا لیکن انہوں نے فرمایا کہ جب وقت سازگار ہوتا ہے تو ہر کام انجام پاتا ہے۔

یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں ۵ × ۱۰ کی ہے پہلا ورق اُلٹتے ہی سرورق مرحوم کا اس پر انگریزی میں دستخط ہے ۲۵ ۱۹۱۰ لکھا ہوا ہے لیکن کتاب کے آخری حصہ پر جو کاتب تحریر کا نام ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲ ربیع الثانی بروز چہارشنبہ ۱۹۱۰ء میں کتابت کا کام ختم ہوا، اس کتاب علم نجوم کی کتابت جس خوشنویس سے انہوں نے کرائی ہے اس کا نام سید مرتضیٰ حسن ہے۔ کتاب مجموعی طور پر ۱۰۹ صفحات

مخطوطہ کی شکل میں رکھی ہے۔ اگر اس کی طباعت ۱۰" / ۳۰"×۲۰" کے سائز پر ہو تو صفحات اس سے بھی زیادہ بڑھ جائیں گے۔ مسودہ میں کہیں کسی صفحہ پر ۱۷ سطریں ہیں کسی پر ۱۸ اور کسی پر ۱۹ سطریں ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے سے ایسا احساس ہوتا ہے کہ علم نجوم پر وہ کچھ اور لکھنے والے تھے جس کا صرف ایک ہی حصہ بطور جلد اول انہوں نے مکمل کیا تھا اور حصے کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ اوراق پریشاں پر مکمل کئے گئے ہوں، علم نجوم سے متعلق اس راقم الحروف کی کوئی واقفیت نہیں اس لئے مرا قم اس کتاب پر اپنی رائے زنی پیش کرنے سے قاصر ہے، صرف اس کتاب کے ترتیب وار مواد سے تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کتاب کے آخری حصے پر جو دن، تاریخ اور سن درج ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی تھی کتاب کے آخری صفحہ کے بعد جو ایک سادہ صفحہ رہ گیا ہے اس میں مرحوم ہی کی تحریر میں مرحوم کا زائچہ پیدائش بنا ہوا ہے اور کتاب کے پہلے صفحہ پر بھی مرحوم ہی کی تحریر میں ایک دوسرا زائچہ پیدائش ہے جو ان کے اپنے بھانجے سید عزیز احمد کا ہے، پوری کتاب کئی ابواب اور فصلوں پر منقسم ہے جس کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

کتاب کھولتے ہی باب اول بروج سے متعلق آتا ہے، باب اول میں اسمائے بروج کا ذکر ہے۔ فصل دوم میں حالات بروج کا، فصل سوم میں درجات بروج کا، فصل چہارم تعلقات بروج کا، فصل ششم میں نوانسا (نوجوان حصہ) ہفتم فصل اعداد بروج کا، ہشتم میں بروج کا، اسی پر کتاب کا پہلا باب ختم ہوتا ہے۔

اس کے بعد کتاب کا دوسرا باب سامنے آتا ہے، دوسرے باب میں تین ہی فصل ہیں جس کی پہلی سرخی نچھتر لکھا ہوا ہے اس کے بعد اسمائے نچھتر درج ہیں، فصل سوم خواص نچھتر ہے۔

تیسرا باب ایام اوقات ولادت، ہے اس کی پہلی فصل تاثرات جو کہ نچھتری ہے، اس کی دوسری فصل کی سرخی خاصیت ماہ تولد ہے اور اس کی فصل سوئم خاصیت بچہ ہے اور اس باب کا فصل چہارم خاصیت تاریخ ہے فصل پنجم خواص سرخیاں امتحان اول و پدر مولود، تیسرا امتحان دوم سمت مکان پیدائش امتحان دروازہ مکان، تولد امتحان حقیقت تولد امتحان پیدائش، امتحان تعداد دعوت اور زچہ خانہ، امتحان زچہ برائے خانہ امتحان چارپائی حاملہ طریقہ دریافت یا امتحان پرشن کنڈلی (زائچہ سوال) اس کے بعد

اسی باب کا فصل چہارم آتا ہے جس کی سُرخی اقسام خانہ ہے اس کے بعد پانچویں فصل ہے جس کی سرخی مصنوعات دروازہ خانہ ہے اس کے بعد چھٹی فصل ہے جس کا عنوان خواص ستارگان ہے اس کے بعد فصل ہفتم ہے جس کا عنوان خواص ستارگان مطابق ستارگاں ہے، اس باب کے آخری فصل میں کمی چھوٹی چھوٹی سرخیاں پائی جاتی ہیں اور اسی سرخی پر کتاب کا اختتام ہے یعنی مجموعی طور پر اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں، اس کتاب کو پڑھنے سے انسان یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کتاب میں ستاروں کی چال اور زائچہ پیدائش یعنی جنم کنڈلی بنانے کے طریقے سمجھا کر لکھے گئے ہیں، اگر یہ کتاب شائع ہو جائے تو اردو میں یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے معلوماتی، دلچسپ اور دلفریب ہو گی۔

باب دوازدھم

فصیح الدین بلخی کا نثری اسلوب

قبل اس کے کہ ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کا جائزہ لیں یہ ضروری ہے کہ اردو کے اسالیب نثر کے ارتقا کا ایک خاکہ ہمارے سامنے پیش ہو۔

اردو ادب میں نثر اولین کی کتابیں مذہبی امور پر مبنی ہیں لہٰذا ان میں مذہب اور تصوف سے متعلق مخصوص عربی اصطلاحات موجود ہیں، کشف و مراقبہ، مشاہدہ، کرامت، معرفت، شریعت، طریقت، قیامت، محشر، ناسوت، جبروت، ممکن الوجود، واجب الوجود، وحدت الوجود، سالک و عارف وغیرہ اصطلاحیں کثرت سے موجود ہیں، خواجہ محمد بندہ گیسو دراز کی کتاب معراج العاشقین ہو یا میراں جی شمس العشاق کی جل ترنگ ہو یا شاہ برہان الدین جانم کی حکمۃ الحقائق یا سید محمد عبداللہ کا ترجمہ نشاط العشق، ان ساری کتابوں میں اصطلاحیں ایسی ملتی ہیں۔ ان بزرگوں کی تصنیف و تالیف کا واحد مقصد مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت تھا، لہٰذا ان کی زبان کچھ حد تک سلیس و سادہ ہے۔

دسویں صدی ہجری میں اردو کی نشو و نما ایک خاص انداز میں شروع ہوتی ہے، مولانا کا احکام الصلوٰۃ سنہ ۱۰۳۲ھ ملا وجہی کا سب رس سنہ ۱۰۴۵ھ، میراں یعقوب کا ترجمہ شمائل الاتقیا سنہ ۱۰۸۰ھ یا شاہ ولی اللہ قادری کا ترجمہ معرفت السلوک سنہ ۱۱۰۰ھ وغیرہ کتابوں کا اگر باہم موازنہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ ان کی عبارتوں پر فارسی اسلوب بیان کی چھاپ نمایاں ہے۔

اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اپنی کتاب "اردو کے اسالیب بیان" میں

لکھتے ہیں:

۱؎ "اس دور کی آخری تصانیف باقر آغا خاں کی ہیں جو غالباً جدید اسالیب بیان اور قدیم طرز انشاپردازی کی درمیانی کڑیاں ہیں یہی وہ شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اردو نثر میں علمی موضوعات پر قلم اُٹھایا۔

یائے معروف اور یائے مجہول، تذکیر و تانیث میں اس وقت بھی دو بار کے مانند کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا، تاہم اس عرصے میں اُردو زبان کے لفظی خزانے میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔

اگرچہ دکن میں چار صدیاں گذر جاتی ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں سوائے فضلی کی کربل کتھا وہ مجلس سے پہلے اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

۲؎ "انہوں نے نوادر الالفاظ کے ذریعے اُردو کی بڑی مہتم بالشان خدمت انجام دی ہے، اردو کا سب سے بڑا کارنامہ غرائب اللغات کی تصحیح ہے۔"

اردو نظم کے بعد اردو نثر کی تعمیر کرنیوالے سودا کا نام خصوصی طور پر لیا جاسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے دیوان کا دیباچہ اُردو نثر میں لکھا۔

فورٹ ولیم کالج سے قریب تر زمانے سعادت یار خاں رنگین نے ایک رسالہ قلمبند کیا، اُردو نثر کے آغاز اور ارتقا میں اس کے سوا شعری تصنیفات کا ذکر ملتا ہے۔

اس عہد میں مرزا جان تپش نے ایک مختصر رسالہ شمس البیان لکھا، ڈاکٹر جاوید نہال کے خیال کے مطابق ۱۲۰۷ھ میں لکھی گئی اور یہ کتاب پہلی بار مرشد آباد سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر جاوید نہال اپنی کتاب "اُنیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" میں یوں رقمطراز ہیں:

۳؎ "اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہونے کی وجہ سے مرزا جان تپش کی شمس البیان کو

۱؎ اردو کے اسالیب بیان ص۱۲

۲؎ اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص۳۶۶ بحوالہ ارشاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری ص۳۰۲

۳؎ ملاحظہ ہو "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" ص۳۳۷، ص۳۳۸

خاص اہمیت حاصل ہے۔ تپش نے اپنی کتاب میں دلّی کے محاورات اور ضرب المثل
استعمال کئے ہیں۔ سید انشاء اللہ خاں کی تصنیف "دریائے لطافت" اور "رانی
کیتکی" کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے "دریائے لطافت" ۱۸۰۸ء میں تصنیف ہوئی
تھی اور ۴۰ برس کے بعد ان کے ہموطن مولوی مسیح الدین خاں نے مرشد آباد سے شائع کی۔

اردو نثر کی ترویج وارتقا میں فورٹ ولیم کالج نے نمایاں خدمت انجام دی، اگرچہ یہ
کالج سیاسی مقصد کی بنا پر کھولا گیا تھا۔ اس ضمن میں جان بارتھوک گل کرسٹ کا نام خصوصی طور پر لیا
جاسکتا ہے جنہوں نے اُردو زبان وادب کی بے پناہ خدمت انجام دی لیکن آج ان کے حالات پردہ
گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس شخص نے نہ صرف اردو زبان کی خدمت کی بلکہ ہندوستانی ادیبوں اور
مصنفین کو یکجا کر کے کئی مفید کتابیں لکھوائیں۔

ڈاکٹر جاوید نہال اپنی تصنیف "انیسویں صدی کے بنگال کا اردو ادب" میں فورٹ ولیم کالج
اور اُردو نثر کے بارے میں اپنا یوں اظہار خیال فرماتے ہیں:

[1] "فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اُردو کا نیا دور شروع ہوا، اردو نثر کی باقاعدہ
تحریک شروع ہوئی اور نثر کا ابتدائی اسلوب سامنے آیا۔"

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے اُردو نثر کی راہ ہموار کرنے میں نمایاں خدمت انجام دیں،
میر امّن دہلوی، مظہر علی خاں، نہال چند لاہوری، حیدر بخش حیدری اور شیر علی افسوس وغیرہ، ماسوا
ان کے کالج کے گمنام مصنفوں میں نہال چند لاہوری مترجم قصہ گل بکاؤلی، باسط خاں مصنف گل صنوبر
میر معین الدین فیض مصنف چشمۂ فیض (چشمۂ فیض پندنامہ عطار کا ترجمہ ہے) سید حمید الدین بہاری
مصنف خوان نعمت وغیرہ۔

گل کرسٹ نے نہ صرف کالج کے ملازمین سے کتابیں لکھوائیں بلکہ ان حضرات سے بھی کام لئے
جو کالج کے منشی نہیں تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" ص ۳۳۷ تا ص ۳۳۸

میر ابوالقاسم مصنف حسن اختلاط، شاکر علی مترجم قصہ الف لیلیٰ، مرزا مغل مترجم بوستاں سعدی، اخلاق النبی مصنف غلام اشرف۔

فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں میر امن کی باغ و بہار کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی باغ و بہار کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی کتاب اردو کے اسالیب بیان میں یوں لکھتے ہیں۔

ا؎ "میر امن پہلے شخص ہیں جنہوں نے صاف سیدھی اور با محاورہ اردو لکھی، ان کی زبان نہایت سلیس تھی، باغ و بہار کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اس کا یقین نہیں آسکتا کہ وہ اٹھارہویں صدی کے قریب لکھی گئی، ان کی زبان وہی ہے جو ایک صدی کے بعد نذیر احمد نے استعمال کی ہے۔"

آغا محمد باقر کا خیال ہے:

۲؎ "بقول سرسید احمد ان کو اردو نثر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو میر تقی میرؔ کو نظم میں۔"

فورٹ ولیم کی جو دہلوی دوادین موجود تھیں یا پرورش پا رہی تھیں اس کے نتائج مستقل طور پر مزید کار آمد ثابت ہوئے۔ انہیں اصولوں کو برت کر سرسید احمد، ڈپٹی نذیر احمد اور ذکاء اللہ نے اردو نثر نگاری کو تہذیب و تمدن سے قریب تر کر دیا۔ بیشتر حضرات دہلی کالج میں اردو نثر دوسرے اصناف ادب کے لئے استعمال کی گئیں۔

اسی زمانے میں ایک مذہبی تحریک پیدا ہوئی جو سرسید احمد بریلوی کی تحریک ہے۔ اس تحریک کو ہم تحریک وہابیہ کے نام سے پکارتے ہیں، اردو نثر کو پروان چڑھانے میں علمائے صادق پور کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں اصول اور فنکاری کی دہلوی دوادین پرورش پا رہی تھی۔ سرسید احمد،

ا؎ اردو کے اسالیب بیان ص۲ بحوالہ شاد کی نثر نگاری

۲؎ تاریخ نظم و نثر اردو ص۱۴۳ بحوالہ شاد کی نثر نگاری

ڈپٹی نذیر احمد اور ذکار اللہ نے اردو نثر نگاری کو زندگی کے دوسرے مسائل کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔

۱؎ "غالب نے اگرچہ خطوط لکھے مگر ان کی نثر بھی ایسی بوقلمونی اور رنگا رنگی ہے اور اس طرح مختلف رجحانات اور شعاعیں ان کی نثر سے نکلتی ہیں جو بعد میں آنے والی مختلف اصناف نثر کو یکساں متاثر کی ہیں۔ غالب کے بعد آنے والے تمام لوگوں نے ان کی نثر سے فائدہ اٹھایا ہے، مولانا محمد حسین آزاد کے ضمن میں رام بابو سکسینہ کا یہ خیال ہے:

۲؎ نثر میں شاعری کرتے ہیں اور شاعری کرتے ہوئے نثر لکھتے ہیں۔"

مگر حالی اور سرسید غالب ہی کی راہ پر گامزن ہوئے، سلاست، روانی اور بے تکلفی ان کے نثر کی نمایاں وصف ہے۔ ذیل میں ہم فصیح الدین بلخی مرحوم کی نثر کا جائزہ لے رہے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی نثر میں فورٹ ولیم کالج اور سرسید تحریک تینوں خوبیوں کو انہوں نے اپنی نثر میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کا اسلوب: فصیح الدین بلخی مرحوم ادبی دنیا میں مورخ، محقق، ناقد اور ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

ڈاکٹر شعیب راہی نے فصیح الدین بلخی اور ان کے اسلوب پر ایک گراں قدر مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو رسالہ زبان و ادب اکتوبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے وہ لکھتے ہیں:

"فنکار کے فنی تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت جہاں ایک طرف ان مخصوص اصناف ادب کی دو ہیئتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جس سے فنکار متاثر ہوا ہے وہیں دوسری جانب اس کے گھریلو خاندانی نسلی روایت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ فصیح الدین بلخی کا تعلق اس خاندان سے تھا جس میں تصوف، روحانیت، فقر اور درویشی کا دار دورہ رہا ہے، جس خاندان کے فقرا اور درویشوں نے اپنی خانقاہوں میں بیٹھ کر روحانیت کا درس دیا ہے اور سلوک کی منزلیں طے کی ہیں، جہاں تصنع اور ظاہرداری، بے جا نمود و نمائش

۱؎، ۲؎ ملاحظہ ہو تاریخ مگدھ مصنف فصیح الدین بلخی ص ۲۶ تا ص ۹۷

کا کوئی گذر نہیں، جس کی سادگی، صفائی، آلہ کاری اور شگفتگی ان کے اسلوب کا طرۂ امتیاز ہے، ان کا اسلوب فقر اور درویشوں کی طرح ظاہر داری اور تکلفات سے پاک ہے۔"

میں نے سوانح حیات کے سلسلے میں یہ عرض کیا ہے کہ فصیح الدین بلخی مرحوم فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہے۔ بلخی صاحب مرحوم فورٹ ولیم کالج کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر رواں اور سلیس ہے جس کی داغ بیل میر امّن نے ڈالی تھی اور سرسبد گروپ ہوتے ہوئے پروان چڑھی۔ ڈاکٹر شعیب راہی لکھتے ہیں:

"ان کی خاندانی روایت بھی ایسی نہیں تھی کہ انہیں ناول نویسی یا افسانہ نگاری کی طرف مائل کرتی ..... انہوں نے تاریخ، تحقیق اور تنقید کو موضوعات کی حیثیت سے منتخب کرلیا، فصیح الدین کی ادبی دنیا وسیع تھی تاہم تاریخ تحقیق اور تنقید میں ان کے اسلوب کا کیا رنگ ہے اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔"

تاریخ ایک خشک موضوع ہے، اس موضوع کے لئے جس قدر ٹھوس حقائق، تاریخی شواہد اور تحریری ثبوت کی ضرورت ہے مورخ اپنے بیان کی صداقت کو پہلے غور کرتا ہے عام طور پر تاریخ نگاروں کے یہاں موضوع کے اعتبار سے عبارت خشک اور بے کیف ہوتی ہے۔ فصیح الدین بلخی مرحوم نے تاریخ نگاری کے لئے جو موضوع اور اسلوب اختیار کیا ہے اس میں ادبی لطافت بھی موجود ہے اور داستانوی دلچسپی بھی۔

[1] موصوف کی کتاب تاریخ مگدھ ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو ہند کے ذریعہ شائع ہوئی ہے۔ جو خالص مگدھ کی ایک تاریخ ہے۔ حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم نے دوسرے تاریخ دانوں کے علاوہ فارسی کی منظوم تاریخوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ تاریخ میں ادبیت اور شعریت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور انھیں زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، منیر کب فتح ہوا اور یہاں مسلمانوں کے سب سے پہلے قدم کب آئے مختلف تاریخوں کے حوالوں سے

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ مگدھ مصنفہ فصیح الدین بلخی ص ۹۶ تا ص ۹۷

بحث کرتے ہوئے اس کے ثبوت میں فارسی کے دو اشعار بھی پیش کئے ہیں۔"

منیر کے مخدوم زادوں کے سفینوں سے پایا جاتا ہے کہ ۵۷۶ھ ۱۱۸۰ء میں حضرت تاج فقیہہ اور قطب سالار نے راجہ منیر کو شکست دے کر منیر پر قبضہ کیا اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے ان میں پچیس آدمیوں کے نام بھی سفینوں میں مذکور ہیں اور اس کی فتح کی تاریخ بھی حسب ذیل ہے:

یافت چوں بر راجہ منیر ظفر — داد امام از دیں جانے زا لنوی

ہست منقول از بزرگان سلف — سال آں دین محمد شد قوی

ان اشعار کو پیش کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنے بیان کی صرف صداقت ہی نہیں بلکہ مسلسل تاریخی حوالوں سے ان کے بیان میں یکسانیت پیدا ہو رہی ہے، شعر نثر کے مقابلے بلاشبہ زیادہ موثر اور لطیف ہوتا ہے اور حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم اس نکتہ سے واقف تھے۔ ڈاکٹر شعیب راہی لکھتے ہیں:

[1] "تاریخ مگدھ میں ان کا اسلوب عام طور پر رواں، بے ساختہ اور پرکار ہے، ان کی نثر اس قدر غیر جانبدار ہے کہ کسی طرح بھی لغزش نہیں ہوتی، قتل ہو یا جاں بخشی ہر جگہ صاف اور سحر اُو ملتا ہے۔"

مغیث الدین طغرل کے بیان میں لکھتے ہیں:

[2] "اتفاقاً ایک دن سلطان کے مقدمۃ الجیش میں ملک محمد شیر انداز اور اس کا بھائی ملک مقدر کہیں چالیس سواروں کے ساتھ جنگل کو روانہ ہوئے تو چند بقال نظر آئے اور ان کو گرفتار کر کے طغرل کا پتہ پوچھا تو پہلے انہوں نے بالکل لاعلمی ظاہر کی، شیر انداز نے ان بقالوں کو ملک بار بک کے پاس روانہ کیا اور خود ایک بلند ٹیلہ پر چڑھ کر دیکھا تو طغرل لشکر کو بالکل

---

[1] ملاحظہ ہو "فصیح الدین بلخی اور ان کا اسلوب"، مقالہ ڈاکٹر شعیب راہی شائع شدہ رسالہ زبان و ادب پٹنہ اکتوبر ۱۹۷۷ء

[2] ملاحظہ ہو تاریخ مگدھ، مصنف فصیح الدین بلخی۔

غافل پایا۔ اس کے ہاتھی گھوڑے بھی چرائی میں مشغول تھے اس فرصت کو غنیمت جان کر تیس چالیس سواروں نے جو اس وقت موجود تھے اچانک طغرل کی خیمہ گاہ پر حملہ کر دیا، ان سواروں نے نعرہ بلند کیا کہ "سلطان بلبن کا اقبال قائم رہے" طغرل نے خود سلطان بلبن کے آپہنچنے کا گمان کیا، گھبراہٹ میں طہارت خانے سے نکل کر بغیر زین کے گھوڑے پر سوار ہو کر ندی کو عبور کرنا چاہا، اسی وقت ملک مقدر نے ایک تیر سے اس کا کام تمام کر دیا اور اس کا سر کاٹ کر رکھ لیا، بعد میں ملک باربک کا لشکر بھی پہنچ گیا اور طغرل کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے سلطان بلبن کے پاس لے گیا، سلطان بلبن نے ملک مقدر کو "طغرل کش" کا خطاب دیا اور لکھنوتی واپس آکر بازاروں میں دور تک سولیاں کھڑی کرائیں اور طغرل کے تمام اہل و عیال اور اعیان و انصار کو مجرم قرار دیکر قتل کرا دیا۔"[۱]

اس پوری عبارت میں کہیں بھی اکتاہٹ اور پھیکاپن نہیں محسوس ہوتا۔ اس لئے کہ مصنف کے مزاج میں خود بھی ٹھہراؤ ہے، فصیح الدین بلخی مرحوم کے اسلوب کا یہی کمال ہے، جو تاریخ میں واقعات کی تفتیش اور تحقیق کے علاوہ طرز تحریر کی خصوصیتیں بھی موجود ہیں۔ داستانوی انداز کے علاوہ ادبی اور شعری لطافت بھی موجود ہے، کہیں کہیں قاری کو انسانی نفسیات کی جلوہ گری بھی ملتی ہے، ان تمام خوبیوں نے تاریخ مگدھ کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے، تاریخ مگدھ میں چند بے حد دلچسپ داستان بھی پائی جاتی ہے، شہزادہ سلیم اور مہر النساء کے عشقیہ واقعات کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"[۲] ۱۰۰۸ھ میں شہزادہ سلیم نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف الٰہ آباد آکر خود مختارانہ حکومت شروع کی ...... صوبہ بہار قطب الدین خاں (نواب حضرت سلیم چشتی کی جاگیر پایا، یہ وہی قطب الدین خاں ہے جو ۲ صفر ۱۰۱۵ھ کو بردوان میں علی قلی شیر افگن شوہر مہر النساء کے ہاتھوں قتل ہوا، کہا جاتا ہے کہ قطب الدین خاں نے جہانگیر بادشاہ کے ایما سے شیر افگن کو یہ صلاح دی تھی کہ مہر النساء کو طلاق دے کر فوراً آگرہ بھیجدے، واقعہ

---

[۱]، [۲] ملاحظہ ہو تاریخ مگدھ مصنفہ فصیح الدین بلخی ص ۱۱۸

واقعہ کی اصلیت جو کچھ بھی ہو، بظاہر بات کی بات میں قطب الدین اور شیر افگن میں ایسی بگڑ گئی کہ آناً فاناً تلوار چل گئی اور دونوں مقتول ہوئے۔"

سلطان غیاث الدین اور حافظ شیرازی کی حکایت قارئین کی دلچسپی کے لئے بیان کی گئی ہے۔

ایک مرتبہ غیاث الدین اعظم شاہ مشرقی بنگال کی طرف گیا ہوا تھا اتفاقاً اس سفر میں کوئی مرض ایسا لاحق ہوا کہ اس کو زیست سے یاس ہو گئی۔ اس وقت اس کی تین بیویاں بھی ساتھ تھیں جن کے لقب سرو محل، گل محل اور لالہ محل تھے۔ اس نے ان کو وصیت کی کہ میرے مرنے پر نعش کو تم اپنے ہاتھوں سے غسل دینا لیکن غیاث الدین اعظم شاہ نے مرض سے شفا پائی تو اس کی اور بیویوں نے ازراہ طعن ان تین حرموں کو غسالہ کہنا شروع کیا انہوں نے موقع پا کر اعظم شاہ سے شکایت کی، اس وقت عالم انبساط میں اعظم شاہ کی زبان پر برجستہ یہ مصرع آیا:

ع ساقی حدیث سرو گل ولالہ می رود

لیکن اس کے برابر کا دوسرا مصرعہ ذہن میں نہیں آیا اور دربار کے شعرا بھی حسب دلخواہ مصرعہ نہ لگا سکے اعظم شاہ نے یہ مصرعہ طرح ایک قاصد کے معرفت کچھ تحائف کے ساتھ حضرت شمس الدین حافظ شیرازی کے پاس روانہ کیا اور حضرت حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی۔ حضرت حافظ بھی بنگال آنے کے شائق تھے لیکن کبرسنی اور صعوبت سفر کا اندیشہ رفع نہ ہوتا تھا، تاہم ایک غزل کہہ کر روانہ کیا جس کے تین اشعار کو دیوان سے تعلق ہے اس لئے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں، پوری غزل دیوان میں موجود ہے[1]

ساقی حدیث سرو گل ولالہ می رود	ایں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند	زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث الدین	خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ نسوان ہند مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم صد ۱۲ شاعرات۔

س واقعہ کو مختلف تاریخی شواہد کے ساتھ انہوں نے لکھا ہے، انہوں نے تاریخ میں اپنے بیان کی صداقت کے لئے صرف ثبوت ہی نہیں پیش کئے ہیں بلکہ اشعار کا سہارا بھی لیا ہے تاکہ ان کے بیان کو مزید تقویت پہنچے وہ فن تاریخ کو ادب اور شعر کی لطیف منزلوں تک لے جانے کے قائل تھے اور تاریخ نویسی میں فسانہ طرازی کے بھی قائل تھے۔ تاریخ صرف ملک ہی کی نہیں ہوتی بلکہ انسان کی بھی تاریخ ہوتی ہے بلکہ بعض مقام ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان کے خارجی حالات کے علاوہ داخلی معاملات بھی ملتے ہیں داخلی کیفیات کی ترجمانی کا مسئلہ خالص انسانی ہوتا ہے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

"شہزادہ اپنی شہزادگی کے سبب عکومت کرتا تھا اور مرشد قلی خاں کو بادشاہ کا معتمد ہونے کے سبب اپنے اعزاز کا خیال کرتا"[۱]

اس ایک جملہ میں شہزادہ اور مرشد قلی خاں کے مرتبے کے ساتھ ساتھ ان کی داخلی کیفیات کو بھی پیش کیا گیا ہے، الفاظ، طرز ادا اور جملہ کی سادگی نے اس کی کیفیت کو اور بھی ابھار دیا ہے۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کی دوسری تصنیف "تذکرہ نسوانِ ہند" ہے۔ یہ خالص خواتین کا ایک تذکرہ ہے جو پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ شاعرات، مصنفات، کمالات، شہرات اور مقدسات۔ یہ موصوف کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ ہمیں دراصل یہ دیکھنا ہے کہ ان کا فن عظمت اور ان کے حالات زندگی کے پیش نظر انہوں نے کون سا محققانہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ محقق ہمیشہ انداز بیان اور طرز اسلوب میں محتاط رہتا ہے وہ ہمیشہ اس بات کو مد نظر رکھتا ہے کہ کوئی جملہ یا کوئی عبارت ایسی نہیں لکھی جائے جو محققانہ طرز تحریر کم رفعت اور غیر معیاری ثابت کرے۔ فصیح الدین بلخی مرحوم کا طرز اسلوب ہمیشہ فیصلہ کن ہوتا ہے، اسلوب میں کہیں بھی لغزش اور کوتاہی نہیں ہوتی۔

اورنگ زیب (عالمگیر) کی بیٹی زیب النسا مخفی کی نسبت عام طور پر جو داستانیں مشہور ہیں ان کے متعلق صرف یہی لکھ کر بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔

"لوگوں نے بہت سے لطیفے اور ہزلیات بھی اس کی طرف منسوب کر دیئے ہیں لیکن اس کے[۲]

---

[۲] ملاحظہ ہو تذکرہ نسوانِ ہند مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم ص ۱۲ حصہ شاعرات ص ۳۸

کلام کی پاکیزگی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ تمام تر لطیفے اور ہزلیات لوگوں کی من گڑھت ہیں۔"

یہ عبارت بہت ہی مختصر ہے لیکن اس کا طرزِ اسلوب فیصلہ کن ہے کہ محقق کی شخصیت کا وقار کھل کر ہمارے سامنے آتا ہے اس میں الفاظ کی پاکیزگی اور فیصلہ بڑی معنویت اور گہرائی کے حامل ہیں الفاظ شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ الفاظ کے صحیح یا غلط استعمال سے نہ صرف شخصیت کی سیرت متاثر ہوتی ہے بلکہ محققانہ اندازِ بیان بھی متاثر ہوتا ہے۔

حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ نسوانِ ہند" میں خصوصاً شاعرات کے حصے میں کوئی بھی امتیاز نہیں برتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر وہ تمام خواتین تھیں جنہیں شعر و شاعری کا ذوق تھا اور فکرِ سخن بھی کرتی تھیں۔ مغل شہزادی ہو یا ادنیٰ درجہ کی طوائف ہر طبقے کی شاعرات کے سلسلے میں اس کے مرتبے کا ضرور خیال کرتے تھے۔ کسی شاعرہ کی بھی تعریف یا تضحیک نہیں کرتے بلکہ اس کی زندگی کے حالات کو منظرِ عام پر لانا مقصود تھا۔ ایسے موقع پر ان کے اندازِ بیان میں ضبط اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔ کہیں کہیں تو ایک لفظ یا جملہ سے کسی مخصوص شاعرہ کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ جاتا ہے۔ ہنوؔ کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے۔

لہ "ہنوؔ دہلی کی ایک زن خانگی کا نام اور تخلص تھا ...... میں مشہور تھی، دہلی کا رہنے والا گلاب سنگھ کھتری آشفتہ تخلص اس پر شیفتہ ہوا جس کے فیض سے ہنوؔ نے شاعری کو شعار بنایا۔

آشفتہ نے کبھی زن پر آشفتہ سری کی ہے، ایک دن اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے کاٹ لیا ہنوؔ کو ایسا قلق ہوا کہ تپِ دق میں مبتلا ہو کر چھ ماہ کے اندر مر گئی۔

اس عبارت میں اگرچہ تفصیل نہیں۔ تاہم اس کی سماجی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کی دلداری اور جاں نثاری کا بھی علم ہوتا ہے، آشفتہ کے تخلص کو معنوی اعتبار سے مختلف حیثیتوں سے پیش کیا ہے جس سے عبارت میں خاص قسم کی شگفتگی اور لطافت بھی پیدا ہو گئی ہے، اسی طرح آرائش کا ذکر کرتے ہوئے صرف

لہ ملاحظہ ہو تذکرہ نسوانِ ہند مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم ص ۲۳۸ حصہ شاعرات

ایک چھوٹا سا جملہ لکھ دیا ہے :

"اوائل عمر میں کسی قدر آوارہ حال تھی" ۔[۵]

فصیح الدین بلخی لفظ کے انتخاب میں اس قدر مہارت رکھتے تھے ، ساتھ ہی ساتھ چابک دست اور باشعور تھے کہ کوئی بھی جملہ غیر شعوری طور پر نہیں نکلتا ، آرائش کے ذکر میں آگے چل کر لکھا ہے ۔

"بعد کو اس نے ایک مرد سے عقد کر لیا اور باقی عمر نہایت سلامت روی میں گذاری" ۔[۲]

آرائش کو انہوں نے آوارہ حال لکھا ہے ۔ آوارہ حال اور آوارگی میں فرق ہے ، مزاج کی آوارگی بڑی مشکل سے اصلاح پذیر ہوتی ہے ، حال کی آوارگی صورت حال بدل جانے کے بعد بحال ہو جاتی ہے یہی سبب ہے کہ آرائش میں سلامت روی آگئی ۔ فصیح الدین بلخی مرحوم شخصیتوں کی خارجی تصویر پیش کرنے میں مہارت رکھتے تھے ۔ یہ تصویریں بڑی ہی دلچسپ اور جاذب نظر ہیں ۔ ان میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی ۔ صنم اسد اللہ خاں غالب ، خواجہ غلام غوث بے خبر اور مرزا حاتم علی کی ہم جلیس اور ہم عصر تھی ۔ اس کے حالات میں لکھا ہے :

"اس کے زمانے میں درگا صنم نوعمر تھی اور پیشانی پر قشقہ لگا رہتا تھا" [۲] صنم کی خارجی تصویر کا کتنا کھلا اور صاف عکس ہے ۔

فصیح الدین بلخی کی طرز تحریر میں طنز و ظرافت کا رنگ ، عمومی طور پر نہیں ملتا ہے کیونکہ ان کا طرز و اسلوب تاریخ یا تنقید یا تحقیق ہر جگہ بے حد سنجیدہ ہے لیکن کہیں حالات اور کیفیات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہلکا سا تبسم قاری کے ذہن پر ظاہر ہو جاتا ہے ۔ اس طنز میں تبسم کے بجائے خلوص کا پہلو نمایاں ہے جو نیک نیتی اور غیر جانب داری کی دلیل ہے ۔ احمد مسرور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

---

[۱] ، [۲] تذکرہ نسوان ہند مصنف فصیح الدین بلخی مرحوم ص ۶۳ حصہ شاعرات

" " " " ص ۸۶ "

[۳] " " " " ص ۳۱ "

[1] "گھر میں ابتدائی تعلیم پانے کے بعد ۱۹۳۶ء میں اسکول میں داخل ہوگئی جہاں سوائے حساب کے ہر مضمون میں بہتر ثابت ہوئی، یہاں ہاجرہ کی شخصیت کے کسی کمزور پہلو کی نمائش مقصود نہیں بلکہ اس جملہ سے ایک قسم کی خوش دلی کا احساس ہوتا ہے اس کے علاوہ اس جملہ کا رکھ رکھاؤ اپنی جگہ پر قائم ہے۔"

موضوع کے اعتبار سے تحقیق بھی تاریخ کی طرح خشک موضوع ہے لیکن مورخ اور محقق کا اسلوب بیان دلچسپ بنا دیتا ہے۔ تاریخ کی طرح تحقیق کو بھی فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنے طرز کے ذریعہ نہ صرف دلچسپی عطا کی ہے بلکہ تقویت بھی بخشی ہے اپنی تحقیق کو زیادہ وقیع ثابت کرنے کے لئے انہوں نے اشعار کے حوالوں سے بھی کام لیا ہے۔

[2] "ماہم بیگم بابر شاہ کی بیوی اور ہمایوں بادشاہ کی ماں تھی اس نے ایک مدرسہ اور مسجد ۹۶۹ھ میں تعمیر کرائی تھی اس کی سن تعمیر کی صحت کے لئے اشعار کا بھی حوالہ دیا ہے۔"

بدور آں جلال الدین محمد	کہ باشد اکبر شاہان عادل
چوں ماہم بیگم عصمت پناہی	بنا کرد این بنا بہر افاضل
ولے شد ساعی ایں بقعۂ خیر	شہاب الدین احمد خاں باذل
زہے خیریت ایں بقعۂ خیر	کہ شد تاریخ او خیر المنازل
	۹۶۹

ان اشعار کو پیش کرنے کا صرف مقصد اپنی تحقیق کو تقویت ہی پہنچانا نہیں بلکہ اس سے عبارت میں ایک قسم کی یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے، اشعار کی موجودگی سے عبارت میں شگفتگی اور رعنائی آجاتی ہے، دراصل ان کے مزاج میں شاعرانہ لطافت موجود تھی۔

بعض حالتوں میں انہوں نے واقعات کی کچھ ایسی تفصیل بھی پیش کی ہے جس سے حالات کا

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ نسواں ہند مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم صہ ۳۴ حصہ مشاہیرات

[2] " " " " " صہ ۴۳ "

اندازہ ہو جاتا ہے۔ ممتاز محل کے بیان میں لکھا ہے :

[۱] "جہاں گیر خود بیٹے (شاہ جہاں) کی برات لے کر دلہن (ممتاز محل) کے گھر گیا تھا، مہر پانچ لاکھ روپیہ قرار پایا تھا اور دولہا نے موتیوں کا بیش بہا ہار دلہن کے گلے میں ڈالا تھا"

اس عبارت میں تحقیق کے ساتھ افسانوی انداز بھی پایا جاتا ہے' تحقیق اور افسانے کا یہ انداز بھی بہت خوشگوار ہے اس طرح تحقیق میں حد درجہ اثر انگیزی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تحقیق میں تاثراتی تحریر بھی فصیح الدین بلخی کے اسلوب کا نمایاں وصف ہے' زوجۂ داؤد خاں کے تذکرے میں لکھا ہے:

[۲] "اس عورت (زوجہ داؤد خاں) کی خودکشی کا واقعہ دنیا کے عجیب وغریب واقعات ہیں، اس کا شوہر داؤد خاں والی گجرات حسین علی خاں امیر الامرا کے مسلح اور زرہ پوش سپاہیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو اس عورت نے زندگی سے بیزار ہو کر خودکشی کی ٹھان لی لیکن سات ماہ کی حاملہ تھی اور بچہ کو اپنے شوہر کے نام و نسل کی یادگار چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے خنجر سے اپنا پیٹ بہت احتیاط کے ساتھ چاک کیا اور بچہ کو پیٹ سے نکال کر بطور امانت ورثا کے سپرد کیا اور عدم کی راہ لی۔

تحقیق میں طرز تحریر کا یہ تاثراتی رنگ بھی ان کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف ہے' فصیح الدین بلخی مرحوم نے اپنی طرز تحریر میں تاثر، جانداری اور جذباتی کیفیت پیدا کرنے کے لئے جا بجا اشعار بھی پیش کئے ہیں۔

یہ اشعار ہمیشہ خیالات کے دریچوں سے ظاہر ہوتے ہیں، اس بے ساختگی کے سبب انداز میں دلکشی اور اثر انگیزی پیدا ہو گئی ہے، جہاں آرا بیگم جو شاہجہاں بادشاہ کی بیٹی تھی بادشاہ زادی ہونے کے باوجود تصوف سے خاصہ شغف رکھتی تھی۔ اس کے حالات بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے

[۳] "جہاں آرا نے ستر برس کی عمر میں ۱۰۹۲ھ میں انتقال کیا اور حسب وصیت حضرت نظام الدین کے احاطہ میں مدفون ہوئی، مدفن پر یہ شعر کندہ ہے

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا ؛ کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

جہاں آرا کے پورے حالات کی روشنی میں یہ شعر اس قدر جذبی کیفیت کا حامل ہے کہ قاری کے دل میں داخلی تاثرات کی لہریں موج زن ہو جاتی ہیں، عام طور پر تحقیق کی عبارتوں میں ایک قسم کی خشکی اور ثقالت پائی جاتی ہے۔ تحقیق بذات خود ایک خشک موضوع ہے اور گنجلک عبارت ادبی فن تحقیق کو باضابطہ مجروح کرتی ہے۔ اس پر عبارت اگر پیچیدہ، نامانوس اور غیر لطیف ہو تو یہ محقق کے اسلوب کی خامی کی دلیل ہے لیکن فصیح الدین بلخی مرحوم کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خشک سے خشک تحقیقی موضوع کو دلچسپ انداز میں پیش کئے ہوئے ہیں قارئین کو خشک موضوع کا احساس نہیں ہوتا۔

مقدسات کے سلسلے میں ان کا انداز بیان عقل سے زیادہ جنون کے قریب رہا ہے زندگی میں خود ان کی شخصیت پر بھی جنون کا غلبہ رہا ہے جو تصوف، روحانیت اور سلوک کا فیضان ہے، مقدس شخصیتوں کے ذکر میں ان کے انداز بیان میں تقدس اور پاکیزگی کے پہلو بہ پہلو جذبی اور روحانی کیفیات کا رنگ غالب ہے، الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ساخت میں ٹھہراؤ اور ضبط و نظم ہے عبارت کی اٹھان، ترتیب اور اختتام کچھ ایسا ہے کہ شخصیت کی بزرگی، تقدس اور مرتبہ کا پورا خیال ہے، ساتھ ہی ساتھ ان کے مرتبہ کا بھی احساس ہوتا ہے حضرت قرسم خاتون (والدہ محترمہ حضرت فرید الدین شکر گنجؒ) کے ذکر میں لکھا ہے:

"انہیں حضرت (قرسم خاتون) کے فیض پرورش سے حضرت شکر گنجؒ نے اجودھن میں توطن اختیار کی تو اپنے بھائی حضرت نجیب الدین متوکل کو ان کے (اپنی والدہ) لانے کے لئے بھیجا۔ وہ ان کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ راہ میں پانی کی ضرورت ہوئی تو ان کو ایک درخت کے سائے میں بٹھا کر پانی کی تلاش میں نکلے، واپس آئے تو ان کو نہ پایا۔ ادھر ادھر دیکھنے پر کچھ ہڈیاں نظر آئیں۔ ان کو ایک تھیلی میں جمع کر لیا لیکن وہ ہڈیاں پر اسرار طور پر غائب ہو گئیں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے قرسم خاتون کے حقائق سے متعلق کوئی بھاری بھر الفاظ نہیں استعمال کئے صرف سادہ طور پر واقعات کا ذکر کیا ہے یہی انداز بیان انہوں نے حضرت زلیخا بی بی (والدہ ماجدہ حضرت نظام الدین اولیاؒ) کے تذکرے میں بھی اختیار کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے۔

[1] "دوسرے مہینے حضرت نظام الدین اولیاؒ قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے تو ان کی
والدہ نے فرمایا کہ آئندہ مہینہ میں تم کس کی قدم بوسی کروگے" (حضرت نظام اولیاؒ ہر ماہ
اپنی والدہ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتے تھے)
حضرت نے مضطرب ہو کر پوچھا کہ "مجھے کس کے سپرد کرتی ہیں"۔ ماں نے جواب دیا:
آج کی شب تم اپنے بھائی کے ساتھ رہو۔ کل تمہارے سوال کا جواب دوں گی، حضرت نے
حسب حکم بھائی کے گھر میں رات گذاری اور صبح کو حاضر ہوئے تو ماں نے کہا۔ اپنا داہنا
ہاتھ میرے ہاتھ میں دو، حضرت نے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو ماں نے کہا اے خدا میں تیرے سپرد
کرتی ہوں، اسی وقت بی بی زلیخا کی روح پرواز کر گئی۔"

یہ عبارت کس قدر سیدھی سادی ہے۔ نہ غیر مانوس استعارے نہ فارسی کی عبارت موجود ہے، دراصل یہ
وہ واقعات ہیں جن سے خود بلخی صاحب مرحوم متاثر تھے۔

فصیح الدین بلخی مرحوم ایک ناقد تھے، تنقید میں ان کے اسلوب کا کیا رنگ ہے۔ ان کے
تنقیدی مثالوں کی روشنی میں ان کے طرز و اسلوب کا مختصراً جائزہ لیا جاتا ہے۔

عمومی طور پر تنقید کو عام فہم ہونا چاہئے۔ ناقد کا بیان اور طرز اسلوب سمجھ میں آنا چاہئے۔ اگر
یہ خوبی طرز تحریر میں نہیں برتی جاتی تو تنقید بے اثر ہو جائے گی۔ تنقید میں فصیح الدین بلخی کا طرز و تحریر موضوع
سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے مضامین کی نوعیت اگرچہ تحقیقی ہے مگر جا بجا ان کا تنقیدی شعور جھلکتا ہے،
جن سے ان کے تنقیدی اسلوب کا پتہ چلتا ہے، ضیا عظیم آبادی کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

[2] "ان کا کلام محض تخیل نہیں بلکہ اپنے ذاتی جذبات اور قلبی واردات کی ترجمانی ہے۔"

یہ جملہ بظاہر بہت مختصر ہے مگر معنوی اعتبار سے ضیا کے تمام کلام پر محیط ہے، آگے چل کر
لکھا ہے:

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ نسوان ہند مصنفہ فصیح الدین بلخی ص ۱۳۰،۱۳۱ حصہ مقدسات

[2] ملاحظہ ہو عظیم آباد کا جواں مرگ شاعر، مقالہ شائع شدہ رسالہ تہذیب

؎ "جن لوگوں نے ضیا کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمان ہے"۔

فصیح الدین بلخی مرحوم کے چھوٹے چھوٹے جملے بڑی معنویت کی حامل ہیں، ان کی طرز تحریر سے صفائی طبع کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا یہی طرز بیان ان کی اکثر تنقیدی عبارتوں میں ملتا ہے، عزیز الدین بلخی مرحوم پر مقالہ لکھتے وقت جب ان کی شاعری کیا ہے تو لکھا ہے:

؎ "اردو میں اکثر مشکل زمین ایجاد کر کے طبع آزمائی کرتے تھے اور محاورہ بندی کا خیال رکھتے تھے"۔

گویا مشکل زمین ایجاد کرنے اور محاورہ بندی کا خیال رکھنا راز عظیم آبادی کے کلام کی بنیادی خصوصیتیں تھیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

انشاد شاد: فصیح الدین بلخی مرحوم کے تنقیدی کارناموں میں انشاد شاد کا نام سب سے اہم ہے، بلخی صاحب مرحوم نے اس کتابچہ میں شاد عظیم آبادی کے کلام پر فنی اور اصولی تنقید کی ہے بلخی صاحب مرحوم نے کلام شاد پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

کفر است در شریعت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

آگے چل کر بلخی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

؎ "ولی صاحب اور حمید صاحب پرکار کی طرح سر پھیر کر دائرہ تلمذ میں گردش کرتے ہیں اور میں نے آزادانہ قلم اٹھایا ہے اس لئے میری اور ان کی سرحدیں بالکل جداگانہ ہیں میں نے فن کے معیار پر جانچ کر دکھلایا ہے کہ فنی حیثیت سے شاد کا کلام کیا ہے"۔

؎ ملاحظہ ہو عظیم آباد کا جواں مرگ شاعر مقالہ شائع شدہ رسالہ تہذیب، پٹنہ

؎ تاریخ شعرائے بہار کا مؤلف مقالہ شائع شدہ اشارہ پٹنہ فروری ۱۹۵۹ء

؎ رسالہ انشاد شاد مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم

تنقید میں فصیح الدین بلخی مرحوم کا انداز بالکل موثر اور بے باک ہے اور جو کچھ کہا ہے روشن دلیلوں کے ساتھ کہا ہے۔

"۱؎ شتر گربہ اور ضمائر کی عدم مطابقت قادر الکلامی کے کس قدر خلاف ہے۔ عجب ہے کہ شاد صاحب نے فرمایا ہے۔

چلے جائیں گے ہم جو محفل سے تیری
کوئی اور میری جگہ آرہے گا

"ہم اور میری کیا"

تنقید کا یہ انداز بیان کس قدر مدلل اور بے باک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے قاری کو مطمئن کرنا چاہا ہے۔ ان ہی مسائل پر ان کا ذہن کس قدر صاف تھا جو کچھ انہوں نے کہا ہے انتہائی صاف اور ستھرے انداز میں کہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے چند عنوانات قائم کر کے کلام شاد سے مثالیں پیش کی ہیں جن میں عامیانہ مذاق، سوقیانہ انداز بیان، زبان اور محاورے کی غلطیاں، تناقص، شتر گربہ، حشو و زوائد، ردیف کا چسپاں نہ ہونا، زبان و فن سے ناآشنا ہونا، سرقۂ کلام، استاد کا اختراع و تصرف وغیرہ اہم عنوانات ہیں اور انہی کے ذیل میں کلام شاد کے فنی تناقص کو اجاگر کیا گیا ہے ہمیں اس سے یہ بحث نہیں ہے کہ یہ تنقید اور طریقہ تنقید کہاں تک درست ہے، مجھے یہ دیکھنا ہے کہ تحریر کا انداز اور پیش کش کا طریقہ کتنا سادہ، جاذب اور دلکش ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۲؎ شب آخر ہے ذرا غنچوں کو دیکھ اور خوش ہو اے بلبل
ترے نالوں سے کمبختوں کی چھاتی پھٹتی جاتی ہے

یہ شعر شاد کے مایہ ناز اشعار میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک لائق شاگرد لکھتے ہیں کہ شاد نے اس کو نہایت شد و مد سے پڑھا تھا اور وہ خود اس کے مقابلہ میں غالب کا شعر نقل کر کے فرماتے ہیں کہ غالب کا بھی

۱؎ رسالہ انتقاد شاد مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم
۲؎ " " " " " "

ایک شعر اسی مضمون کا ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ شاد کے شعر کو نہیں پہنچتا ؎

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے ہیں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے (غالب)

غنچوں کو کم بخت کہنے کی کوئی وجہ نہیں اور چھاتی پھٹی جاتی ہے کی جگہ چھاتیاں پھٹی جاتی ہیں کہنا چاہئے تھا۔ اس شعر سے شاگردوں کی عقیدت مندی اور شاعر کی زباندانی اور استادی کا بھرم کھل گیا ؎

بڑھے منکر بھی کلمہ دیکھ کر طرفِ رقم میرا
عصا موسیٰ نبی کا تیغ حیدر کی قلم میرا (شاد)

اس محل پہ بڑھے سے پڑھنے لگے زیادہ فصیح ہوتا اور موسیٰ نبی یا داؤد نبی شاید ولیسی پادری بولتے ہوں گے۔ اردوئے معلیٰ کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مطلع کا مضمون داغ کے مطلع دیوان سے اڑایا ہوا معلوم ہوتا ہے ملاحظہ ہو ؎

عدوئے سامری دیکھے اعجاز رقم میرا
عصائے موسوی ہے حمد خالق میں قلم میرا (داغ)

تعجب ہے کہ ولی صاحب داغ کے مطلع کے متعلق فرماتے ہیں کہ شاد کے شعر کو نہیں پہنچتا۔ نبی کا لفظ محض بیکار اور مانع فصاحت ہے ؎

کھلا ہے بام پر جوڑا کسی کے بعد مشکیں کا
کہ مجھ تک بوئے گیسو کارواں در کارواں پہنچی (شاد)

بام اور جوڑا اور جعد اور گیسو اور کارواں در کارواں محض الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقتاً شاعر نے وحید الٰہ آبادی کے شعر کو غارت کیا ہے۔ قادر الکلام شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی سے نظم کیا تھا مقابلہ کرنے سے ناقص و کامل کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

معطر ہے اسی کوچے کی صورت اپنا صحرا بھی
کہاں کھولی ہیں زلفیں یار نے خوشبو کہاں تک ہے (وحید)

انشاد شاد میں ایسی مثالیں بہت سی ملتی ہیں۔ یہ طرز اسلوب کس قدر مدلل قابل قبول اور عام فہم ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم کے طرز بیان کی ایک خوبی ہے کہ انہوں نے فنی اور شعری بحث بھی کی ہے۔ ان فنی اصولوں اور نکتوں کو انہوں نے بڑی خوبی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی عبارتیں اگرچہ بہت کم اور بہت مختصر ہیں۔ ان کی صفائی، سادگی اور جامعیت بڑی قابل قدر چیزیں ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے۔

۱؎ "فن بلاغت سے واقفیت رکھنے والا جانتا ہے۔ تشبیہہ استعارہ کی خوبی و لطافت وجہ تشبیہہ یا وجہ جامع کے لوازمات و ملحوظ رکھنے پر منحصر ہوتی ہے"۔

۲؎ "فصحا کا قول ہے کہ جس شعر کے معنی بیان کرنے میں تاویل کی حاجت ہو بے معنی ہے"۔

۳؎ "اصطلاحات کے اعتبار سے کلام میں قریب المخرج حروف کے جمع ہونے سے تلفظ میں چونکہ تکرار ہوتی ہے اس کو تنافر کہتے ہیں۔

انشاد شاد میں اس قسم کے جملے جن سے کوئی نہ کوئی فن اور اصطلاحی بحثیں عموماً خشک ہوتی ہیں، پڑھنے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا لیکن بلخی صاحب مرحوم کے طرز اسلوب کا کمال ہے کہ ان کا طرز بیان مقصدی ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس انداز سے کہتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر فوراً ذہن نشیں ہو جاتا ہے اور مطمئن ہو جانا پڑتا ہے۔

۴؎ "وہ (حمید صاحب) صفحہ ک، میں فرماتے ہیں کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان کا (یعنی شاد کا) طرز میر انیس سے کسی طرح کم نہیں، کیا اس بیان سے میر انیس کی توہین نہیں ہوتی ہے۔ شاد ایک اوسط درجہ کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کو استاد فن اور میر انیس کا ہمسر کہنا یا بلاغت میں غالب سے برتر اور سلاست زبان میں داغ سے بہتر قرار دینا سراسر لغو اور مضحکہ خیز بات ہے"۔

۱؎، ۲؎، ۳؎ رسالہ انشاد شاد مصنفہ فصیح الدین بلخی مرحوم

۴؎ " " " " " "

استاد شاد میں فصیح الدین بلخی مرحوم نے شاد کے کلام پر جتنی بھی تنقیدیں کی ہیں وہ سب مدلل، بے باک و صاف ہیں۔ ایک ناقد کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے کسی بھی شاعر کے کلام سے بحث چھیڑے تو اور شاعر کے کلام کو دائرۂ تنقید میں لینے سے قبل وہ اپنی ذاتی رائے نہ چھیڑے بلکہ فن عروض اور فن بلاغت سے بھی اس کی گہری واقفیت ہو۔ عام طور پر تنقید نگار اس فن سے بالکل ناواقف ہیں جس کے نتیجے میں ان کی تنقید محض ذاتی رائے تک ہی بالکل محدود ہو جاتی ہے لیکن بلخی صاحب مرحوم نے کلام شاد سے قبل قلم اٹھاتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ان کی مراد شاد کی تحقیر نہیں، یہی ان کے طرز اسلوب کا کمال ہے کہ فن بلاغت اور فن عروض کی خشکی سے قاری کے ذہن کو دور کراتے ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار: فصیح الدین بلخی مرحوم کی تیسری مطبوعہ تصنیفات میں "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، یہ تذکرہ تین ادوار میں منقسم کر کے لکھا گیا۔ دور متقدمین میں وہ شعرا ہیں جو ۱۲۰۰ھ تک مشق سخن کرتے تھے۔ دور متوسطین میں وہ شعرا ہیں جنہوں نے ۱۳۸۰ھ تک شعر و شاعری کا بازار گرم رکھا تھا، تذکرہ نگار نے اس تذکرہ کی تصنیف و تالیف کا مقصد بیان کیا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اردو زبان جس کس مپرسی اور بے بسی کے عالم میں مبتلا ہے وہ بلخی صاحب سے پوشیدہ نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تصنیف کے مقدمہ میں اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے

لہٰ "ہندو شعرائے بہار" بہار کا پہلا تذکرہ ہے اور اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ صوبہ بہار میں فارسی اور اردو زبان و شاعری کے رواج و ترقی میں ہندوؤں نے کس کشادہ دلی سے حصہ لیا ہے اور اب تک لے رہے ہیں ؎

محو کیا نقش محبت ہو کہ ارباب وفا
جتنے مٹتے گئے اتنے ہی نمودار ہوئے (راسخ عظیم آبادی)

لہٰ تذکرہ ہندو شعرائے بہار صلا

بلخی صاحب مرحوم نے اپنی تصنیف کے مقدمہ میں اپنا منشا ظاہر کرتے ہوئے کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ کوئی بھی جملہ بھاری بھرکم نہیں یا طنزیہ لب ولہجہ میں نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ انہوں نے راسخ عظیم آبادی کے اس شعر سے اردو زبان کی اس ملک میں موجودہ حقیقت کو ظاہر کیا ہے۔ دراصل یہی ان کے اسلوب کا ایک اچھوتا اور بے مثال کمال ہے۔

راجہ رام نرائن موزوں کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بلخی صاحب مرحوم نے یوں لکھا ہے:

لہ "مہاراجہ رام نرائن موزوں نائب ناظم صوبہ دار فارسی کے صاحب دیوان اور خوشگو شاعر تھے۔ شیخ علی حزیں متوفی ۱۱۸۰ھ کے شاگردوں میں تھے۔ موزوں کا مطبوعہ دیوان جو ۳۸۴ صفحوں پر محیط ہے، راقم کی نظر سے گذرا ہے اس کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ موسوم بہ دستور الانشار بھی ان کے وارث رائے متھرا پرشاد کے پاس جس میں سیکڑوں مکتوبات ہیں جو اس عہد کے سیاسی وسماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں؟ یہ عبارت بہت ہی مختصر ہے لیکن موزوں کی ادبی شخصیت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کوئی بھی جملہ بھاری بھرکم نہیں۔

اس قسم کی مثالیں جابجا پیش کی گئی ہیں مزید دہرانے کی ضرورت نہیں، ڈاکٹر شعیب راہی فصیح الدین بلخی مرحوم کے اسلوب کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

سلہ "فصیح الدین بلخی مرحوم نے طرز اسلوب کے معاملہ میں فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور سرسید تحریک تینوں مراکز ادب کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں اپنے کامیاب ہوئے، ان کے انداز بیان میں بے باکی، صفائی اور انصاف پسندی، پاکیزگی اور لطافت اپنے خاندان کی صوفیانہ اور درویشانہ اور روحانی روایتوں سے پیدا ہوئی۔ ان کے طرز اسلوب میں ان کی شخصیت کی پوری جھلک ملتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں جس قدر صاف گو، پاکیزہ اور لطیف تھے ان کی نثر بھی اسی قدر صاف، پاکیزہ اور لطیف ہے۔"

لہ تذکرہ ہندو شعرائے بہار صہ۱۲

سلہ ملاحظہ ہو فصیح الدین بلخی اور ان کا اسلوب مقالہ ڈاکٹر شعیب راہی، شائع شدہ رسالہ زبان و ادب، اکتوبر، بہار

کتابیات

(۱) اپنی تلاش میں مصنف کلیم الدین احمد مرحوم
(۲) آغاز سحر مجموعہ کلام نادم بلخی
(۳) اردو کے ہندو شعرا مصنف خواجہ عبدالرؤف عشرت
(۴) اردو تنقید پر ایک نظر مصنف کلیم الدین احمد مرحوم
(۵) اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر مصنف ڈاکٹر محمود الحسن رضوی
(۶) انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب مصنف ڈاکٹر جاوید نہال
(۷) انتشار شاد (رسالہ) مصنف فصیح الدین بلخی
(۸) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقار مصنف ڈاکٹر اختر اورینوی
(۹) بہار میں اردو تذکرہ نگاری مصنف ڈاکٹر منصور عالم
(۱۰) بہار تھرو دی ایجز (بزبان انگریزی) مصنف آر۔ آر۔ دواکر
(۱۱) تاریخ شعرا بہار جلد اول مصنف سید عزیز الدین بلخی
(۱۲) تاریخ مگدھ مصنف فصیح الدین بلخی
(۱۳) تجزیہ کلام غالب مصنف رفیع الدین بلخی
(۱۴) تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد اول تا ششم مصنف حکیم سید احمد اللہ ندوی مرحوم
(۱۵) تذکرہ نسوانِ ہند مصنف فصیح الدین بلخی
(۱۶) تذکرہ ہندو شعرار بہار " ایضاً
(۱۷) تلخیص جلوۂ خضر مرتبہ ڈاکٹر ظفر اوگانوی
(۱۸) جلوہ داغ و دیوان ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی
(۱۹) سراج و منہاج مصنف ڈاکٹر اختر اورینوی
(۲۰) سلسلۂ فردوسیہ مصنف پروفیسر معین الدین دردائی
(۲۱) شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری مصنف ڈاکٹر وہاب اشرفی
(۲۲) صفیر بلگرامی بحیثیت ناقد اور شاعر مصنف ڈاکٹر ظفر اوگانوی

(۲۳) صوفی منیری کی نثر نگاری
مصنفہ ڈاکٹر طیب ابدالی

(۲۴) عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ
مصنفہ ڈاکٹر یوسف خورشیدی

(۲۵) فریڈم موومنٹ اِن بہار (بزبان انگریزی)
مصنفہ ڈاکٹر کے۔ کے۔ دتا

(۲۶) فنکار سے فن تک مصنفہ پروفیسر ابوذر عثمانی

(۲۷) کھلا چیلنج (رسالہ) مصنفہ حمید عظیم آبادی

(۲۸) مرزا علی فدوی حیات اور شاعری
مصنفہ ڈاکٹر سید محمد حسنین

(۲۹) مشاہیر نسواں مصنفہ مولوی محمد عباس

(۳۰) مشرقی بنگال میں اُردو مصنفہ ڈاکٹر سید اقبال عظیم

(۳۱) مقالات قاضی عبدالودود مرتبہ کلیم الدین احمد

(۳۲) مقدمہ تاریخ شعرائے بہار
مصنفہ سید عزیز الدین بلخی

(۳۳) ناسخ سے وحشت تک
مصنفہ سید لطیف الرحمٰن

(۳۴) وسیلہ شرف و ذریعہ دولت مصنفہ صوفی منیری

(۳۵) وہابی موومنٹ اِن انڈیا (بزبان انگریزی)
مصنفہ ڈاکٹر قیام الدین احمد

(۳۶) یادگار عشق مصنفہ ثاقب عظیم آبادی

(۳۷) بہار لغت مصنفہ یوسف الدین بلخی

مخطوطات

(۱) آثار بلخیہ مصنفہ فصیح الدین بلخی مملوکہ راقم

(۲) آثار قدیمہ " " "

(۳) بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء
مصنفہ ڈاکٹر مظفر اقبال مخزونہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری

(۴) بہار میں اُردو شاعری کا ارتقاء ۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۴ء مصنفہ ڈاکٹر کلیم عاجز ایضاً

(۵) دستور سخن مصنفہ فصیح بلخی مملوکہ راقم

(۶) شرح العقیدہ (بزبان فارسی) مصنفہ مولانا
منظفر بلخی مخزونہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ

(۷) مکتوبات مولانا مظفر بلخی (بزبان فارسی)
مخزونہ خدا بخش لائبریری

مختلف مقالات مخطوطہ

(۱) ایک روشن دماغ نہ رہا مصنفہ سید علیم الدین بلخی

(۲) بلخی صاحب مصنفہ سہیل عظیم آبادی مرحوم

(۳) پٹنہ یونیورسٹی لائبریری اور مرحوم بلخی صاحب
مصنفہ ڈاکٹر خواجہ فضل امام

(۴) حضرت فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت
مصنفہ مولانا سید عبدالرؤف ندوی مرحوم

(۵) سو وہ بھی خموش ہے مصنفہ سید عبدالمغنی

(۶) عقیدت فصیح الدین بلخی بہ عقیدت شرف الدین بہاری
مصنفہ حکیم سید شاہ تقی بلخی

(٧) فصیح الدین بلخی مرحوم سے چند تاثرات
مصنفہ ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم

(٨) فصیح الدین بلخی کی چار تصنیفات
مصنفہ ڈاکٹر مظفر اقبال

(٩) فصیح الدین بلخی مرحوم سے چند تاثرات ایضاً

(١٠) مرحوم بلخی صاحب مصنفہ پروفیسر سید علی حیدر نیر

(١١) مرحوم بلخی صاحب مصنفہ قیوم خضر

(١٢) مولوی فصیح الدین بلخی مصنفہ سید بدر الدین مرحوم

مخطوطہ مقالات
فصیح الدین بلخی مرحوم

(یہ مقالات آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہوئے)

(١) اکبر کے نورتن ابو الفضل اور فیضی مملوکہ راقم

(٢) بھارت کا مہان محمود گاواں

(٣) بہار شریف کا میلہ اور عرس

(٤) تاریخ کے لئے قلمی کتابوں کا ذریعہ

(٥) جائسی کی پدماوت

(٦) درگوں کی کہانی اور قلعہ رہتاس گڈھ

مطبوعہ رسائل

(١) رسالہ تحفہ بہار مرتبہ حفیظ الدین بلخی
بابت فروری ١٨٩٧ء

(٢) رسالہ ندیم بہار نمبر ١٩٣٥ء

(٣) رسالہ فطرت راجگیر اپریل مئی ١٩٣٥ء

(٤) رسالہ معاصر پٹنہ ستمبر اکتوبر ١٩٤٩ء

(٥) " " " جلد ٢ ١٩٥٦ء

(٦) رسالہ تہذیب پٹنہ دسمبر ١٩٥٢ء

(٧) " " " اپریل ١٩٥٣ء

(٨) " " " اگست ١٩٥٣ء

(٩) رسالہ انسان پورنیہ نمبر ١٩٥٦ء

(١٠) رسالہ مصور پٹنہ جولائی ١٩٥٦ء

(١١) " " " نومبر ١٩٥٦ء

(١٢) " صبح نو پٹنہ اپریل ١٩٥٨ء

(١٣) " " " مئی ١٩٥٨ء

(١٤) " " " اگست ١٩٥٨ء

(١٥) " " " اگست ١٩٦١ء

(١٦) " " " اپریل ١٩٦٢ء

(١٧) رسالہ صنم پٹنہ ١٩٥٨ء

(١٨) " " بہار نمبر ١٩٥٩ء

(١٩) رسالہ کوئل سہ ماہی مو الشن گنج ستمبر ١٩٦١ء

(٢٠) " " " اپریل ١٩٦٢ء

(٢١) " " " اگست ١٩٦٢ء

(٢٢) رسالہ نگار کراچی پاکستان
تذکروں کا تذکرہ نمبر ١٩٦٤ء

(۲۳) صدائے عام خاص نمبر سنہ ۱۹۵۱ء

(۲۴) رسالہ سہیل گیا سنہ ۱۹۵۸ء

(۲۵) " " " سنہ ۱۹۶۲ء

(۲۶) رسالہ اشارہ پٹنہ مارچ اپریل سنہ ۱۹۵۴ء

(۲۷) " " " دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء

(۲۸) " " " فروری سنہ ۱۹۵۹ء

(۲۹) " " " ستمبر سنہ ۱۹۵۹ء

(۳۰) " " " جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

(۳۱) رسالہ اشارہ پٹنہ اپریل سنہ ۱۹۶۲ء

(۳۲) رسالہ زبان وادب پٹنہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء

(۳۳) پٹنہ یونیورسٹی ریسرچ جرنل مختلف فائل

(۳۴) بہار ریجنل سروے کمیٹی رپورٹ
مرتبہ ڈاکٹر کے۔کے دتا مختلف فائل

(۳۵) فہرست نمائش مخطوطات
منجانب انڈین ہسٹوریکل ریکارڈ کمیشن
بابت سنہ ۱۹۵۶ء

قطعۂ تاریخ اشاعت

فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے

از: حضرت شارق جمال ناگپوری

شاد باش اے مظفر بلخی
پا گئی آج اپنا حق تحقیق

پوری تحقیق میں فصاحت ہے
کہا کس نے ؟ کہ ہے ادق تحقیق

آپ کی یہ ہے بر فصیح الدین
خوب علمی ورق ورق تحقیق

۱۹۸۸ء